عاطفه

یاسمین صوفی

○ اُثاثہ

○ فریحہ

آرزو

معاشرتی ناول

عاطقہ

یاسمین صوفی

خیام پبلشرز پرانی انارکلی لاہور

اہتمام: رشید سائل

محمد جمال

تعداد .... ایک ہزار

طابع .... اصغر آرٹ پریس لاہور

طریق طباعت ..... ونڈ ایک آفسٹ

بار اول .... فروری سنہ 1971ء

قیمت .... بارہ روپے پچاس پیسے

انتساب

اپنے بہنوئی ڈاکٹر احسان اور اپنی پیاری ثریّا کے نام
جو میرے ناول کے ایک ایک باب کو بصد شوق و انہماک پڑھتے
رہے ...... جنکے قیمتی مشوروں سے مجھے بہت مدد ملتی رہی ......!

یاسمین صوفی

خیام پبلشرز
پرانی انارکلی لاہور
ادب کی تابندہ قدروں کا درخشاں نشان

ڈبو دے شوق سے کشتی مری اے ناخدا لیکن
الم سے ہوگیا شق دامنِ ساحل تو کیا ہوگا

"کیا میں اندر آسکتا ہوں ۔۔؟" رضوان نے سعدیہ کی خواب گاہ کا نیلا دبیز پردہ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔۔۔۔

سعدیہ نے اپنی لمبی لمبی پلکیں ایک دم حیا کے بوجھ سے جھکا دیں۔ اور جلدی سے اپنی مخمور آنکھوں پر کلائی رکھ دی ۔۔۔۔۔ یہ اندازِ حیا تو رضوان کو بھاتا تھا۔۔۔ کہ اس کی شریکِ حیات ایک دم مشرقی خاتون ہے۔۔۔۔ جو اپنے شوہر کے سامنے بھرپور حیا کا مظاہرہ کرتی ہے، اور وہ بے چین ہو ہو اٹھتا ہے۔

سعدیہ منا تو سو رہا ہے۔۔۔۔۔ مگر بالکل میری تصویر ہے۔۔۔ اب، مجھے پتہ چلا۔ کہ تمہارا آئیڈیل کون تھا۔۔۔۔۔؟ سعدیہ میں کتنا خوش نصیب ہوں، جسے تمہارے پیار کی حدت ملی ۔۔۔ اور آج وہ حدت اس معصوم رشتے میں بھی رس بس گئی ۔۔۔ رضوان سعدیہ کے سرہانے بیٹھ گیا۔ اور پیار سے اس کی کلائی اس کے آنکھوں سے ہٹانے لگا۔۔۔۔۔

عاطفہ

سعدیہ مجھے ایک بار پھر ان مخمور نگاہوں میں ڈوب جانے دو۔ جنہوں نے میرے پیار کو جِلا بخشی...... رضوان نے پیار سے اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا......

"منّا اٹھ جائے گا۔" سعدیہ شرماتے ہوئے بولی۔

"سعدیہ میں تو آج ساری کائنات کو جگانے پر تلا ہوا ہوں... یہاں تم منّے کا کہہ رہی ہو۔" رضوان نے بھرپور نگاہوں سے زرد زرد سی سعدیہ کی طرف پیار میں ڈوبی نگاہوں سے دیکھا......

"معلوم ہوتا ہے، آج آپ بہت خوش ہیں۔" سعدیہ نے نیلا... شنیل کا لحاف گردن تک کھینچتے ہوئے کہا۔

"سعدیہ کیا تم خوش نہیں ؟ ۔ کہ خدا نے ہمیں پورے سات برس کے طویل صبر آزما لمحات کے بعد یہ دن دکھایا...... اماں نے کتنا زور دیا... دوسری شادی پر... بہنیں کتنی مُصر رہیں ___ ؟ تمہارے عزیز رشتہ دار بھی اشارے کنایوں میں مجھے دوسری شادی کی ترغیب دیتے رہے... میرے دوست مجھے اُکساتے رہے... مگر سعدیہ... میں نے تم سے محبت کی تھی... اور پھر خدا نے ہمیں ایک مقدّس ازدواجی رشتے میں بھی منسلک کر دیا۔ اور اس طرح ہمارا پیار انمٹ ہو گیا۔ اولاد دینا نہ دینا قدرت کے ہاتھ میں ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں ۔؟ اس کے معاملات میں دخل دینے والے...... تمہارے پیار نے مجھے بے دام کا غلام بنا رکھا تھا۔ بھلا میں ایسی گستاخی کر سکتا تھا...." رضوان ہنستے ہوئے

سعدیہ کا سر دباتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میرے رضی — میں دنیا کی خوش نصیب ترین ہستی خود کو سمجھتی ہوں۔۔ جیسے شوہر کے روپ میں محبوب ملا۔۔۔!" سعدیہ نے ہولے سے اپنا نرم ہاتھ رضوان کے ہاتھ پہ رکھتے ہوئے کہا۔

"ارے تمہیں تو بخار ہو رہا ہے —؟" رضوان نے تڑپتے ہوئے کہا۔۔۔

"فکر کی بات نہیں۔ لیڈی ڈاکٹر کہہ رہی تھیں، کہ تکان کی وجہ سے بخار ہو جایا کرتا ہے۔" سعدیہ نے اس کا تردد دور کرنے کے لئے بتایا۔

"تمہیں سعدیہ میں اسے فون کر کے دوا منگواتا ہوں۔۔۔ علی کو بھیج دیتا ہوں۔ ابھی آجائے گا۔۔۔ رضوان نے ایک دم اٹھتے ہوئے کہا۔۔۔

"وہ مجھے ایک انجکشن لگا کر گئی تھیں۔ اور یہ گولیاں بھی دے گئی ہیں کہ میں تین تین گھنٹے کے بعد کھاتی رہوں —!" سعدیہ نے برجستہ جواب دیا۔

"تو کیا تم نے گولیاں کھالی ہیں —؟"

"ابھی تو تین گھنٹے نہیں گذرے۔۔۔۔ آپ بیٹھئے اور مجھے کھلا کر جائیے۔۔۔!" سعدیہ نے نظریں جھکاتے ہوئے پیار سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"اوہ ضرور۔۔۔ میں نہ کھلاؤں گا تو کیا منا کھلائے گا۔؟ آج رات تو میں تمہارے پاس ہی رہوں گا۔۔۔ تمہیں پانی دوا کی ضرورت پڑتی رہے گی"۔۔۔ رضوان نے اس کی مسہری کے قریب کرسی کھسکاتے ہوئے کہا۔

"رضی! اماں کہاں سوئیں گی۔ تمہارا بستر ساتھ کے کمرے میں لگا دیا گیا ہے!"

سعدیہ نے آہستگی سے کہا۔

"اماں کو کیوں تکلیف دوں ــــ ؟ کیا میں تمہارا دُکھ سُکھ کا ساتھی نہیں۔ ؟"

"تم تو میرے جنم جنم کے ساتھی ہو۔ مگر بزرگوں کا کہا بھی ٹالا نہیں جا سکتا۔۔"

"بزرگ غلط بات کہیں تو ٹالا جا سکتا ہے۔ ؟"

"اب سوچو نا۔ اکل کو ہمارا مُنا ہماری بات کاٹے تو کیسا لگے گا۔۔۔"

"اچھا جی۔ مُنے صاحب ابھی چند گھنٹوں سے زیادہ عمر کے ہوئے نہیں۔ اور نکلے ہیں ہمارے مقابلے کے لئے" یہ کہتے ہوئے رضوان نے سرخ شنیل کا کمبل ہٹا کر ایک دم اسے پیار سے اپنی گود میں لے لیا۔۔۔ اور لگے اسے چمکا نے بلانے کبھی سیٹی سے بلاتے۔ تو کبھی زور زور سے جھنجھوڑتے۔۔۔ سعدیہ کے دل کو جیسے کچھ ہونے لگا۔۔۔ بے ساختہ کہہ اٹھی۔ "دیکھئے کہیں آپ کے ہاتھ سے گر نہ جائے۔۔"

"ارے بھئی۔ تمہاری امّی کا رنگ فق ہو رہا ہے۔ خدا کے لئے جاگ جایئے" رضوان منت سماجت پر اتر آئے۔

رضوان نے اپنی ناک اس کے معصوم گالوں پر رگڑنی شروع کر دی۔۔۔۔

تھوڑی دیر بعد مُنّے نے آنکھیں کھول دیں۔۔۔۔

"سعدیہ، دیکھو تو میرے مُنّے کی آنکھیں ہو بہو میری سعدی کی طرح ہیں۔۔۔" رضوان نے اس کی معصوم پیاری آنکھوں کو چومتے ہوئے کہا۔۔۔

"اور ناک نقشہ بالکل۔۔۔"

"میرے رضی کی طرح ــــ" کہہ کر سعدیہ نے جملہ مکمل کر دیا۔ اور دونوں کھلکھلا

کر ہنس دیئے۔۔۔۔منّے صاحب نے لبسورنا شروع کر دیا۔۔

"ارے ارے صاحب آپ ابو کی گود میں آکر روتے ہیں۔۔۔ ہم سب تمہاری چالاکی جانتے ہیں کہ تم اب اپنی امی کے پاس جانے کو بے قرار ہو رہے ہو"
رضوان نے اسے سعدیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔"لو جاؤ اپنی امّی کے پاس۔"

سعدیہ نے ہولے سے اُسے سنبھال لیا۔۔۔ مامتا کی گرمی پا کر بچہ ایک دم چپ ہو گیا۔ تو رضوان ہنستے ہوئے بولا۔۔۔۔

"بیٹا رقیب بنتے جا رہے ہو۔۔۔!"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ" سعدیہ نے فوراً رضوان کی بات کاٹ لی۔

"دیکھونا۔! کس دھڑلے سے تمہارے پاس آکر مجھے گھور رہا ہے"۔۔ رضوان نے اس کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"گھور کیا رہا ہے۔!" سعدیہ منّے کی حمایت کرتے ہوئے بولی۔

"ذرا دیکھو تو۔۔۔۔"! رضوان نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

سعدیہ نے نظریں جھکا کر اپنے پہلو میں لیٹے ہوئے منّے کی طرف دیکھا۔۔۔ اتنی ڈھیر سی پیار کی کائنات پا کر وہ گلنار ہو گئی۔۔۔ مکمل سات برس کے صبر آزما دور کے بعد قدرت نے اس کے پیار کی نشانی دکھائی۔۔۔ رضوان سعدیہ کی محویت کو انتہائی پیار سے دیکھ رہا تھا۔۔۔۔ آج اسے اپنی سعدی کہیں زیادہ حسین نظر آ رہی تھی شاید اس حسن میں ممتا کا وقار اور عظمت بھی شامل ہو گئی تھی۔۔۔ ایک عورت کو جس چیز پر دنیا میں سب زیادہ فخر و ناز ہوتا ہے۔ وہ اولاد کی بے بہا دولت ہے، جو

اُسے مکمل نسوانیت اور عظمت بخشتی ہے۔ اس بے بہا دولت کو پا کر وہ دنیا کی ہر دولت سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔ جب قدرت اس کے دامن میں پیار کی دنیا سمیٹ دیتی ہے۔

"سعدی بھئی! کچھ پیار ہمارے لئے بھی چھوڑ دو۔۔۔ ورنہ۔۔۔!" رضوان کی آواز میں ہلکی سی لرزش سعدیہ نے بھی محسوس کی۔

"منّا سو رہا ہے۔؟" اماں کمرے میں تسبیح کے دانے پھیرتے ہوئے داخل ہوئیں۔

"جاگ رہا ہے۔!" سعدیہ نے دھیرے سے کہا۔

"رضوان صبح میں نے بہت سی نیازیں دلوانی ہیں۔۔۔ خدا نے مجھے مرنے سے قبل میرا پوتا تو دکھا دیا۔ جو میرے بیٹے کا نام زندہ رکھے گا۔ خدایا اماں باوا کے زیرِ سایہ پروان چڑھا یو۔" اماں نے کچھ پڑھ کر ننھے کے منہ پر پھونک ماری۔۔۔ اور اسے سعدیہ کے پہلو سے اٹھاتے ہوئے بولیں۔

"دلہن تم تھک چکی ہو۔ اب سو جاؤ۔۔۔ یہ تمہارے سرہانے کے نیچے میں نے قینچی رکھ دی ہے۔ بے فکر ہو کر سو جاؤ۔۔۔"

"اماں قینچی کس لئے رکھی ہے۔؟" رضوان نے حیرت سے پوچھا۔

"زچگی کے دنوں میں عورت پر بڑا بار ہوتا ہے بیٹا۔۔۔ یہ اس کا توڑ ہے۔" ماں نے قینچی رکھنے کی وجہ بتائی۔" ایسے میں عورت کے سرہانے لوہے کی کوئی چیز رکھ دینے سے وہ بار نہیں رہتا۔"

"اماں یہ سب جاہلوں کی باتیں ہیں"۔ رضوان ماں کی اس سادہ لوحی پر ہنستے ہوئے بولا۔

"چلو بھئی تمہیں تو پڑھا لکھا کر بابو صاحب بنا دیا ہے۔ اب ہم جاہل ہی بھلے۔ اب تم بھی جا کر سو رہو۔ صبح دفتر جانا ہے ... اور پھر بہت سا کل کام بھی تو ہے۔" اماں نے ایک ہی سانس میں ساری باتیں کہہ دیں۔

"اماں میں اکیلا کہاں سوتا پھروں گا ... یہیں آپ کے پاس لیٹ جاؤں گا" رضوان نے کن انکھیوں سے سعدیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا .. یک بارگی سعدیہ کی نگاہیں اس کی نگاہوں سے ٹکرائیں ... بے پناہ پیار کا سمندر اس کی آنکھوں میں پا کر حیا سے نظریں زمین بوس کر لیں ...

"چل ہٹ ایسی باتیں نہیں کرتے۔ دلہن سارا دن کی تھکی ہوئی ہیں ... اب اسے سو جانا چاہیئے" اماں نے بیٹے کو ٹھیک سے جھوٹ بہلاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر اماں کب تک دوسرے کمرے میں سونا پڑے گا .... رضوان نے زچ ہو کر کہا۔

"جب تک دلہن زچگی کا سر نہ دھولیں۔ !"

"اماں پھر تو کل ہی ان کا سر دھلا دیجئے" رضوان کے لہجے میں منت اتر آئی۔

"اللہ سے بچلے۔ چالیس دن سے قبل عورت پاک نہیں ہو سکتی ... !"

"چالیس دن۔" رضوان نے حیرت سے منہ پھاڑتے ہوئے دہرایا۔

"چل اب سو جا..." ماں نے پیار سے اس کے سر پر دھول جماتے ہوئے کہا۔

"اچھا اماں ایک بار اپنے منّے کو پیار تو کر لینے دیجئے"

"رضوان! وہ سو رہا ہے۔ پھر اٹھ جائے گا۔" اماں نے منع کرتے ہوئے کہا

"اماں صرف ایک نظر دیکھ لوں گا..." کہہ کر رضوان آگے بڑھا۔ دایاں ہاتھ سعدیہ کے ہاتھ پر رکھ کر زور سے دبایا.. اور بائیں ہاتھ کو جھولے پر دبائے رکھا۔

"بہت سنگدل ہو"! اس نے دھیرے سے کہا... اور خدا حافظ کہہ جلدی سے دبیز نیلا پردہ ہٹا کر باہر نکل گیا... ماں دزدیدہ نگاہوں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ ایک ہلکی سی پُراسرار مسکراہٹ ان کے لبوں پر ابھری۔ انہیں شاید کچھ اپنا زمانہ بھی یاد آگیا... پھر بجلی جلا کر ٹیبل لیمپ کی ہلکی روشنی کر کے خود اپنے پلنگ پر جا لیٹیں، اور جھولا اپنے قریب کر لیا۔

"دلہن رات کو کسی چیز کی ضرورت پڑے تو مجھے آواز دے لینا" سر پہ دوپٹہ رکھتے ہوئے اماں نے تاکید کی۔

سعدیہ نے بیقرار نظروں سے جھولے کی طرف دیکھا... ایک دم اس کے دل میں ایک خواہش مچلی۔ کہ کاش اماں ننھے کو جھولے میں ڈالنے کی بجائے اس کے پہلو میں لٹا دیتیں۔ مامتا کے سات سالہ جذبے کی تسکین ہو جاتی۔ اسے رہ رہ کر ایک ہی خیال ستاتا رہا کہ کہیں منّا رات کو ننگا نہ سو جائے۔ کہیں اسے سردی نہ لگ جائے... عجب طرح کا جذبہ وہ دل میں اُمنڈتا محسوس کرتی رہی۔

عاطفہ

غرض سات سال کی تمناؤں کو دونوں میاں بیوی نے خوب دل کھول کر پورا کیا۔ اور اپنی خوشی میں عزیز و اقارب اور سارے شہر کے لوگوں کو بھی شامل کیا۔ رضوان تو اس قدر خوش تھا کہ دفتر سے سیدھا بھاگتا گھر پہنچتا۔ . منّا خواہ سویا ہوا ہو۔ وہ اسے جگا کر گود میں لے کر ضرور اچھلنا کودنا۔ . . جب تک سعدیہ آ کر اس کی گود سے بچہ نہ لے لیتی . . . وہ اسے کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کو تیار نہ ہوتا۔ . اور وہاں سعدیہ تنہائی میں کتنی کتنی دیر تک منّے کو اپنی گود میں لئے رہتی جس نے اس کی سوکھی کھیتی کو ہرا کیا۔ . . اور اس کے دل کی تمنّاؤں کو پورا کیا۔ منے کا نام عمران رکھا گیا . . . ایک بار پھر اس خوشی میں سارے شہر کے لوگوں کو شاندار ضیافت پر مدعو کیا گیا۔ دعوت کھا کر لوگوں نے منّے کی درازیٔ عمر کی خوب دعائیں دیں اور اس طرح ایک ایک کر کے رشتہ دار جانے لگے۔ !!

رضوان محکمہ جنگلات کا ایک آفیسر تھا۔ حد درجہ دیانت دار شریف النفس اور حلیم الطبع انسان، یہی وجہ تھی کہ اس کے عملے کے سارے لوگ دل سے اس کی عزت کرتے تھے۔۔۔۔ جتنی اچھی صفات کا مالک رضوان تھا۔ اتنی ہی شاندار عادات کی مالکہ سعدیہ بھی تھی۔ اس نے اپنے چھوٹے سے بنگلے کو رشکِ جنت بنا رکھا تھا اور ارد گرد کے لوگوں کے لیے خلوص کا مرکز۔ دو چار تو پہاڑی علاقے پر گھر بار رہتے تھے اور بہت کم لوگ اپنے بیوی بچوں کو ساتھ رکھتے تھے جن کی بیویاں تھیں وہ سعدیہ سے اس حد تک مانوس تھیں۔ کہ اپنا سارا دکھ سکھ اسے سنا کر مطمئن ہو جایا کرتی تھیں۔ وہ بھی اتنی ہمدردی سے ان کی باتیں سنا کرتی۔ کہ عورتیں اسے بالکل اپنا سمجھتیں۔۔۔۔ جب سے انہوں نے سنا۔ کہ رضوان صاحب کے ہاں خدا نے سات سال کے بعد اولاد دی ہے۔۔۔ ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ دعائیں مانگ رہی تھیں، کہ کب باجی سعدیہ آئے۔ اور وہ سب اپنی خوشی کا اظہار کریں۔

رضوان تو چھٹی کے بعد واپس اپنی ڈیوٹی پہ آ گئے۔۔۔ سب مردوں نے خوب مزے سے ایک پارٹی اڑائی۔۔۔ اور عورتیں بے چاریاں ہنوز تاک میں تھیں۔ چالیس دنوں میں کئی بار رضوان ننھے عمران اور سعدیہ کو دیکھنے آیا۔ خدا خدا کر کے سعدیہ نے چالیسویں کا سر دھویا۔۔۔ تو رضوان بضد ہو گیا۔۔ کہ آج ہی سعدیہ کو لے کر جانا ہے۔۔۔ ماں نے پیار بھری ڈانٹ پلائی۔۔۔ کہ ابھی سعدیہ بہت کمزور ہے۔ سفر کے قابل نہیں۔۔۔ ایک مہینے کے بعد لے جانا۔ مگر رضوان کے دل سے کوئی پوچھتا کہ یہ دن اس نے کس عالم میں گذارے تھے۔۔۔ سعدیہ رضوان کی بے قراری کو خوب سمجھتی تھی۔۔۔ مگر وہ ابھی چاہتی تھی کہ چند دن اور اماں کے پاس رہ لے۔ کیونکہ انہوں نے منّے کو اس طرح سنبھالا ہوا تھا۔ کہ ابھی وہ اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔۔ خاص طور پر اس کا نہانا سب سے دشوار گذار مرحلہ ہوتا تھا ایک مرتبہ اماں کسی کی عیادت کو گئی ہوئی تھیں۔ منّے کے نہانے کا وقت ہو چلا تھا رو رو کر اس نے برا حال کر رکھا تھا۔۔۔ تھک کر مجبور ہو کر سعدیہ نے اسے نہانا شروع کیا۔۔۔ مگر بچہ تھا کہ ہاتھوں سے پھسل پھسل جا رہا تھا۔۔۔ کہ یک بارگی اس کے ہاتھ سے وہ اس طرح پھسل گیا جس طرح صابن ہاتھ سے۔۔۔ منے نے ایک زوردار چیخ ماری ۔ اور ماں نے اس سے زیادہ تڑپ کر۔۔ "ہائے میں مری" کا نعرہ لگایا۔۔۔ وہ تو شکر ہوا۔۔۔ کہ نیچے سلیپچی رکھی ہوئی تھی۔۔۔ ورنہ ہوتا بہت بُرا۔ کتنی دیر تک اس کا دل دھک دھک کرتا رہا۔۔۔ جلدی سے اسے تولیے میں لپیٹ کر اپنے سینے سے چمٹا لیا۔۔۔ ماں کی بے قراری کو قرار آ گیا۔ اور بچہ بھی اپنی

پیار بھری آغوش پاکر بہل گیا۔۔۔ شام کو جب اماں آئیں تو فردوس نے (جو سعدیہ کی چھوٹی نند تھی۔ اور ابھی دسویں کی طالبہ تھی) ماں سے چغلی کھائی کہ "آج بھابی نے منے کو گرادیا تھا۔۔" "الٰہی خیر۔۔۔ میری لاج رکھیو"۔۔۔ کہہ کہ ہاتھ ملتی ہوئیں کمرے میں داخل ہوئیں۔۔۔۔

"دلہن کہاں ہے میرا لال۔۔۔ کیسی طبیعت ہے۔ کیسے گرادیا۔۔۔" ایک ہی سانس میں وہ کئی سوال کر گئیں۔۔۔

اور سعدیہ نے دبے دبے لفظوں میں ساری حقیقت کہہ سنائی۔ اس پر ساس صاحبہ نے حکم صادر فرمایا۔۔۔ "کہ آج کے بعد تم منے کو کبھی نہ نہانا۔۔۔ خدانخواستہ اس نازک سے پھول کو کچھ ہو جاتا۔۔۔ تو میں بے موت مر جاتی" بس اس روز کے واقعہ سے سعدیہ کا دل اتنا سہما ہوا تھا۔۔۔ کہ وہ فی الحال رضوان کے پاس جانے کو تیار نہ تھیں۔۔۔ اس کے چہرے پر خاموشی کی دبیز تہیں دیکھ کر رضوان سے رہا نہ گیا اور اس نے آہستگی سے پوچھا۔۔۔

"سعدی تمہیں اپنے گھر جانے کی کوئی خوشی نہیں۔۔۔"

"نہیں نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔۔۔"

"کوئی بات تو ضرور ہے۔۔۔ تمہارے گھر کے در و دیوار تمہیں پکار رہے ہیں۔۔۔ گھر کا ذرہ ذرہ اپنے نئے مالک کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہو رہا ہے۔۔۔ سب کچھ وہاں تمہارے ہاتھوں کا سجا ہوا موجود ہے۔۔۔ مگر گھر کی مالکہ نہ ہونے سے جتنی سنسانی میں نے محسوس کی۔۔۔ تم محسوس نہ کر سکو گی۔۔۔۔"

رضوان نے گھمبیر لہجے میں کہا۔۔۔ اور سعدیہ حیران رہ گئی۔۔۔ کہ شادی کے بعد جبکہ وہ محبوب محبوبہ نہ رہے۔ بلکہ میاں بیوی کا رشتہ قائم ہو چکا ہے۔ ابھی تک رضوان اسے دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہے۔۔ سنا تو یہی تھا۔ کہ شادی کے بعد پہلی سی محبت نہیں رہتی۔۔۔۔ مگر وہ تو رضوان کی دلی کیفیات سے بخوبی واقف تھی منّے کی پیدائش سے سات سال قبل۔ لوگوں نے کس کس طرح اسے نہیں ستایا۔۔ ساس صاحبہ کن ارمانوں سے بیاہ کر لے گئی تھیں۔ مگر دوسرے ہی سال بے صبری کا یہ عالم تھا۔۔ کہ بیٹے کو بار بار بے اولادی کے طعنے دیتیں۔ اور گاہے بگاہے اسے شادی کے لئے تیار کرتی رہیں۔۔۔ اور تو اور۔ اس کی سگی خالہ نے اشاروں کنایوں میں اپنی بیٹی دینے کا ارادہ کر لیا۔ مگر ایک رضوان تھا۔۔ جس کا ارادہ اٹل۔ اور جس کا پیار امنٹ تھا۔۔ وہ دوسروں کی باتیں سنتا۔ اور مذاق میں ٹال دیتا۔۔۔ اور کہتا کہ تم سعدی جیسی بیوی مجھے کہیں سے لا کر نہیں دے سکتے۔۔۔ آخر خدا نے ان کا صبر آزما لیا۔ اور دونوں میاں بیوی کی محبت کو ابدی بنانے کے لئے اولاد کی بے بہا دولت بخش دی۔۔۔۔

”کیا سوچ رہی ہو سعدی۔۔۔۔ محبت کا لطیف جذبہ الفاظ کی گرمی سے آزمانا چاہتی ہو۔ یا اپنے رضی کی آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوب کر دیکھنا چاہتی ہو“ رضوان نے سوچتی ہوئی سعدی کو جگاتے ہوئے کہا۔

”رضی تمہیں پا کر میں کسی اور جنت کی خواہش کروں۔ یہ ناممکن ہے۔۔۔ میں اپنے نصیبے پر خود رشک کرتی ہوں۔۔ مجھے تمہاری بے قراری، تڑپ کا بخوبی

اندازہ ہے۔ کہ تم اپنی سعدی کے بغیر ایک منٹ نہیں رہ سکتے ... مگر اب تو تم منّے کی محبت میں بے قرار ہوئے جا رہے ہو .... منّے ہی کی محبت مجھے وہاں جانے سے روک رہی ہے ...

اس کا کیا مطلب ۔ ؟ رضوان نے حیرانی سے پوچھا۔

رضی .... دیکھو نا .... سات سال کے طویل عرصے کے بعد خدا نے ہمیں اولاد دی ہے ۔ مجھے تو ابھی بچے پالنے کا کوئی تجربہ نہیں ... ابھی چند دن ہوئے۔ منا نہانے کے لئے خوب رو رہا تھا۔ امی گھر پہ نہ تھیں ... میں نہلانے لگیں ۔ اور منا میرے ہاتھوں سے پھسل کر گر گیا ... چاہتی ہوں ۔ ذرا سا اور بڑا ہو جائے تو پھر کوئی خطرہ نہیں رہے گا ۔ ! سعدیہ نے معصومیت سے کہا ۔

سچ مچ کی پگلی ہو ۔ اور بہت زیادہ معصوم بھی ... ارے جان من تم وہاں چلو تو سہی ... گڈی کی ماں نہلا دیا کرے گی ... پپو کی ماں کپڑے دھو دیا کرے گی ... تمہاری ایک ایک سہیلی تمہارے لئے بے چین ہے ۔ میں اپنے چوکیدار کی ماں کو ہر وقت منے کی دیکھ بھال کے لئے بلا لوں گا ... لو بھلا اس میں تردد کی کیا بات ہے ؟ رضوان نے منے کو گود میں لیتے ہوئے کہا۔

منے میاں سن لیا نا ... اپنی امی کی بہادری کا کارنامہ ... بھئی ہم تمہیں ہر روز خود نہلایا کریں گے ..... دفتر سے بھاگ آیا کریں گے ... اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اپنے منے کو پہلوان بنا دیں گے ... منے نے انگڑائی لی ۔

تو سعدی دیکھو ہمارا منا کہتا ہے ۔ اتنا بڑا پہلوان بنوں گا ۔ ! رضوان نے

ہاتھوں کو پھیلا کر منے کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ ۔ ۔

جیسے باپ پہلوان ہے۔ ۔؟ سعدیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

کیوں بھئی ہم کسی پہلوان سے کم ہیں۔ ۔؟ رضوان نے منّے سے پوچھتے ہوئے کہا

"پھر کل چلیں گے۔ ۔ ۔ ۔! سعدیہ نے کہا۔

"مگر آج جاتے ہوئے کیا انکار ہے۔ ۔؟"

"بڑے ضدی ہیں۔ دیکھئے نا۔ ۔ ۔ تین ماہ سے آئی ہوئی ہوں۔ ۔ سارا سامان بکھرا ہوا ہے۔ ۔ ۔ وہ سب بند کرنا ہے۔ اور یہ ایک دن کی تیاری میں نہیں ہو سکتا۔" سعدیہ نے کمرے کی چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔

لو اور سنو۔ اتنے سے سامان کے لئے ایک پورے دن کی تیاری۔ ۔ ۔ ۔ الماریوں میں ہینگر سے سوٹ اتار کر ٹرنک ہی بند کرنا۔ ۔ ۔ منّے کے سامان کی باسکٹ تو علیحدہ ہی ہے۔ اس کا اٹیچی بستر بھی الگ ہے۔ ۔ ۔ تمہارا ٹرنک علیحدہ۔ ۔ تو پھر تیاری کیسی"؟ رضوان نے لاپرواہی سے ادھر اُدھر دیکھا۔ ۔ ۔ ۔

سعدیہ نے کہہ سن کر اسے رضامند کر لیا۔ ۔ ۔ اور وہ بازار کچھ شاپنگ کے لئے نکل گیا۔ ۔ ۔ سعدیہ نے اماں سے دبے لفظوں میں اجازت چاہی۔ ۔ ۔ کچھ ردّوکد کے بعد اجازت مل گئی۔ اس نے جلدی جلدی سارا سامان پیک کرنا شروع کر دیا۔ جب تک رضی بازار گئے۔ سعدیہ اپنا بکھرا ہوا سامان بند کر چکی تھی۔ ۔ ۔ ساس ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے منّے کو گود میں لئے بیٹھی ہوئی تھیں۔ سعدیہ انہیں غمگین دیکھ رہی تھی۔ مگر کیا کرتی۔ ۔؟ مجازی خدا ۔ ۔ ۔ اور پھر اپنے محبوب شوہر کو

کیسے ناراض کر دیتی۔ مہینے میں ایک آدھ بار تو وہ آتی جاتی ہی رہتی۔۔اس لیۓ وہ پشیمان نہ تھی۔۔شام ہو چکی تھی۔۔کہ رضوان لدے پھندے گھر میں داخل ہوئے۔۔۔ منے کے لئے آسٹر ملک کے ڈبے۔۔ فیڈل۔۔۔نیپکن۔۔۔کھلونے۔۔ لسبکٹ ٹافیاں۔ سعدی کے لئے طاقت کے سیرپ۔۔۔ سیب کا مربہ۔۔ اوولٹین اور الا بلا خرید کر لائے تھے۔

سعدی نے مصنوعی غصے سے کہا۔

"اتنا بہت سا سامان۔ پیسے برباد کرنے کوئی آپ سے سیکھے۔"

"کماتے کس کے لئے ہیں۔؟" رضوان نے مخمور نگاہوں سے سعدیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"کماتے تو ہمارے لئے ہیں۔ مگر یہ فضول خرچی ہے۔؟

"ہوتی رہے۔ میرا نظریہ دولت جمع کرنا نہیں۔۔۔ اس کا جائز مصرف ہے۔ اب بھلا بتاؤ اس میں کونسی چیز فالتو یا بے کار ہے؟" رضوان نے پیار سے ہر چیز دکھاتے ہوئے کہا۔۔۔

اس میں کیا ہے۔؟ ایک پیکیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سعدیہ نے پوچھا۔۔۔۔۔

"یہ پیکیٹ یہاں دکھانے کا نہیں۔۔؟ اپنے گھر چلو گی۔ تو پھر دیکھا دیا جائے گا۔" رضوان کی آواز میں بے پناہ محبت کی ملاوٹ سعدیہ نے محسوس کی۔

کوئی خاص چیز ہے۔؟"

"بالکل ــــ !"

"کیا ــ؟ بتلا بھی دیجئے ــ" سعدیہ نے پیار سے پوچھا ــ

"تم نے ہمیں منّے کا بتلایا تھا۔ جو ہم بتلا دیں ..." ! رضوان نے شوخی سے کہا۔

"شریر ...." ! کہہ کر سعدیہ کی سرمگیں نگاہیں و فورِ حیا سے جھک گئیں ... اور اس کا چہرہ شفق کی طرح گلنار ہو گیا ... اسے اپنے کانوں کی لویں تک گرم ہوتی محسوس ہوئیں ــ

"کیوں جناب یہ شرمانا کیسا ــ؟" رضوان نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا ...

"چھوڑیئے کوئی آجائے گا ..." ! سعدیہ نے نیچی نگاہوں سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

میری کمزوری کو خود ہی تو آزماتی ہو ــ کہ جہاں میں نے تمہارے چہرے پہ شفق کی سُرخی دیکھی ــ نگاہوں کو حیا بار انداز سے جھکا دیکھا .... ہونٹ کپکپاتے محسوس کئے ــ ... وہیں تمہارا رضی ....." !

"اللہ ــ کوئی باتیں بنانا آپ سے سیکھے ...." سعدیہ نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی ــ

"سعدیہ تمہیں معلوم ہے ــ کہ جب پہلی بار میں نے تمہیں ماموں شہزاد کی شادی میں دیکھا ... تم دولہا کو تنگ کرنے کے لئے بار بار ڈھیر سی سہیلیوں کے ساتھ آتی رہیں ــ اور پھر میں نے اس شرارت کا تمہیں کیسا مزہ چکھایا .. کہ جب تم باہر جانے لگیں تو میں نے دروازہ بند کر دیا .... اُف خدایا ... آج بھی وہ حسین حادثہ تصورات کی دنیا میں جگمگاتا ہے ــ اتنی لڑکیاں نظر سے گذرتی رہیں ..

مگر تمہارا اندازِ حیا مجھے ایسا بھایا۔۔۔ کہ اسی وقت دل دے بیٹھا۔۔ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں تمہیں یاد ہوگا۔۔۔ کہا تھا۔۔۔۔

صاحبہ امید ہے اب شرارت نہیں کریں گی۔۔۔!"

"خدا کے لئے دروازہ کھول دو۔۔" آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں میں تڑپتی ہوئی التجا نے مجھے بیگانۂ حواس کر دیا۔۔۔ دل چاہتا تھا۔۔ کہ تم ساری زندگی اسی طرح مجھے دیکھتی رہو۔ اور میں بے قرار ہوتا رہوں۔۔۔۔ میں نے کہا تھا۔

"پہلے اپنا نام بتلا دو۔۔۔ پھر سزا میں ترمیم ہو گی۔۔" تم نے ایک بار پھر اسی تڑپتے ہوئے انداز میں مجھے دیکھا۔۔ اور بے بسی سے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔

"سعدیہ۔۔۔" مجھے ایسا محسوس ہوا۔۔ جیسے کئی مترنم سی گھنٹیاں میرے کانوں میں بج اٹھیں۔۔۔" اور مجھے رضوان کہتے ہیں۔۔۔ شہزاد میرے ماموں ہیں" کہہ کر میں نے دروازہ کھول دیا۔۔۔ تم اس طرح کھل اٹھیں جیسے کسی نے قفس کا دروازہ کھول دیا ہو۔۔۔ تم بے تابی سے بھاگیں۔۔۔۔ اور پھر ایک بار رُک کر تم نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔۔۔ اور میرا ہاتھ بے ساختہ خدا حافظی کے لئے اٹھ گیا۔ تمہاری آنکھوں میں ان گنت پیار کے دیپ جل اٹھے۔۔۔۔ اور تم ہجوم میں کھو گئیں اور میں کتنی دیر تک دروازہ پر کھڑا رہا۔۔۔ جانے کیوں ۔۔۔؟ کس کے انتظار میں؟ اور جب رات کو سونے لگا تو بے قراری سے کروٹیں بدلتے بدلتے رات بیت گئی۔۔۔ سعدیہ، سعدیہ کی آوازیں مجھے اپنے دل کی گہرائیوں سے آتی سنائی دیں مگر سعدیہ کہاں ۔۔۔؟

سعدیہ سچ بتلاؤ۔ تم پر وہ رات کیسے گذری تھی۔؟" رضوان نے اچانک ایک ماضی کا سوال کر ڈالا۔۔۔

"عام راتوں کی طرح ہم تو مزے سے سوتے رہے۔۔۔۔!" سعدیہ نے شرنگیں لہجے میں کہا۔

"تمہیں بالکل میرا خیال نہ آیا"، رضوان نے افسردگی سے پوچھا۔۔

"تھوڑا سا آیا تھا۔" سعدیہ نے پیار سے کہا۔

"کتنا۔؟"

"اتنا" سعدیہ نے انگوٹھے اور ساتھ کی انگلی کے ناخنوں کو آپس میں ملاتے ہوئے دکھایا۔

"تمہارا خیال کس انداز میں جلوہ گر ہوا تھا۔"

"چھوڑو رضی۔۔۔ ماضی کی بھول بھلیوں میں کہاں کھونے لگے۔۔۔ ماضی کو یاد کرو گے تو خود بھی بھٹک جاؤ گے۔!" سعدیہ نے ہنس کر ٹالتے ہوئے کہا۔

"دل چاہتا ہے۔ ماضی میں ایک بار پھر کھو جاؤں۔۔۔ کہونا۔۔۔ میرا خیال کس انداز میں جلوہ گر ہوا تھا۔؟" رضوان نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔۔۔

"یہی کہ تم ایک دم بہت ہی شرارتی اور زندہ دل انسان ہو۔!" سعدیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اور اب۔"

"اب بھی ویسے ہی زندہ دل ہو۔!"

"تم بہار کی پہلی صبح ہو۔ سعدی یہ زندہ دلی۔ تمہارے پیار نے مجھے بخشی ہے تمہارے چہرے پر حوروں کا سا تقدس اور تمہارے خیالات میں فرشتوں کی سی پاکیزگی ہے۔ جس نے میرے پیار کو امر بنا دیا ہے ... جو تڑپ جو خلش، جو بے قراری میں نے اپنے دل میں پہلے دن محسوس کی تھی ... اب بھی اُن ہی کیفیات سے دوچار ہوں ..." رضوان نے پلنگ کے ساتھ سر ٹیکتے ہوئے کہا

"پہاڑ پر کیسا موسم ہے؟" سعدیہ رضی کے چہرے پر ابھرتے ڈوبتے رنگوں کی آمیزش دیکھ کر بات بدلاتے ہوئے بولی ...

بہت حسین، بہت پیارا مگر تم سے کم ۔! رضی نے مخمور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا ...

"نازلی کی امّی پنجاب سے آگئی ہیں ۔"

"سب لوگ آچکے ہیں۔ اگر کوئی نہیں آیا ۔؟ تو وہ میرا مہربان ہے ۔"

"تمہارا مہربان بھی کل تک پہنچ جائے گا ۔"

"سچ سعدی ... تمہارا گھر سونا ہے۔ میں تمہارے گھر ہی جاتا ہوں۔ تو وہ مجھ سے یہی سوال کرتے ہیں ... کہ ہماری مالکہ کو کیوں نہیں لے کر آئے ... تمہارے ہاتھوں کے لگائے ہوئے پودے بھی تمہاری جدائی میں مرجھا گئے ہیں ۔"

"ہائے اللہ میری پھلواری کی حفاظت نہیں کی ہو گی نا ..." سعدیہ نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری ہر شے کی حفاظت کرنا میرا ایمان ہے سعدی... اکبر بابا تو خاص طور پر تمہاری کیاریوں کو دیکھنے آتے ہیں۔ اور میں باقاعدگی سے پانی دیتا ہوں۔"

"پھر وہ پھول کیسے مرجھائے۔؟" سعدیہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"شدید انتظار میں پرکشش آنکھیں بھی غمگین ہو جایا کرتی ہیں... وہ تو بے چارے معصوم پھول ہیں۔"

اوہو۔ رضی... آج تم شدید رومانی موڈ میں ہو... کاش محکمہ جنگلات کی سروس چھوڑ کر شعر و شاعری یا ادیب بن جاتے... تو اپنے رنگین الفاظ سے کئی دلوں کی دھڑکن بن جاتے..." سعدی نے رضی کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا......

"کہو تو اب ملازمت چھوڑ دوں۔؟"

"نا.. نا... نا بابا ایسا نہ کرنا... !"

"کیوں تمہیں شاعر یا ادیب پسند نہیں۔"

"پسند صرف اس حد تک... کہ ان کی تخلیقات یا نگارشات پڑھوں۔" سعدیہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"اور ان کی ذات کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔؟" رضوان نے تکیہ سر کے نیچے دوہرا کرتے ہوئے پوچھا۔

ہر وقت خیالات میں کھونے والے انسان خوابوں کے جزیرے

ہیں بھٹکتے رہتے ہیں۔ وہ اس دنیا میں انہونی باتوں کو پسند کرتے ہیں۔ جو وہ خوابوں کے حسین جزیروں میں دیکھتے ہیں۔۔۔ اور یہ زندگی نام ہے جدوجہد کا۔۔۔!! خیال اور عمل دو متضاد فعل ہیں۔۔۔" سعدیہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن سعدی ہر عمل سے پہلے ہم اس کے خیال کا نقشہ اپنے ذہن میں مرتب کرتے ہیں۔ رضوان نے تردید کرتے ہوئے کہا۔۔۔

"کام کرنے کا جذبہ تو دل میں ہوتا ہے نا۔۔! خیالات ہی خیالات کی یلغار میں دن رات ایک نہیں کر دیئے جاتے۔۔۔" سعدی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ نظریہ بھی تمہارا کچھ ٹھیک نہیں۔۔۔۔۔ کہ تم بیچارے شاعروں اور ادیبوں پر الزام تراشی کر رہی ہو۔ کہ وہ عملی دنیا سے کنارہ کش ہوتے ہیں۔ وہ کسی اور زمانے کے ادیب یا شاعر تھے۔ جو حالات کی سازگاری سے مطمئن ہو کر دن رات اپنے خیالوں میں کھوئے رہتے تھے۔۔۔ اور پھر اپنے خیالات کی گہرائیوں میں موتی آبدار ڈھونڈ کر صفحہ قرطاس پر ہمارے سامنے بکھیر دیا کرتے تھے۔ مگر آج کل کے بے چارے ادیب و شاعر سارا دن غم روزگار میں دفتروں، اسکولوں، کارخانوں، فوج اور ہسپتال میں مصروف رہتے ہیں۔ اور کہیں جا کر رات کی خاموشی میں اپنے سارے خیالات کو یکجا کر کے اپنے فن پارے دکھی لوگوں کی زبوں حالی سے متاثر ہو کر جو دن

پھر ان کے مشاہدے میں آتے ہیں پیش کرتے ہیں۔۔۔۔" رضوان نے کمال سنجیدگی سے سعدیہ کو متاثر کر لیا۔۔۔۔۔

" یہ تو آپ نے بجا فرمایا۔۔ ویسے عام انسان اور ادیبوں شاعروں میں فرق ضرور ہے۔!"

" سعدیہ عزیز یا اگر یہ فرق نہ ہوتا۔۔ تو ہم پھول کی دلکشی۔۔۔۔ ستاروں کی چمک۔ چاند کی چاندنی اور کائنات قدرت کی رنگینیوں سے کس طرح لطف اندوز ہوتے۔ ہمیں ان کے خیالات کی گہرائیوں نے اندازِ فکر بخشا۔۔۔ اور نظر کو اتنی وسعت بخشی کہ ہم بھی ہر چیز کی لطافتوں کو محسوس کر کے لطف اندوز ہونے لگے۔ دور نہ جاؤ میں تمہیں تمہاری محبت کی ہی مثال دوں گا۔۔۔۔ اگر نگاہ میں وسعت و دلکشی اور دل میں تڑپ و کرب کا احساس نہ ہوتا۔۔۔ تو تم کس طرح میری محبت کا مرکز بن جاتیں۔ نگاہ کی وسعت اور دل کی تڑپ نے میری زبان کو وہ چاشنی بخشی کہ میرے منہ کا نکلا ہوا ہر لفظ تمہیں حیاتِ نو بخشتا ہے۔۔۔ اگر یہ زبان خاموش رہتی۔ تو تم میرے دل کا حال کیسے جانتیں۔؟ میری زبان کی چاشنی الفاظ نے تمہیں محبت کی وہ رنگینی و شادابی بخشی ہے۔۔۔۔ کہ جب تک مجھ میں گفتار کی طاقت ہو گی۔ تم ایک سحر انگیز اثر کے تحت میری محبت کا یقین کرتی رہو گی۔۔ ۔مرد اس معاملے میں قدرے فراخ دل ہوتا ہے۔۔۔۔ وہ اپنے دل کے امنڈتے ہوئے سارے جذبات کو یک جا کر کے زبان پر شیریں و گرم الفاظ کی صورت میں ادا کر کے دوسرے کو مطمئن کر دیتا ہے۔۔۔۔ مگر معاف

کرنا عورتیں اس معاملے میں قدرے بخیل ہوتی ہیں۔۔۔۔ یقیناً وہ بھی ملکہ جذبات ہوں گی۔۔۔۔ ان کے دل میں بھی تڑپ و کرب کا احساس پیدا ہوتا ہوگا۔ ان کی نگاہ میں بھی وسعت پیدا ہوتی ہوگی۔۔۔ مگر وہ اپنے اس طوفان کو دبانا خوب جانتی ہیں۔ تمہاری بے پناہ محبت کا اظہار وہ اندازِ حیا ہے۔۔ جسے میں بخوبی سمجھتا ہوں۔ کہ تم اپنے اس بیکراں جذبے کو کتنی چابک دستی سے حیا میں لپیٹ کر اپنے محبوب شوہر کے سامنے پیش کرتی ہو۔۔۔ اور وہ سرشار ہو اٹھتا ہے۔ اس نرالے انداز پر۔۔۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے مسرور و خوش قسمت انسان سمجھتا ہے۔۔۔ پرکھنے اور سمجھنے میں بھی فرق ہے۔۔۔ میں تمہاری ہر شرمیلی ادا کو سمجھ چکا ہوں۔۔۔ اس لئے کبھی شاکی نہ ہوا۔۔۔ تمہاری طرح اور بھی بہت سی عورتیں اپنے اس بیکراں جذبے کو اسی صورت میں اپنے شوہروں کے سامنے پیش کرتی ہوں گی۔۔۔۔ مگر ان کے شوہروں کے پاس وہ نگاہوں کی وسعت نہ ہوگی۔ جس کی کسوٹی پر وہ انہیں پرکھ سکیں۔۔۔ وہ بیوی کی حیا کو ایک ڈھکوسلہ سمجھ کر تہذیب نو کی بے باک تتلیوں کا پیچھا بے باک طریق سے ایک بھونرے کی طرح کرتے ہیں۔۔۔ گھر کی حور کو چھوڑ کر باہر کی بے باکی پر وہ مرتے ہیں۔۔۔ صرف اپنے اس جذبے کی تسکین کی خاطر۔ کہ ایک طرف سے تو گرمجوشی کا اظہار ہو۔ اور دوسری طرف سے مکمل خاموشی۔۔۔۔ یہ خاموشی انہیں ایک اکتاہٹ میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اور وہ گھر سے فرار حاصل کرتے ہیں۔۔۔"

عاطفہ

رضی سوچئے نہ ۔ کہ عورت اپنی فطرتی شرم کو کیسے بالائے طاق رکھے اس میں تو مرد کا سراسر قصور ہے ..... کہ وہ اپنی بیوی سے ایک غلط اور ناجائز قسم کے سوال کا حل چاہتا ہے۔" سعدیہ نے رضی کی بات کاٹتے ہوئے اپنی صنف کی حمایت کرتے ہوئے کہا....

"یہی بات تو پگلی میں تمہیں سمجھا رہا ہوں ۔ کہ عورت اپنی فطرتی شرم کو چھپاتی ہے ۔ اور مرد اس سے اکتا کر دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگتا ہے ۔ مرد کی فطرت سے ہی بخوبی واقف ہوں ۔ کہ وہ کبھی قناعت پسند نہیں ..... وہ کبھی ایک شئے پر اکتفا نہیں کرتا ۔ اس کی طبیعت تنوع پسند ہوتی ہے ... اچھی بیویاں اس فطرت کا مطالعہ کر کے خود ہی ان صفات کا ہر عمل استعمال کر سکتی ہیں ... میاں بیوی ایک مقدس رشتے کا نام ہے ۔ جب دونوں ایک ہو جاتے ہیں تو پھر اتنے حجابوں سے کیوں نہیں ۔ ... اچھی بیوی اپنے شوہر کی فطرت سمجھ کر کہ وہ اس کی زبان سے اظہار محبت چاہتا ہے ۔ اس کا عمل باشرم اس کے لئے بے معنی ہے ۔ تو وہ اپنا انداز بدل سکتی ہے ۔ اور اپنے مجازی خدا کے سامنے نئے انداز سے اپنی محبت کا اظہار کر سکتی ہے ۔" رضی نے سعدیہ کا ہاتھ پیار سے دباتے ہوئے کہا ۔

"اوہو کیا کہئیے مجازی خدا کے ۔" سعدیہ نے ہنستے ہوئے کہا ۔

"اچھا تو یہ عزت ہے تمہارے دل میں میری ۔" رضی نے منہ بناتے ہوئے کہا

"تم تو میری نس نس میں سمائے ہوئے ہو ۔" سعدیہ نے پیار سے مناتے

ہوئے کہا ۔

اور رضوان کو ایسا محسوس ہوا ۔ کہ اس کے چاروں طرف بہاریں رقصاں ہیں ۔ خوشی و مسرت کی شہنائیاں گونج رہی ہیں ۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کا خوش نصیب ترین انسان سمجھ رہا تھا ۔ کہ اتنے میں منّا جاگ اٹھا ۔ ۔ ۔ ۔ سعدی نے منّا اس کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا ۔

" رضی تم اپنے منّے کو بہلاؤ ۔ میں ذرا اماں کے پاس جا رہی ہوں ۔ ۔ ۔"

" اگر یہ زیادہ رویا تو ۔ ۔ ۔ "

" چپ کرا لیجئے گا نا ۔ آخر تو آپ بھی اس کے ابو ہیں ۔ ۔ ۔" سعدی مسکراتی ہوئی باہر چلی گئی ۔ اور رضوان اپنی محبت کی انمول نشانی لے کر اسے اٹھ کر بہلانے لگا ۔

سعدیہ نے جیسے ہی اپنے گھر میں قدم رکھا۔ . . چاروں طرف سے اس کی پہاڑی سہیلیوں نے اسے گھیر لیا۔ مبارک سلامت کی شور پڑی۔ آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ . . دیکھتے ہی دیکھتے منّے کے گرد روپوں کے ڈھیر لگ گئے . . . . سعدیہ سوچنے لگی۔ کہ اگرچہ غریب ہیں۔ مگر دل کے غنی ہیں۔ اور یہ کتنی وسعت و خلوص سے مل رہے ہیں۔ جیسے انہیں بے پایاں خوشی ہوئی ہو . . .

ابھی سعدیہ انہی سوچوں میں غرق تھی۔ کہ باہر سے باجوں گاجوں کی آوازیں سنائی دینے لگی۔ معلوم ہوا۔ کہ اس پہاڑی علاقے کے رہنے والے مقامی لوگ اس خوشی میں اپنا ڈھول اور اپنی لغتیں لئے جہاں ان کے دل کی خوشی ہو پہنچ جاتے ہیں۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ افسر جنگلات کے ہاں خدا نے سات برس کے بعد بیٹا دیا ہے اور وہ افسر ان کے ساتھ بہت اچھا ہے۔ تو اپنی خوشی کا بے پایاں اظہار کرنے آ گئے ایک مخصوص انداز میں ڈھول بجنے لگا۔ بچے باہر کی طرف دوڑے۔ اور

عورتیں دروازوں، کھڑکیوں میں سے جھانکنے لگیں۔۔۔"

"لختئی کا ناچ ہو رہا ہے"۔ منّے کی امی نے سعدیہ کو بتلایا۔۔۔"

"لختئی کا کیا مطلب ہے۔؟ سعدیہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"باجی یہ ایک لڑکے نما لڑکی کا ڈانس ہوتا ہے جسے زنانہ لباس پہنایا جاتا ہے۔ اس کے پٹے نما بال اس کے کندھوں پر پڑے ہوتے ہیں۔ ڈھول کے انداز پر یہ اپنے پٹوں کو ایک دلفریب انداز میں جھٹکے دیتا ہے۔ کہ سارے مجمع پر ایک جوش کا سماں طاری ہو جاتا ہے"۔ گڈو کی ماں نے پوری وضاحت کر دی۔۔۔"

"دیکھئے دیکھئے کس مخصوص انداز سے وہ اپنے سر کو جھٹک رہا ہے۔۔۔"

گڈو کی ماں نے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا۔

سعدیہ نے بھی قریب ہو کر دیکھا۔۔ تو وہ بھی اس ناچ سے بہت متاثر ہوئی۔ رضوان نے ایک پچاس کا نوٹ انہیں اس خوشی کے موقع پر دے دیا اور وہ تھے کہ پھولے نہ سمارہے تھے۔ ایک ایک کر کے مجمع چھٹنے لگا۔ تو عورتیں پھر سب ایک جگہ بیٹھ گئیں۔ کوئی منّے کی شکل و صورت پر اپنی رائے کا اظہار کر رہی تھی۔ تو کوئی دادی کے تحفوں کا پوچھ رہی تھی۔ بڑی بوڑھیاں اس سے زچگی کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ کہ کتنا دیسی گھی کھایا۔؟ کتنے چوزوں کی یخنی پی۔۔۔؟ اور کس قسم کا سیٹھورا بنایا۔؟ سعدیہ ہنس ہنس کر ایک ایک کی بات کا جواب دے رہی تھی۔ کہ اتنے میں دعوت کے پیغامات شروع ہو گئے ہر کوئی ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سعدیہ

ان مخلص لوگوں کے خلوص سے حد درجہ متاثر نظر آ رہی تھی۔۔۔اس نے ہنستے ہوئے ذرا پُرجوش آواز میں کہا۔

" بھئی، پہلے تم مجھ سے تو منّے کی خوشی میں کوئی دعوت وادوت تو کھا لو۔ پھر منّا اپنا حصہ کھانے خود آپ لوگوں کے گھروں میں پہنچ جائے گا۔ "

جوان عورتوں نے کچھ گرما گرم بحث شروع کر دی۔ مگر بڑی بوڑھیاں سعدیہ کے اس پروگرام سے متفق نظر آ رہی تھیں۔ اگلے روز سعدیہ نے رضی سے مشورہ کر کے ایک شاندار ضیافت کا انتظام کیا۔ اور خوب دل کھول کر مرغیوں کا سالن، سجی، بریانی وغیرہ پکائی۔۔۔ ارد گرد سے لوگ سب جمع ہو رہے تھے۔ منّے کا کمرہ بطور خاص سجایا گیا تھا۔ منّے کو گلابی رنگ کے کپڑوں میں لپیٹا ہوا تھا۔۔۔ اس پیاری صورت پر یہ گلابی رنگ بڑا کھل رہا تھا۔۔۔ اس کے اردگرد سینکڑوں تحفوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔۔۔ خوب شاندار کھانا سعدیہ اور رضوان نے اپنے مہمانوں کو کھلایا۔ اور پھر کھانے کے بعد باہر کے کھلے لان میں انہی مقامی لوگوں نے اپنا مخصوص لختئی کا ناچ بھی دکھایا۔۔۔ عورتوں نے اب کے یہ ناچ چلمن کے پیچھے سے خوب اچھی طرح دیکھا۔۔۔ لختئی کو خوب چمک دار کپڑے پہنائے ہوئے تھے۔ خوب سفید اسرخ بھی اسے لگائی ہوئی تھی۔ ڈھول بجنے شروع ہوئے۔۔۔ لختئی نے اپنے پاؤں کے گھنگھروؤں کو ایک مخصوص انداز سے بجایا۔ اور پھر ایسا لگا۔ جیسے وہ ربڑ کی گڑیا ہے کہ جس طرف اسے لچکا دو۔ اسی طرف لچک لچک جا رہی ہے۔ جب وہ اپنے بالوں کو پرجوش

انداز میں جھلکتی ۔ تو مردوں کی طرف سے خوب نعرہ ہائے تحسین کی آوازیں آتیں ۔ اور سیٹیوں پر سیٹیاں پڑنے لگیں ۔ ڈھول والے کے ہاتھ بے تابی سے جوش سے ڈھول پر پڑتے ۔ اور رقاصہ تھرک تھرک کر ناچنے لگتی ۔ ۔ ۔ رات گئے تک یہ شور و غل کا ہنگامہ برپا رہا ۔ ۔ ۔ تب کہیں جا کر یہ پُر مسرت محفل اختتام پذیر ہوئی ۔ لوگوں کے جانے کے بعد رضی اور سعدیہ تحفے تحائف دیکھتے رہے ۔ اور اپنے مخلصوں کے خلوص کو سراہتے رہے کہ اتنی گہما گہمی شہر میں نہیں ہوئی ۔ اتنے خلوص کا مظاہرہ ان کے شہر والوں نے نہیں کیا ۔ جتنے یہاں کے سیدھے سادے مقامی لوگوں یا اہل کاروں نے کیا ۔ ۔ ۔ منا تھک کر سو چکا تھا ۔ ۔ ۔ ایک گود سے دوسرے کی گود میں جاتا جاتا وہ کئی بار سویا ۔ ۔ ۔ اور کئی بار جاگا ۔ ۔ ۔ مگر اس وقت وہ ایک میٹھی مسکراہٹ لئے سو رہا تھا ۔ ۔ ماں باپ دیوانوں کی طرح بیک وقت اسے تک رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ دونوں کے دلوں میں ایک تڑپتا ہوا بیکراں سمندر موجزن تھا ۔ وہ اس کی بے قرار لہروں پر ابھرتے ڈوبتے رہے ۔ ۔ ۔ ۔ کہ اتنے میں رضی اٹھا ۔ اپنے کوٹ کی اندر کی جیب سے ایک سونے کا تعویز نکال لایا اور سعدیہ کو دکھانے لگا ۔

”یہ کیا ہے رضی —؟“ سعدیہ نے وہ تعویز ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا ۔ ۔

”یہ یہاں کے پیر صاحب نے اپنا تحفہ نادر بھجوایا ہے کہ بچے کے گلے میں یہ تعویز پہنا دیجئے ۔ خدا اسے ہر قسم کی نظر بد سے بچائے گا ۔“ رضوان نے سعدیہ کے کندھوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ پھر بزرگوں کا دیا ہوا تحفہ ہے۔ ضرور پہنائیے"
سعدیہ نے وہ تعویذ رضوان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

رضوان نے وہ تعویذ آہستہ سے لیا۔ گلے میں پہننے والی کالی دوڑی کو بغور دیکھا۔ اور پھر سوتے ہوئے بیٹے کے گلے میں پہنانے لگا۔۔ یک لخت منا جاگ اٹھا۔۔۔ اور تعویذ زمین پر گر گیا۔ رضوان کے ہاتھ کانپ اٹھے۔ دل میں طرح طرح کے وسوسوں نے جنم لیا۔ اور وہاں سعدیہ کی رنگت ایک دم زرد پڑ گئی۔ رضوان نے ہمت سے کام لیتے ہوئے جلدی سے زمین سے تعویذ اٹھایا۔۔ اور کہنے لگے۔۔۔۔۔۔

"بھئی تمہارا لڑکا پہلوان بنتا جا رہا ہے۔ اب تو اپنے باپ سے بھی کشتی کرنے لگا ہے۔" جلدی سے وہ تعویذ منے کے گلے میں پہنا دیا۔ کہ اچانک بجلی کا فیوز اڑ گیا۔ اور پوری کوٹھی میں اندھیرا چھا گیا۔ سعدیہ نے ایک ہلکی سی چیخ ماری۔ اور جلدی سے اپنے عمران کو سینے سے لگا لیا۔ اور سسکنے لگی۔!

"سعدیہ ہوش میں آؤ۔ کیوں بدشگونی کر رہی ہو۔" رضوان نے اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔۔۔ اور آخری جملے میں اپنے شکوک کا بھی اظہار کر دیا۔۔۔

"رضی خدا کے لئے یہ کیسا تعویذ ہے۔ اسے میرے عمران کے گلے سے اتار لیجئے۔" سعدیہ نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

"پاگل نہ بنو۔ توہمات کو دل میں جگہ نہ دو۔ مسلمان کا ایمان قرآن ہے اور اس میں قرآنی آیات درج ہیں۔۔" رضوان نے اس کے سر کو تھپکتے ہوئے کہا۔۔۔۔

"میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔" سعدیہ نے عمران کو اپنے سینے سے بھینچتے ہوئے کہا۔

"ٹھہرو میں لیمپ جلاتا ہوں" کہہ کر جلدی سے رضوان مسہری سے اٹھا۔ کوٹ کی جیب سے ماچس نکالی اور ٹیبل پر پڑے ہوئے لیمپ کا شیشہ اتار کر جلدی سے ماچس جلائی۔ اور لیمپ روشن کر دیا۔۔ پھر شیشہ لگا دیا۔ کمرے میں ملگجی روشنی پھیل گئی۔ رضوان نے کمرے کا دروازہ بند کیا۔ پھر پردے برابر کیئے۔ اس وقت یہ اپنے شب خوابی کے کمرے میں موجود تھے۔۔ جہاں دو مسہریاں جن پر نیلے رنگ کے بیڈ کور بچھے ہوئے تھے۔۔۔ ان پر سفید رنگ کے تکیئے جن پر نیلے ساٹن کی پائپنگ لگی ہوئی تھی۔ صاف ستھرے سعدیہ کے ذوق کو سراہ رہے تھے۔۔۔ کمرے کا رنگ بھی ہلکا نیلا تھا۔۔۔ اور دروازوں کھڑکیوں پر لٹکے ہوئے ریشمی پردوں کا رنگ بھی نیلا ہی تھا۔ جو صاحب خانہ کے ذوق کا اظہار کر رہا تھا۔۔۔ کمرے کے مشرقی کونے میں ایک خوبصورت سا سفید رنگ کا جھولا پڑا ہوا تھا۔۔۔ جس میں ننھے عمران کا بستر لگا ہوا تھا۔ مسہری کے قریب ایک چھوٹی میز رکھی ہوئی تھی۔ جس پر ایک خوبصورت نیلے شنیل کے غلاف میں ایک ٹرانسسٹر رکھا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی لیمپ

رکھا ہوا تھا۔ پہاڑی علاقوں میں عموماً بجلی کا انتظام درہم برہم ہوتا ہے ــــ اس لئے سعدیہ اپنی پوری توجہ لیمپ کی صفائی اور تیل وغیرہ پہ دیتی رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی بجلی خراب ہوئی جھٹ سے لیمپ جلا لیا گیا) ایک دوسری میز پر شیشے کی صراحی میں پانی رکھا ہوا تھا۔ اور صراحی کے اوپر ایک ہلکا سا پیازی رنگ کا خوبصورت بلوریں گلاس الٹا ہوا تھا۔ . . منے کی اٹیچی اور باسکٹ جس میں اس کی ضرورت کی اشیاء تھیں۔ ایک شیشے کی الماری کے پاس ہی رکھی ہوئی تھیں۔ . . کارنس پر سعدیہ ۔ اور رضوان کی الگ الگ تصویریں دونوں کونوں میں رکھی . . . . ہوئی تھیں . . . جب بھی رضوان کو شرارت سوجھتی۔ دونوں کو ٹیڑھا ترچھا کر دیتا۔ یا پھر اپنے سامنے رکھ دیتا . . . سعدیہ کے یک لخت بدلتے ہوئے رنگ کو رضوان محسوس کر چکا تھا . . . وہ لیمپ جلا کر دوبارہ سعدیہ کے قریب بیٹھ گیا۔ کہ اس کی نگاہ کارنس پر رکھی ہوئی تصاویر کی طرف اٹھ گئیں۔ اس نے اس ملگجی روشنی میں سعدیہ کے بالوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کا خوف دور کرتے ہوئے بات بدلاتے ہوئے کہا ــــ

"سعدیہ ان دو تصویروں کے درمیان بھی ایک تصویر آنی چاہیئے ۔ بھلا بوجھو تو وہ کس کی تصویر ہونی چاہیئے . . "

"میرے عمران کی ــ!" سعدیہ نے قدرے میٹھی مسکراہٹ سے اپنی گود میں سوئے ہوئے عمران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ارے تم تو دلوں کی بات بوجھنے لگی ہو۔ کہیں اولیا تو نہیں بنتی جا

رہی ہو۔" رضوان نے اسے بہلاتے ہوئے کہا۔

"مذاق چھوڑو رضی۔۔۔!" سعدیہ نے آہستگی سے کہا۔

"کل جاوید صاحب کو بلوالوں گا کہ وہ گھر پر آ کر عمران کی تصویریں کھینچ لیں۔" رضوان نے منے کے گال پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"جاوید صاحب کی کھینچی ہوئی تصاویر مجھے ذرا بھی پسند نہیں۔۔!"

"تو پھر۔۔!"

"شہر جائیں گے۔ تو وہاں کسی اچھے سے اسٹوڈیو سے اپنے عمران کی تصویر اتروائیں گے۔۔۔۔!"

"یہ ٹھیک ہے۔۔! تو پھر کب شہر جانے کا پروگرام بنا رہی ہو؟" رضی نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔

"ابھی تو شہر سے آئے ہیں۔ ذرا کچھ دن اور گزر جائیں۔ تب تک میرا منا بھی ہاتھ پاؤں مارنے لگے گا۔۔! رضی ذرا عمران کا بستر تو ٹھیک کر دو۔ میں اسے لٹا دوں۔۔!"

رضوان نے جلدی جلدی عمران کا بستر ٹھیک کیا۔ اور سعدیہ نے اسے لٹا دیا۔۔ اور اس پر سرخ شنیل کا لحاف اوڑھا دیا۔۔۔ سعدیہ نے اسے بھرپور پیار کیا۔ تو وہ اپنے آپ مسکرا رہا تھا۔۔۔ کافی دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے۔ باتوں کا تعلق زیادہ تر منے کی ذات سے تعلق رکھتا تھا۔ رضوان نے محسوس کیا۔ کہ اس وقت سعدیہ کی محبت کا محور عمران کے گرد گھوم رہا ہے

اس کی مامتا کی محبت کیسے طرح جاگ چکی ہے۔ ۔ ۔ جب تک رضوان سعدیہ کے ساتھ عمران کی باتیں کرتا رہتا۔ اس کے چہرے پر ممتا کے تقدس کا نور چھایا رہتا ۔ ۔ ۔ اور اگر وہ اس موضوع سے ہٹتا تو سعدیہ پھر سے پھیر کے اسے اسی موضوع پر لے آتی ۔ تمام مخلص لوگوں نے بھی اپنے دل کے خوب ارمان نکالے ۔ ۔ ۔ اور ننھے کو مہمان بنا کر اپنے گھر لے جاتے رہے ۔ ۔ ۔ اب عمران چھ ماہ کا ایک تندرست و توانا بچہ بن چکا تھا۔ گول مٹول سا پیارا بچہ ۔ جب وہ اپنی بڑی بڑی سی کٹورا آنکھوں کو گھما کر ماں کی طرف دیکھتا ۔ تو ماں صدقے واری ہوتی ۔ اور اپنے ابو کی آواز پر زور زور سے پاؤں مارنے لگتا ۔ ۔ ۔ تو رضوان مچل مچل اٹھتا ۔ ۔ ۔ اور کئی کئی گھنٹے اسے گود میں اٹھائے سارے گھر میں بھاگا پھرتا ۔ ۔ ۔ اور ننھا عمران ہمک ہمک کر اپنی مسرت کا اظہار کرتا ۔ ۔ ۔

دن گذرتے رہے ۔ خوشی و مسرت میں لمحات گذرتے پتہ بھی نہیں چلتا ۔ اسی طرح ایک دن رضوان دورے پہ جا رہا تھا ۔ ۔ ۔ سعدیہ اسے صبح سے تیار کر رہی تھی ۔ ناشتہ دونوں نے مل کر کیا ۔ سعدیہ نے سارا سامان اس کا اپنے ہاتھوں سے باندھا ۔ ۔ ۔ چلتے ہوئے رضوان نے ننھے عمران کو گود میں اٹھاتے ہوئے کہا ۔

" دوست ! ہم جلد ہی آجائیں گے ۔ ہماری سعدی کو اداس نہ رہنے دینا ۔ دیکھو اگر یہ ذرا بھی اداس ہوئیں ۔ تو پھر تمہاری پٹائی ہو جائے گی ۔ ۔ ۔ "

رضوان نے اداس سعدیہ کو کن اکھیوں سے دیکھا . . . اور سعدیہ نے ایک سرد آہ بھر کے سر جھکا دیا . . . اور منّے کو جھولے میں لٹا دیا۔

"سعدی کیا بات ہے ۔ ؟"

"کچھ بھی تو نہیں ۔"

"کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے . . . جانِ رضی . . . ."

"یونہی دل کچھ اداس سا ہے"

"وجہ ۔ !"

"معلوم نہیں ۔ ۔ !"

"اگر کہتی ہو تو میں نہیں جاتا . . ."۔ رضوان نے اس کی اداس آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں . . . آپ ضرور جائیے ۔"

"ایک شرط پر جاؤں گا ۔ !"

"کیا ۔ ؟" سعدیہ نے بے ساختہ کہا۔

"مجھے بھرپور محبت دے کر رخصت کرو ۔ !"

"میری محبت تو سائے کی طرح آپ کے ساتھ رہتی ہے"۔ ۔ سعدیہ نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

تو پھر مخمور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے رخصت کرو . . . اگر ذرا بھی آنسوؤں کی نمی میں نے محسوس کی ۔ تو میرا جانا ملتوی . . ."۔ رضی نے اس

کے شانوں کو اونچا کرتے ہوئے کہا۔۔۔

باہر جیپ کا ہارن بج رہا تھا۔۔۔۔ سعدیہ کو اپنے فرض کا احساس ہوا۔۔۔ اور قدرے مسکراتے ہوئے بولی۔۔۔۔

"اچھا رضی خدا حافظ۔ جلدی آنے کی کوشش کرنا۔۔۔۔ ٹھہرو۔ اپنے منّے کو تو پیار کر لو۔۔۔" وہ تیز تیز قدموں سے جھولے کی طرف بڑھی اور بیتابی سے سویا ہوا منّا اٹھا کر رضوان کے پھیلے ہوئے بازوؤں میں دے دیا۔۔۔ یکبارگی رضوان نے اسے اپنے چوڑے باوقار سینے سے بھینچ لیا۔ اور منّے نے آنکھیں کھول دیں۔۔۔ رضوان نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

"دوست اداس مت ہو جانا۔ تمہارے ابو بہت جلد آنے کی کوشش کریں گے۔۔۔۔۔"

منّا مسکرانے لگا۔۔۔ اور سعدیہ کے چہرے پر پھیلی ہوئی اُداسی اپنے آپ غائب ہو گئی۔۔۔۔۔ رضوان نے سعدیہ کے ہاتھ کو دبا کر خدا حافظ کہا۔ اور تیز تیز قدموں سے گھر سے نکل گیا۔۔۔

سعدیہ جب سے اپنے گھر آئی تھی۔ کچھ ہنگامہ اتنا رہا۔ کہ وہ اپنی من پسند صفائی نہ کر سکی۔۔۔ رضوان کے جاتے ہی اس نے منّے کو دودھ پلایا۔ نہلا دھلا کر گلابی کپڑے پہنائے، اونی ٹوپی اوڑھا اسے باہر دھوپ میں جھولے میں لٹا دیا۔۔۔۔ سر کی طرف کچھ سایہ کر دیا۔ اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ ایک ایک کمرے کے قالین دربان تک اس نے نکلوائیں، جھڑوائیں، اور

خوب اچھی طرح صفائی کی۔ اور نئی ترتیب سے کمروں کو سجایا۔۔۔ دو ایک دفعہ درمیان میں بیٹے کو دیکھ آتی رہی۔۔۔ اسے گہری نیند میں سویا پاکر مطمئن ہو کر پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو جاتی۔۔۔۔ ابھی مشکل اس نے کمروں کی صفائی مکمل کی تھی۔ کہ اچانک وحشت زدہ رونے پیٹنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔۔ سعدیہ نے صحن میں آکر آوازوں کو سنا۔ تو وہ گڈو کے گھر سے آ رہی تھیں۔۔۔ نسرین گڈو کی ماں دلدوز چیخوں سے رو رہی تھی۔ سعدیہ کا دل دھڑک اٹھا۔ جلدی سے شنیل کی چادر اوڑھ ان کے گھر میں داخل ہو گئی۔۔ دیکھا تو نسرین گڈو کی لاش پر بے تحاشہ رو رہی ہے۔ اور دلدوز چیخوں سے اسے پکار رہی ہے۔۔ اس کا دل بھی تڑپ اٹھا۔ ابھی کل تک تو بچہ اچھا خاصہ تھا۔۔ اسے یکایک کیا ہو گیا اور یہ سن کر۔۔۔ کہ ماں اسے چائے پلا رہی تھی۔ اور وہ اسے پھنس گئی۔۔ بچہ نیلا پیلا ہونے لگا۔۔۔ باپ ڈاکٹر لینے کے لئے شہر کی طرف دوڑا۔ تب تک بچہ ختم ہو گیا۔ بھری گود منٹوں میں خالی ہو گئی۔۔ ممتا کی تڑپ نے سعدیہ کا جگر بھی پھاڑ دیا۔۔۔ اور وہ بے قرار ہو کر رونے لگی معصوم سا پھول۔۔ ایک دکھ بھری مسکراہٹ لئے میٹھی نیند سو رہا تھا۔۔۔ غسل سے پہلے ماں نے اسے اپنے سینے سے لگایا۔۔۔ اور تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔ سعدیہ کی آنکھیں ساون بھادوں برسا رہی تھیں۔ صبح سے ہی اس کا دل پریشان تھا۔۔۔ کہ اچانک اسے اپنے عمران کا خیال آیا۔ کہ اس کے کھوے پر دھوپ بہت آگئی ہو گی۔ اور شاید وہ جاگ کر رو تا نہ ہو۔۔۔

افراتفری میں آتے ہوئے وہ تو گھر بھی کھلا چھوڑ آئی تھی۔ اور کسی چپڑاسی تک کو وہاں چھوڑ کر نہ آئی ...... کچھ مبہم سے خیالات نے اس کے ذہن کو جکڑنا شروع کر دیا...... اور وہ الٹے قدموں اپنے گھر کی طرف بھاگی ... بنگلے کا گیٹ کھلا ہوا تھا...... وہ باغیچے کے عقب سے ہوتی ہوئی صحن میں آئی...... جھولے پر خاصی دھوپ آچکی تھی...... جمعدار صفائی کر کے جا چکا تھا...... کمرے اس نے جیسے بند کئے تھے ویسے ہی بند تھے...... باورچی خانے کا دروازہ بھی بھڑا ہوا تھا۔ اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ چپڑاسی ابھی تک سودا لانے کے لئے نہیں آیا تھا...... سعدیہ بے قراری سے جھولے کی طرف بڑھی... اور دونوں ہاتھ بڑھا کر عمران کو اٹھانا چاہا۔ مگر وہاں تو عمران نہیں تھا...... اس نے بے تابی سے جھولے کے ارد گرد دیکھنا چاہا۔ کہ کہیں "پہلوان بچہ" نیچے تو نہیں گر گیا۔ مگر یہ اس کا خیال خام تھا۔ عمی...... میرے لال کہاں ہو ۔۔۔؟ وہ تڑپ کر کمرے کی طرف بڑھی۔ دروازہ پوری طاقت سے کھول کر وہ ایک ایک کمرے میں گئی... مگر عمران کمروں میں ہوتا تو ملتا...... وہ دیوانوں کی طرح ایک ایک گوشہ دیکھ چکی پسینے پسینے ہو چکی تھی...... آنکھوں میں وحشت اور ویرانی کے سائے لہرا رہے تھے...... کہ اسے خیال آیا... کہ بابا رحمت سودا لانے کے لئے آئے ہوں گے۔ عمران جاگ کر روتا ہوگا تو اسے بہلانے کے لئے باہر لے گئے ہوں گے...... اس نے اپنے دل کے وسوسوں کو بہلاتے ہوئے کہا۔ خود کو بہلا کر بھی سکون نہ ملا۔ کہ عمران بھوک سے روتا ہوگا۔ کوٹھی کے گیٹ

پر آکر رحمت بابا کو آوازیں دینے لگیں۔ وہ سعدیہ جس کی آواز کبھی کسی غیر محرم نے نہیں سنی تھی۔ آج ایک عجیب درد سے رحمت بابا کو پکارے چلی جا رہی تھی کہ اتنے میں رضوان کا کلرک سعید کا وہاں سے گذر ہوا۔۔ سعدیہ کے بے طرح چلانے سے پہلے تو وہ ٹھٹھکا رکا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر قدم آگے بڑھا دیئے۔۔۔ سعدیہ نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ فوراً کہا۔

"ذرا سنیئے ۔۔!"

"جی ۔۔!" کہہ کر سعید کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔۔

"مہربانی ہو گی۔ اگر آپ رحمت بابا کو بھجوا دیں۔ عمران رو رہا ہو گا۔۔۔ انہیں کہیئے کہ عمران کو لے آئیں۔" سعدیہ نے ایک دم اپنا مدعا بیان کر دیا۔۔

"بہتر بیگم صاحبہ ۔۔" میں ابھی تک بابا کو بھجوائے دیتا ہوں۔۔۔

سعید نے سر جھکاتے جھکائے جواب دیا۔۔ اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔۔ سعدیہ کی بے تابی بڑھ رہی تھی۔۔۔ کبھی ہاتھ ملتی۔۔ کبھی ٹہلتی۔۔۔ اور کبھی کسی آہٹ کو پا کر کھڑی ہو جاتی۔ مگر وہاں تو ہوا بھی اس سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔۔۔ پتوں کے کھڑکنے سے ہر آہٹ کا گمان ہونے لگتا۔ کافی دیر گذر گئی۔ کہ اتنے میں صحن کے دروازے پر دستک ہوئی۔۔ سعدیہ گیٹ چھوڑ کر باغیچے سے ہوتی ہوئی ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر صحن کی طرف نکل آئی۔۔۔ اس نے دروازہ کھولا تو شاہ بانو خوش مزاجی سے گھر آتی تھی۔۔۔

"بی بی جی سلام ۔۔۔" اس نے اپنی کھلی آستینوں والا ہاتھ ماتھے پر رکھتے ہوئے کہا۔۔۔

شاہ بانو برتن پھر دھونے لگی۔ "میں جھاڑو تو دے چکی ہوں۔۔۔ تم ذرا باہر جا کر رحمت بابا کو تو دیکھو۔ میں تو ان سے کہتا کہ قربان کو بے کہہ آجائیں۔" سعدیہ نے ایک ہی سانس میں برتن دھونے والی پہاڑی لڑکی کو اور کام دے دیا۔۔

"اچھا بی بی میں جاتی ہوں ۔۔۔" کہہ کر شاہ بانو نے اپنا سرخ پھولدار ویل کا دوپٹہ سر پر اچھی طرح اوڑھا اور الٹے قدموں لوٹ گئی۔۔۔ شاہ بانو کافی عرصے سے سعدیہ کے گھر کا کام کرنے آیا کرتی تھی۔۔۔ سعدیہ برتن کے علاوہ اور بھی چھوٹا چھوٹا کام بغیر کہے کر دیا کرتی تھی۔۔۔ سعدیہ بھی اس کا ہر طرح سے خیال رکھا کرتی تھی۔۔۔ بیس روپے کے علاوہ روٹی کپڑا بھی اسے دے دیا کرتی تھی۔ ابھی منے کی پیدائش پر شاہ بانو کی فرمائش کے مطابق سرخ پھولدار ویل کی اوڑھنی۔۔۔ اور سرخ ہی رنگ کا ساٹن کا سوٹ بنا کر دیا تھا۔۔۔ شاہ بانو کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی۔۔۔ سو اس کا کہنا کہ بی بی مجھے سرخ رنگ بہت اچھا لگتا ہے۔۔۔ اور گل خان کو تو بہت اچھا لگتا ہے۔ کہ وہ مجھے ۔۔۔ کہتے کہتے شرما جایا کرتی۔۔۔ اور سعدیہ ہنس کر اسے چھیڑتی۔۔۔

"کیوں بے چارے گل خان کا دل تڑپایا کرتی ہو۔ شاہ بانو سرخ رنگ پہن کر۔!"

"اوہ بی بی۔۔۔ وہ بہت اچھا ہے۔۔۔ ہم اسے کبھی نہ

تڑپاؤں۔۔۔" وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدتے ہوئے کہتی تو سعدیہ کو اس پر بہت پیار آتا۔ وہ سوچتی۔ جتنا پہاڑی علاقوں میں قدرت نے اپنا بے پایاں حسن پھیلا رکھا ہے۔ ان سے تھپر تو تھپر۔ انسان بھی تشنگی نہیں بھولی بھالی صورتوں کے دل بھی کتنے صاف اور پاکیزہ ہوتے ہیں۔ سعدیہ کے سوچ کے دھارے اس آواز پر یک لخت رک کر رہ گئے۔ جب اس نے سنا۔ "کہ رحمت بابا۔ تو قبرستان گئے ہوئے ہیں" شاہ بانو نے سعدیہ کو بغور دیکھتے ہوئے پھر پوچھا۔۔۔

"بی بی آپ بہت فکرمند نظر آرہی ہیں۔؟"

"شاہ بانو۔ رحمت بابا عمران کو لے گئے ہیں۔ اس کے دودھ کا وقت بھی گذر گیا ہے۔ روتا ہوگا۔۔۔ خود تو وہ قبرستان چلے گئے۔ جانے عمران کو کہاں اور کس کے پاس چھوڑ گئے ہیں۔؟" سعدیہ نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔۔

"اگر آپ کہیں۔ تو میں رحمت کے کوارٹر سے جا کر پتہ لے آؤں"۔

"شاہ بانو ایسا ہی کرلو"! سعدیہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔۔۔

"ننھا عمران وہاں ہو۔ تو لیتی آؤں۔"!

"ہاں شاہ بانو ضرور۔"!

شاہ بانو چلی گئی۔۔۔ تو یک بارگی نسرین کی دلدوز چیخیں پھر سنائی دیں۔ سعدیہ نے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔۔۔ تو معصوم گڈو کا جنازہ جارہا تھا بدنصیب باپ نے اپنے ہاتھوں پر اٹھا رکھا تھا۔۔۔ شدت غم سے اس کا

چہرہ سیاہ پڑ رہا تھا ... سعدیہ کا ایک ایک رونگٹا کھڑا ہو گیا ... ایک دم ایک بُرا سا خیال اس کے دل میں آیا ... اور وہ اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے بولی۔

"خدایا کبھی کسی ماں کی گود خالی نہ کرنا۔" اپنا دھیان ہٹانے کے لیئے وہ ننھے عمران کا جھولا اور بستر ٹھیک کرنے لگی ... اس کا دودھ بنایا ... بوتل میں ڈالا ... اور بوتل کو تولیہ سے لپیٹ کر رکھ دیا ... شاہ بانو کے قدموں کی آہٹ سنائی دی ... تو سعدیہ بھاگ کر دروازے کے قریب گئی ...

"لاؤ شاہ بانو میرے عمران کو۔" اور اس نے بے دھیانی میں اپنے ہاتھ پھیلا دیئے۔

"بی بی! رحمت کی بی بی تو کہتی ہے کہ صبح سے رحمت بابو صاحب کے گھر نہیں گیا ... گڈو کے کفن دفن میں لگا ہوا ہے ...! شاہ بانو کی آواز میں بھی ہلکا سا خوف لرزیدہ تھا۔!

"کیا کہا۔ رحمت کے گھر بھی میرا منا نہیں ..." اور سعدیہ کا سر ایک طرف ڈھلک گیا ... شاہ بانو کے شور مچانے سے میت والے گھر کی عورتیں بھاگ کر ادھر آنے لگیں ... سعدیہ کو بے ہوش پا کر اسے ہوش میں لانے لگیں ... اور وہاں چاروں طرف منّے کی ڈھونڈ بھال شروع ہو گئی ... چاروں طرف تلاش شروع ہو گئی۔ مگر بے سود ...

دوپہر سے سہ پہر ہوئی۔ اور سہ پہر سے شام ہو گئی۔ مگر سعدیہ کو ہوش نہ آیا ... ڈاکٹر کو بلوایا گیا۔ ڈاکٹر نے اپنی ہر ممکن کوشش کر دیکھی ... کہ

اچانک اسے خیال آیا۔۔۔ بچے کے استعمال شدہ کپڑے جو جھولے میں رکھے ہوئے تھے۔ اس کی ناک کے قریب رکھ دیئے۔ سعدیہ نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں۔ میرا عمران میرا ننھا کہاں ہے۔۔۔ اس نے ایک لمبی آہ بھرتے ہوئے کہا۔۔۔

"ہوش میں آؤ۔ وہ جھولے میں سو رہا ہے۔۔۔" کلرک سعید کی ماں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔۔

"اماں صرف اس کی ایک جھلک دکھا دو۔" سعدیہ نے سسکتے ہوئے کہا۔

سب عورتیں دم بخود بیٹھی تھیں۔ کہ آخر بچہ گیا کہاں۔ ؟ کیا اسے زمین نگل گئی ؟ یا آسمان کھا گیا۔۔۔ اپنے علاقے کا چپہ چپہ چھان مارا تھا۔ مگر بچے کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔۔۔ سعدیہ ان جھوٹی تسلیوں کو سمجھ چکی تھی۔ ایک دم اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔۔۔۔ وہ اس طرح بلک بلک کر روئی۔ کہ ساری عورتیں بھی رو پڑیں۔۔۔ گڈو کی ماں کا زخم تازہ تھا۔ بری طرح رسنے لگا۔ وہ اپنے گڈو کو یاد کر کے رونے لگی۔ اور وہ اپنے عمران کو۔۔!!

دفتر والوں نے ایک دم رضوان کو میسج بھجوایا۔ کہ وہ فوراً پہنچے۔" اور رات کسی بیوہ کے مقدر کی طرح تاریک ہو چکی تھی۔ سرد ہواؤں کے کراہنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ جیسے وہ بھی سعدیہ کی بدنصیبی

عاطفہ

پر سسکیاں بھر رہی تھی ۔ ۔ ۔ ایک ہولناک سناٹا چھایا ہوا تھا ۔ ۔ ۔ سعدیہ اپنے عمران کے کپڑوں کو چوم رہی تھی ۔ ۔ ۔ اس کی پنسل کو چوم کر آنکھوں سے لگا رہی تھی اور پھر اس طرح زور سے تڑپ تڑپ کر روتی ۔ ۔ ۔ کہ ساری عورتیں اس کے رونے میں شامل ہو جاتیں ۔۔! اتنے میں ہارن کی آواز سنائی دی ۔ ۔ ۔ سعدیہ ننگے پاؤں اور ننگے سر بھاگتی ہوئی باہر نکلی ۔ ۔ ۔ رضوان گھبرائے ہوئے اندر داخل ہوئے ۔ ۔ ۔

"رضی میرا عمران تم تو نہیں لے گئے ۔؟" سعدیہ نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا ۔

"کیا ہوا میرے عمران کو ۔؟" رضوان نے گھبیر لہجہ میں کہا ۔

"میرا لال میرا بچہ لا دو رضی ۔ ۔ ۔!" کہہ کر سعدیہ پھر سے بے ہوش ہو گئی اگر رضوان اسے تھام نہ لیتا ۔ تو اسے سر کی شدید ضربات آتیں ۔

رضوان کا سر بُری طرح چکرا اٹھا ۔ ۔ ۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ سعدیہ کو سنبھالے ۔ ۔ ۔ یا ان پہاڑی علاقے کے ایک ایک پتھر کو ہٹا کر ان سے اپنے لال کا پوچھے ۔ ۔ ۔ جو وادی کی حفاظت کے لئے تو فصیل کا کام دیتے ہیں ۔ مگر اس کے گھر کے لئے یہ فصیل کمزور پڑ گئی ۔ سعدیہ کی محبت جیت گئی ۔ اور وہ اسے ہوش میں لانے کے لئے ہر ممکن تدابیر کرنے لگا ۔ ۔ ۔ خدا خدا کر کے وہ ہوش میں آئی ۔ ۔ ۔ ۔ تو رضوان اسے عورتوں کے پاس چھوڑ کر اسی بے سروسامانی کی حالت میں باہر نکلا ۔ ۔ ۔ ایک ایک گلی ۔ ایک ایک

موڑ۔۔۔۔۔ایک ایک باغ، ایک ایک گوشہ چھان مارا۔۔۔۔۔وادی کی حدود سے نکل کر بھی ایک ایک ذرے میں عمران کو پکارا۔۔۔۔مگر عمران کہاں؟ وہ ہوتا ۔ تو اپنی پیاری آواز ہمک ہمک کر اپنے ابو کے ویران دل کو تسلی ۔ اور اپنی بد نصیب ماں کے تڑپے دل کو سکون دیتا۔۔۔۔رات کے تین بجے تک رضوان بذاتِ خود تلاش کرتا رہا۔۔۔۔اور جب تھک ہار کر لٹے ہوئے جواری کی طرح وہ واپس گھر آیا۔۔۔۔تو سعدیہ کے سوالوں کے جواب کیا دیتا۔۔۔۔وہ المناک انداز۔اور تڑپتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"رضی میرا عمران کہاں ہے ۔؟ مجھ سے ناراض تو نہیں ہو گیا۔؟ کیا اسے دودھ وقت پہ پلایا گیا تھا۔؟ تمہیں دیکھ کر خوشی سے پاؤں تو مارے ہوں گے ۔؟ کیا ماں کو یاد تو نہیں کرتا۔۔۔۔رضی میری گود خالی ہے ۔؟ میرا عمران لا دو۔ رضی میرے سینے میں آگ جل رہی ہے۔۔۔۔خدا کے لئے میرے بچے کی معصوم صورت کی ایک جھلک دکھا دو۔یہ بھڑکتی ہوئی آگ ایک دم بجھ جائے گی۔۔۔"۔ سعدیہ زار و قطار رو رہی تھی۔اور رضوان اس کا سر اپنے سینے سے لگائے۔ انگلیوں کے پوروں سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے گھمبیر آواز میں کہہ رہا تھا۔۔۔۔

"سعدی خدا کے لئے آنسو مت بہاؤ۔۔۔۔میں نے تو سات برسوں میں کبھی تمہیں رونے نہیں دیا۔۔۔۔یہ کیسی قیامت ٹوٹ پڑی۔۔۔۔خدا کے لئے مجھے کچھ تو بتاؤ کہ یہ سب کچھ ایسے ہو گیا۔!"

عاطفہ

اور سعدیہ نے اس کے سینے سے سر لگائے لگائے ہچکیوں آنسوؤں اور ٹھنڈی سانسوں کے دوران سارا واقعہ کہہ سنایا۔ رضوان بغور سنتا رہا۔ کہنے لگا۔۔۔۔۔

"سعدی یہ سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کام کیا گیا ہے۔ بچوں کو اغوا کرنے والا گروہ ہر شہر اور ہر قصبے میں موجود ہوتا ہے۔۔۔۔ کبھی تم نے کوئی مشکوک عورت تو اپنے ہاں آتی نہیں دیکھی۔۔؟"

"مشکوک عورت۔" سعدیہ نے زیر لب دوہرایا۔۔۔

"ہاں کوئی ایسی عورت جو کبھی تم نے پہلے نہ دیکھی ہو۔۔؟"

"آج کل تو خیرات مانگنے والیوں کا زور ہے۔۔۔۔ دو تین اس قسم کی عورتیں آتی رہتی تھیں۔ ایک مرتبہ میں عمران کو کپڑے پہنا رہی تھی کہ ایک فقیرنی آئی اور لگی دعائیں دینے۔ جب میں اسے تیار کر چکی۔ تو وہ آگے بڑھی اور بیساختہ اسے چومنے لگی۔۔۔۔ بار بار یہی کہتی۔ کہ ایسا پیارا بچہ اس نے زندگی بھر نہیں دیکھا۔۔۔۔ وہ میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگی۔ میں نے اسے پانچ روپے اور اپنے کپڑے بھی دیئے۔۔۔۔ پھر وہ تقریباً ہر روز آنے لگی۔ اور ایک روز اس نے یہ بھی کہا۔۔۔ کہ میں نے سنا ہے کہ یہ بچہ سات سال کے بعد آپ کے ہاں ہوا ہے۔۔۔۔ میں تو اس خوشی میں ایک کمبل مانگوں گی۔ کیونکہ سردیاں آرہی ہیں پھر میں نے اسے پرانا والا نیلا کمبل بھی دے دیا۔۔۔۔ اس کے بعد میں نے اس کی صورت نہیں دیکھی۔ شاید وہ کسی نشیبی علاقے کی طرف چلی گئی تھی

سعدیہ نے آہستہ آہستہ ایک جھوٹی لیسری یاد دوہرائی۔

"سعدی کاش تم مجھے یہ واقعہ پہلے سنا دیتیں ۔۔۔۔ یہ کم بخت بدنصیب گروہ مختلف ذرائع سے بچوں کو اغوا کرتے ہیں ۔۔۔۔ ماؤں کی گود خالی کرنا ۔۔۔ اور باپوں کی لاٹھیوں کو چھیننا ان بیرحم انسانوں کا کاروبار ہے ۔۔۔ ماں ساری زندگی تڑپتی رہے گی ۔ ماں کی نگاہوں کا نور ختم ہو جائے گا ۔ مگر یہ انسانیت سوز فعل کبھی بھی ختم نہیں ہونے لگا ۔۔۔ ان کا کاروبار شمال سے جنوب تک پھیلا ہوا ہے ۔۔۔ اغوا کا زیادہ کام یہ عورتوں سے ہی لیتے ہیں ۔ جو مختلف ذرائع سے گھروں تک پہنچتی ہیں ۔ میں پولیس میں رپورٹ درج کرا چکا ہوں ۔۔۔ اس حلیے کی عورت کا پتہ بھی درج کروا دوں گا"

"نہیں رضی ۔ ہو سکتا ہے ۔ وہ عورت بے قصور ہو ۔۔۔" سعدی نے دھیرے سے کہا ۔

"یہی تو عورتوں کی مدھم دلی ۔۔ انہیں برباد کرتی ہے ۔۔۔ ہو سکتا ہے وہی عورت اغوا کنندگان کی کارندہ ہو ۔"

"رضی ۔۔۔ آج ماں کو نہ پا کر عمران تڑپتا ہوگا ۔۔۔" سعدیہ کے دل میں ایک بار پھر غم کی ٹیسیں ابھرنے لگیں ۔۔۔

رضوان نے لائٹر جلایا ۔ اور ایک سگریٹ سلگائی ۔۔۔ دھیرے دھیرے وہ سگریٹ پینے لگا ۔ تو آنکھوں میں غم کے دیئے سرخ لو دینے لگے ۔۔۔

وہ رضی آج میں سارا دن اس کے لئے دودھ کی بوتلیں بناتی ۔۔۔ اور

گھراتی رہی۔ مگر میرا عمران ....“

سعدی خدا کے لئے چپ ہو جاؤ۔ نہیں تو میرا دل شدتِ غم سے پھٹ پڑے گا... میں پاگل ہو جاؤں گا۔۔ میں پاگل ہو جاؤں گا...!“ رضوان کے ہاتھوں سے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔ اور وہ تڑپ تڑپ کر رو دیا۔ رضوان کو روتا دیکھ کر سعدیہ کا پیمانہ غم جو پہلے ہی سے بھرا ہوا تھا۔ چھلک اٹھا۔ رسیلے ہونٹ تھرتھراتے رہے۔ کانپتی پلکوں تلے سے آنسوؤں کا فوارہ بہہ نکلا۔ ماں باپ کی بے قراریوں نے فضاؤں کے سینے بھی شق کر دیئے۔ ممتا کی آہنی زنجیریں آج ظالم سماج نے توڑ کر رکھ دیں۔ وہ اس طرح تڑپ تڑپ کو عمران کو پکارنے لگی... کہ سنسان وادی بھی گونج اٹھی۔ رضوان کا جسم بے جان اور دماغ سُن ہو چکا تھا۔ اس نے سات سال کے عرصہ میں سعدی کو کبھی اتنی بے دردی سے روتے نہیں دیکھا تھا۔ جتنی بے دردی سے اب وہ رو رہی تھی۔ سعدی کے سینے سے نکلا ہوا ہر نالہ رضوان کی روح کی گہرائیوں میں نشتر چبھوتا رہا... اس کا جی چاہتا۔ !کاش وہ ظالم سامنے آجائے۔ جس نے ان دونوں کو جیتے جی بے موت مار دیا۔ تو وہ اس ظالم کو کئی بار بھڑکتی ہوئی آگ میں پھینکے۔ اور پھر نکالے۔ اور پوچھے۔ کہ سوزش اور جلن کا کچھ احساس ہوا ہے یا نہیں۔؟ مظالم کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ ایک معصوم بچے کو اس کی ماں کی گود سے جدا کر دینا۔ اور ممتا کو تڑپانا۔ سب سے بڑا گناہ ہے۔ سب سے بڑا۔!! رضوان نے دیکھا کہ سعدی کی حالت

پھر غیر ہو رہی ہے۔ سانس کی رفتار دھیمی ہو رہی ہے۔ اور جسم تھرا رہا ہے۔ اس سے بیشتر کہ وہ اس کے پاس پہنچتا۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔!! رضوان نے بھاگ کر سنبھالا... مسہری پہ لٹایا۔ اور اس پر کمبل اوڑھایا۔ اس کے پریشان بالوں کو سنوارتا ہوا بولا۔

"جان رضی۔ ہوش میں آؤ۔ عمران سے زیادہ تمہاری حالت تشویشناک ہوتی جا رہی ہے۔ وہ معصوم تو پھر کسی نہ کسی کونے میں رو دھو کر سو رہا ہوگا... اور تم دل کی سوزش بے چینی اور کرب کی آگ میں جل رہی ہو۔ اور شائد ساری زندگی جلتی رہو...."

رضوان اسے ہوش میں لانے کی ہر ممکن کوشش کرنے لگا.....

شب کی تاریکی کو نور کے اجالے نے ملگجی چادر اوڑھائی.... کہیں سے مؤذن کی اللہ اکبر کی صدائیں سنائی دینے لگیں۔ بے بس مجبور انسان کو جب ہر طرف سے نا امیدی گھیر لیتی ہے۔ تو اس اندھیری راہوں میں ایک روشنی کا مدھم سا ٹمٹماتا دیا بھی نظر آتا ہے۔۔ اور وہ اس دیئے کی روشنی میں اس حبیب کے سامنے صدق دل سے جھک جاتا ہے... جو بہت ہی غفور الرحیم ہے۔ رضوان وضو کر کے جا نماز پر کھڑا ہو گیا... شدت غم سے ایک بار سینہ پھر پھٹنے لگا۔ سینے میں تلاطم برپا ہو گیا۔ آنکھوں سے شفاف آنسو بہنے لگے اور وہ اپنے خالق حقیقی کے روبرو اس ظلم کی داستان لئے حاضر ہو گیا۔ وہ صدق دل سے گڑگڑا کر رو رہا تھا اور سعدی ہوش میں آچکی تھی۔!!

عاطقہ

سعدیہ اور رضوان کی زندگی میں غم کے بگولے۔ اور آہوں کی آندھیاں چلتی رہیں زندگی چلچلاتی دھوپ بن کر رہ گئی جس میں کہیں بھی سائے کا نام ونشان نہ تھا۔ دونوں کی زندگی لٹی ہوئی بہار اور تشنہ آرزوں کا مرقد بن کر رہ گئی تھی . . . سعدیہ نے عمران کا غم کچھ طرح اپنے دل پر لگایا کہ زندگی کی ہر خوشی سے بے نیاز ہوتی گئی۔ رضوان نے اس علاقے کا چپہ چپہ چھان مارا۔ پولیس اسٹیشن پر رپورٹ درج کروائی گئی۔ ریڈیو اسٹیشن پر اعلانات کروائے گئے۔ اخبارات میں اشتہارات دیئے گئے۔ مگر عمران تو اس طرح کھویا۔ کہ جیسے اسے زمین نگل گئی ہو۔ یا آسمان کھا گیا ہو۔ ہر طرف سے ناامید ہو کر رضوان بھی تھک ہار کر بیٹھ گیا . . . سعدیہ کی گرتی ہوئی صحت۔ اور دماغی توازن برقرار نہ رہ سکا . . . رضوان نے ہر ممکن طریق سے اسے بھرپور محبت دی۔ اس کی دلجوئی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مگر بے سود . . . رات کو سوتے سوتے ایک دم چونک کر اٹھ بیٹھتی . . . اور تڑپ کر مسہری سے نیچے اترتی . . . اور دروازہ کھول کر باہر نکلنے کی کوشش کرتی . . . رضوان بھی اس

کے پیچھے جاتا۔ اور تڑپ کر اس سے پوچھتا۔

"سعدی کیا بات ہے"۔ "کہاں جانا ہے؟"

"رضی۔۔۔ وہ سنو میرا عمران رو رہا ہے۔ مجھے پکار رہا ہے۔ خدا کے لئے مجھے جانے دو۔ خدا کے لئے مجھے جانے دو۔" وہ دیوانگی سے اپنے بازو اس کے حلقے سے چھڑانے لگتی۔

"سعدی خدا کے لئے ہوش میں آجاؤ۔ کھوئی ہوئی خوشیاں اب کبھی لوٹ کر نہیں آسکتیں۔"

"وہ سنو۔ میرا عمران رو رہا ہے۔" سعدی نے آواز کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

دور سے کسی گھر سے کسی بچے کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ سعدیہ بضد تھی۔ کہ اسے اس گھر تک لے جایا جائے۔۔۔ رضوان نے منت سماجت پیار محبت ڈانٹ غصے، ہر طرح سے سمجھایا۔۔۔ مگر مامتا بے چین ہو چکی تھی۔۔۔ اس کی آواز میں اتنی التجا۔ اور بے کسی تھی۔۔۔ کہ اس کی آنکھوں میں بے طرح نمی آگئی۔۔۔ رضوان بے بس ہو گیا۔۔۔ اسے جوتیاں پہنائیں۔ گرم شال اوڑھائی اور رات کے سناٹے میں پہاڑی ہوائیں کسی برہن کی طرح دکھ بھرے بین کرتی سنائی دے رہی تھیں پتوں کی سرسراہٹ نے ماحول کو عجیب پراسرار بنا رکھا تھا۔ دور سے کسی کتے کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔۔۔ رضوان نے ایک ہاتھ میں ٹارچ۔ اور دوسرے سے سعدیہ کو مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔۔۔ جوں جوں وہ

آواز کی سمت پہنچتے رہے۔ آواز گم ہوتی گئی۔ غالباً کسی کا بچہ رو، رو کر چپ ہو چکا تھا۔ مگر کسی مامتا کی تڑپ کو جگا گیا۔۔۔ پھر سے اس کی بے چینی بے قراری جاگ اٹھی۔۔۔ آواز آنی بالکل بند ہو گئی۔ تو رضوان نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔" آؤ سعدیہ چلیں۔۔۔ شاہم سے روٹھا ہوا ہے۔

"رضی ابھی ابھی تو میرا عمران مجھے پکار رہا تھا۔۔۔ وہ یا تو دودھ کے لئے مچل رہا تھا۔ یا پھر بچھونا گیلا ہو گیا ہوگا۔۔۔ رضی مجھے وہاں لے چلو۔ میں صرف ایک بار اپنے عمران کو دیکھ لوں۔ پھر نہیں روؤں گی۔" سعدیہ نے بے بسی سے التجا کرتے ہوئے کہا۔۔

بڑی مشکل سے رضوان سعدیہ کو منا کر گھر تک دوبارہ لایا۔۔۔ مگر پھر سعدیہ ساری رات نہ سو سکی۔۔۔ ٹھنڈی آہیں۔۔۔ بے قراری سے کروٹیں لینا۔ بار بار اٹھنا بیٹھنا۔۔۔ عمران کا بستر جو برابر وہ اپنے ساتھ لگاتی تھی۔۔۔ اسے ٹھیک کرنا۔۔۔ بار بار بستر پہ ہاتھ پھیرنا۔ اور پھر اس طرح تڑپ تڑپ کر رونا۔۔ کہ برسات کی سیاہ گھٹائیں کیا کسی کی بدنصیبی پہ روئیں گی۔۔۔ رضوان کا بوجھل سینہ غم و آلام کی آگ میں پوری طرح جل رہا تھا۔۔۔ وہ جتنی محبت دیتا۔ اتنی سعدیہ کی بے قراری بڑھتی جاتی۔۔ یہاں تک کہ قدرت کو اس کے حال پہ رحم آگیا۔۔۔ مامتا کی خالی گود کی امید پھر سے ہوگئی۔ خشک کھیتی ہری ہونے کی امید ہو گئی۔ رموز خداوندی کو کون سمجھ سکتا ہے۔ کہ وہ ایک طرف ماں کی گود بھرتا ہے۔ اور دوسری طرف اس کی گود کو اجاڑ بھی دیتا ہے پھر اجڑی گود کو ہرا بھرا کرنے کا سامان پیدا کرتا ہے۔ خانماں برباد گھر میں پھر سے

آبادی کے آثار پیدا ہونے لگے ہیں۔ مایوسیوں، ناکامیوں کے اندھیرے میں ایک کرن پھر سے چمکی۔ اور سعدیہ ایک بار پھر ایک منے سے بچے کو جنم دے کر خود موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔ اس کا خزاں کے پتوں کی طرح زرد چہرہ۔ ۔ ۔ ۔ موت کی بھیانک زردی کو ظاہر کر رہا تھا۔ رضوان قدرت کے اس سنگین مذاق پر تڑپ اٹھا۔ ۔ ۔ اور وہ بے بسی سے ڈاکٹروں کی منتیں سماجتیں کرتا رہا۔ کہ وہ اپنی ہر ممکن کوشش سے اس کی سعدی کی جان بچائیں۔ یہاں تک کہ شدید خون کی ضرورت کی صورت میں اس کا خون بھی کام آیا۔ ۔ ۔ اور وہ نیم دیوانگی کی حالت میں یہی کہتا رہا۔ کہ ڈاکٹر خدا کے لئے میری سعدی کو بچا لیجئے۔ میرے جسم سے آخری قطرہ بھی نچوڑ لیجئے۔ ۔ ۔ مگر میری سعدی کو وہ خوشی دکھا دیجئے جس کے لئے وہ تڑپتی رہی۔ ۔ ۔ روتی رہی۔ ۔ ۔ سسکتی رہی۔ ۔ ۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر دیوانوں کی طرح اپنے بچے کو پکارتی رہی۔ ۔ ۔ ہر بچے کے رونے کی آواز کو۔ اپنے بچے کی آواز سمجھ کر سسکتی رہی۔ ۔ ۔ ڈاکٹر خدا کے لئے میری سعدی کو ہوش میں لے آئیے۔ تاکہ وہ اپنے دامن میں اپنے ہی خون سے سینچا ہوا پھول تو دیکھ سکے۔ ۔ ۔ ڈاکٹر خدا کے لئے۔ ۔ ۔ ۔ اس کی پیاسی نگاہوں کو طمانیت بخش دیجئے۔ ۔ ۔ ۔ رضوان جنون میں خدا جانے کیا کچھ بکتا رہا۔ ۔ ۔ ۔ شدت غم سے اس کا دماغ بھی ماؤف ہو چکا تھا۔ ۔ ۔ ۔ جب قدرے سکون محسوس ہوا۔ ۔ ۔ تو سفید لباس میں ایک معصوم چہرے والی فردوسی حور نشیلی مسکراہٹ لئے اسے مبارک باد دے رہی تھی "کہ زچہ اور بچہ بخریت ہیں۔" رضوان کے لبوں پر ایک حیات افروز تبسم پھیل گیا۔ باوجود

نقاہت کے وہ وارفتگی سے سعدیہ کے کمرے میں جا پہنچا۔

"سعدی مبارک ہو" رضوان نے مجنونانہ انداز میں کہا۔۔۔۔

"اس کا نام عمران ہے نا" سعدیہ نے پہلو میں منّے سے بچے پر نگاہ ڈالی اور گھمبیر لہجے میں پوچھا۔

"اس کا نام کامران ہے۔" رضوان کو سعدیہ کا سوگوار انداز تڑپا گیا۔۔ کہ دنیا میں ہر بڑے سے بڑے نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے۔۔۔ مگر ممتا کا ٹوٹا ہوا دل کسی طرح بھی جوڑا نہیں جا سکتا۔۔۔۔

"کامران۔ نہیں نہیں میرے منّے کا نام عمران تھا۔" سعدیہ کی تھکی تھکی آنکھوں میں اداسیاں گھلنے لگیں۔۔۔۔۔

"دیکھو نا۔ رضوان۔ کامران۔۔۔ کتنا ملتا جلتا نام ہے۔۔۔" رضوان نے اس کا دھیان ہٹاتے ہوئے کہا۔۔۔

اور اس طرح ہزار منتوں کے بعد۔ رضوان اسے کامران کا تصور دینے میں کامیاب ہو گیا۔۔۔ چھوٹے ننھے کے "جانے کے بعد سعدی کی سوچ کے دائرے کسی قدر بدل گئے۔ وہ گھمبیر سی اداسی۔۔۔ اور مجنونانہ انداز۔ جو رضوان کو بے طرح تڑپایا کرتا تھا۔ قدرے بہل گیا۔ عمران تو بالکل اپنے باپ کی کاپی تھا۔ اور یہ ننھا بالکل اپنی ماں کا ناک نقشہ لیے ہوئے تھا۔۔۔ سعدیہ جونہی ہوش میں آئی۔ اس کی ایک نہ۔ کہ وہ پہاڑ پر نہیں جائے گی۔ اماں کے پاس رہے گی۔۔۔ کہتے ہیں دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے۔۔ سعدیہ کا یہ حال ہو گیا تھا۔ کہ گھر پر کوئی بھی آتا۔ وہ

بچے کو اس طرح چھپائے پھرتی۔ جس طرح بلی اپنے بچے کو۔ اور ایک منٹ کے لئے اسے تنہا نہ چھوڑتی۔۔۔ راتوں کو سوتے ہوئے تڑپ اٹھتی۔۔۔ میرا عمران۔۔۔ کہہ کر۔۔۔ وہ زور زور سے بستر پر ہاتھ مار کر کسی کو تلاش کرنے کی کوشش کرتی اور پھر اپنے بچے کو سینے سے لگا کر ٹھنڈی آہیں بھرتی اور سسکیوں کے دوران کہتی "میرے لعل ماں تمہیں بڑی مشکل کے بعد ڈھونڈ کر لائی ہے۔ اب نہ اسے چھوڑ کر جانا۔" رضوان نے بہت جلد وہاں سے اپنا تبادلہ کروالیا۔ کافی عرصے تک وہ اپنی ساس کے پاس رہی۔۔۔ بوڑھی ساس بھی اس جانکاہ صدمے سے نڈھال ہو گئی تھی۔ جب تک بچہ ہوش میں نہیں آیا۔۔۔ اس نے اسے اپنے سے جدا نہیں کیا۔۔۔ اور بڑی کڑی نگرانی میں بچے کی پرورش ہونے لگی۔ رضوان خود بچے کو دیکھنے آجایا کرتا۔۔ وہ سعدیہ کو لے جانے میں خود ہی کوتاہی برتنے لگا۔۔۔ کیونکہ اسے وہ واقعہ بھی یاد تھا۔۔۔ کہ اس کی زبردستی اور ضد نے ہمیشہ کے لئے سعدیہ کی زندگی میں غم سمو دیا ہے۔ اور پھر وہ دونوں کس طرح سلگتی آگ کی آنچ محسوس کرتے رہے۔۔۔

بچے کی بے پناہ چاہت کو دیکھتے ہوئے رضوان نے سعدیہ کو ماں کے پاس ہی رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔۔۔ سعدیہ بھی کچھ رضامند تھی۔۔۔ مگر ماں کی دوربین نگاہیں اپنے بچے کی تنہا و اداس زندگی کا مطالعہ بغور کر رہی تھیں۔ کہ وہی بچہ۔ جو سعدیہ کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھاتا تھا۔ اب اپنے سینے پر صبر کی سل رکھ کر کس طرح دل گرفتہ اپنی نوکری پر چلا جاتا ہے۔۔۔ سعدیہ اپنے بچے پر جان و دل نثار کر رہی تھی۔ اور ماں اپنے بچے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ سوچتے سوچتے ماں نے راہ ڈھونڈ نکالی

کہ قدرت نے اسے دو بیٹوں رضوان، عرفان اور ایک بیٹی فردوس جیسی نیک صورت کی من موہنی دے رکھی تھی۔ فردوس ابھی چھٹی کی طالبہ تھی کہ باپ مر گیا۔۔۔ عرفان بھی اسی شہر میں پرائیویٹ پریکٹس کر رہا تھا۔۔۔ اس کے بھی پانچ بچے تھے۔۔۔ تین لڑکیاں دو لڑکے۔۔۔ اگرچہ وہ رضوان سے چھوٹا تھا۔ مگر بچوں کے لحاظ سے بڑا ہو گیا تھا۔ اس کی سب سے بڑی بچی بھی چھٹی کلاس کی طالبہ تھی۔ اور چھوٹی دو پانچویں چوتھی کی لڑکے ابھی چار اور تین برس کے تھے۔۔۔ عرفان کی بیوی فوزیہ کچھ تیز و طرار فطرت کی عورت تھی۔۔۔ شکل و صورت واجبی سی تھی۔۔۔ مگر تیز سی آنکھیں مقناطیسیت لئے ہوئے تھیں۔۔۔ دوسروں کو جھٹ گرویدہ کر لینا اس کا خاص فن تھا۔۔۔ ساس سے الگ رہ رہی تھی۔۔۔ جیٹھانی سعدیہ سے اس کی نہیں بنتی تھی۔ ایک شہر میں رہتے ہوئے بھی وہ آپس میں دور تھے۔۔۔ عرفان تو اس کا دم بھرتے تھے۔۔۔ کچھ اس طرح اسنے انہیں اپنی تیز سی آنکھوں کی کشش میں جکڑ رکھا تھا کہ ہفتے میں ایک آدھ بار ہی، وہ اپنی ماں کو دیکھنے جا سکتے تھے۔۔۔ اگر کبھی ماں یا چھوٹی بہن گلہ کر بھی لیتی۔ تو جھٹ اپنی پرائیویٹ پریکٹس کا حوالہ دے کر انہیں خاموش کرا دیتے۔۔۔ بیوی سے چھپ کر ماں کی کچھ مدد کر دیا کرتے تھے۔۔۔ ورنہ بقول فوزیہ "کہ سسر کی کافی جائداد موجود ہے۔ جس کے کرائے پر میری ساس ساری زندگی موجیں اڑا سکتی ہے۔ اسے ہماری کمائی کی کیا ضرورت۔" جبکہ ماں نے اپنی آدھی جائداد بیچ کر عرفان کے لئے کلینک، ایکسرے کی مشین۔ دوائیاں خرید کر اسے کسی قابل کیا تھا۔ ڈاکٹری پر جو پیسہ اٹھا تھا وہ الگ۔ سب سے بڑی بات۔ کہ وہ عرفان کی شادی سے مطمئن بھی نہ تھیں۔۔۔ وہ اس گھر

یں اپنی بھانجی لانا چاہتی تھیں۔ کہ وہاں فوزیہ ایک مریضہ کی حیثیت سے کلینک میں آنے لگی ہے۔

مرض بڑھتا گیا۔ جوں جوں دوا کی

اس کی تیز اور پرکشش آنکھوں نے عرفان کو ایسا مسحور کیا۔ کہ وہ دین دنیا سے بے گانہ ہو گیا۔ اور اس کی محبت کو اپنا ایمان سمجھ کر سبھی کچھ ہار بیٹھا۔۔۔۔ ماں کی مخالفت، بڑے بھائی رضوان کی مخالفت کے باوجود۔ وہ فوزیہ کو ہی اسی گھر میں لانے کے لئے بضد ہو گیا۔۔۔۔ ورنہ بصورت دیگر اس نے دھمکی دی کہ وہ خودکشی کرے گا۔ دھمکی نے ممتا کے اٹل فیصلے کو بم کی طرح اڑا کر رکھ دیا۔۔۔ آنکھوں میں نمی۔ ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ دل میں ناراضگی لئے وہ بالآخر فوزیہ کو اپنے خاندان کا ایک فرد بنا بیٹھیں۔۔۔۔ فوزیہ کی ذہانت نے بہت جلد اس بات کا اندازہ لگا لیا۔" کہ وہ ساری زندگی بھی اس ماحول میں اپنے لئے اپنائیت پیدا نہ کر سکے گی۔۔۔" حالات کو ایک دم اس نے دوسری طرف موڑ دیا۔ جب تک کلینک مکمل نہ ہوا۔ وہ خاموش رہی۔۔۔ مگر اندر ہی اندر عرفان کو علیحدگی کے لئے تیار کرتی رہی۔۔۔ جب اس نے دیکھا کہ ہر چیز مکمل ہو گئی ہے۔۔۔۔ تو ایک دن چپکے سے اعلان کر دیا۔۔۔ کہ وہ علیحدہ ہونا چاہتے ہیں۔" ساس بہت تلملائی مگر بے سود۔ رضوان کو بھی بلوایا گیا۔ کہ وہ بھائی سے علیحدگی کی وجہ پوچھے۔ مگر وہ بھی اس معاملے میں شکست کھا گئے۔ جب فوزیہ نے یہ کہہ کر۔ "کہ آپ لوگ علیحدہ رہ سکتے ہیں تو ہمیں روکنے والا کون۔" رضوان نے ماں کو سمجھا بجھا کر انہیں الگ کر دیا۔ اور عرفان نے ماں کو یہی تسلی دی۔ کہ شہر تو ایک

ہی ہے نا۔ ! جب ان کا جی چاہے گا وہ حاضرِ خدمت ہو جایا کرے گا....
اور اس طرح فوزیہ کی چالاکی اور ہٹ دھرمی نے اس کے مقصد میں کامیاب کر دیا
شروع شروع میں تو کرایے کے مکان میں رہی... مگر پھر بہت جلد اپنے لئے شہر
میں ایک شاندار کوٹھی تعمیر کروائی۔ اور اس میں منتقل ہو گئے۔ قدرت نے اولاد کے
معاملے میں بھی فیاضی برتی۔ ایک ایک سال کے فرق پر فیاضی بخشی جاتی رہی.... عرفان
کی چھوٹی بہن فردوس۔ اور بڑی لڑکی نسیمہ ایک ہی جماعت کی طالبہ تھیں۔ فردوس
اپنی شدید علالت کے باعث پڑھائی میں پیچھے رہ گئی تھی۔ اس لئے وہ نسیمہ کے ساتھ
مل گئی... ماں کی دوررس نگاہوں نے جو تجویز سوچی تھی۔ وہ یہ تھی۔ کہ نسیمہ کو عرفان
کے پاس اس وقت تک رکھا جائے جب تک رضوان کی کسی ایسی جگہ ٹرانسفر نہ ہو جائے
جہاں اسکول کا معاملہ دشوار گزار مسئلہ نہ بن جائے۔ تو وہ نسیمہ کو اپنے پاس لے آئے گی
ذاتی مکان کو کرایے پر اٹھا دے گی۔ اور خود رضوان کے پاس منتقل ہو جائے گی۔ اور
اس طرح بچے کی پرورش کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ اور رضوان کی دلی بے قراری
کو بھی سکون مل جائے گا۔

دو چھٹیاں تھے کہ جب رضوان اپنی ماں سعدیہ اور اپنے منے کامران اور ننھی
سی بہن فردوس کو ملنے آیا۔ تو ماں نے یہ مسئلہ اس کے سامنے پیش کیا... مگر رضوان
نے اس معاملے کی شدت سے مخالفت کی... وہ فوزیہ کی ذہنیت سے واقف
تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ بہن وہاں جا کر ان کے لئے بوجھ بن جائے.. ماں یہ سب
ایثار اس کے لئے کر رہی تھی۔ اس کا اسے احساس بھی تھا۔ مگر وہ اتنا بے حس نہ تھا۔

کہ اپنی خوشیوں کی خاطر اپنے آبائی مکان کو کرایے پر اٹھا دیتا..... کم از کم بزرگوں کی ایک نشانی اور برکت تو موجود ہے... وقت بے وقت وہ اس گہوارۂ سکون میں پناہ تو لے سکتے ہیں۔ عید تہوار کے موقع پر اپنے گھر تو آسکتے ہیں۔ ماں بھاری ہو کر اپنے گھر کی مالکہ تو بنی بیٹھی ہے۔ کسی لڑکے کی محتاج تو نہیں.... بہن بھائیوں کے ظلم وستم کا نشانہ تو نہیں بنی۔ کم از کم اس دوری نے ماں۔ اور بہن کی عزت تو برقرار رکھی ہے اگر یہ کبھی کبھار لڑکوں کے ہاں مہمانوں کی طرح چلی بھی جائیں۔ تو وہ انہیں اپنی آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ مگر مستقل رہائش کا نہ کبھی ماں نے سوچا تھا۔ اور نہ ہی اب رضوان سوچنے کے لئے تیار تھا۔ اس نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا...

"امی جان۔ سعدیہ منا آپ کے زیر سایہ رہے تو بہت بہتر ہے.... ابھی تک سعدیہ کا دماغ اس جانکاہ صدمے کو بھولا نہیں.... آپ کی شفقت۔ اور فردوس کا پیار سعدیہ کو کسی بھی تکلف سے دوچار نہ ہونے دے گا۔"

"میرے لعل۔ یہ مت بھولو۔ کہ میں ظالم ماں ہوں۔ میں تمہارے دل کی ہر بے قراری اور بے چینی کو خوب سمجھتی ہوں..... سعدیہ تمہیں بہت عزیز ہے۔ پھر ابھی تک خود تم عمران کا صدمہ نہیں بھولے... میں کیسے برداشت کروں۔ ؟ کہ میرا لعل سارا دن محنت مشقت کے بعد گھر آئے گھر تو اسے کاٹنے کو دوڑے۔" ماں نے پیار بھری آواز میں سمجھاتے ہوئے کہا۔

"امی آپ جو کچھ محسوس کرتی ہیں۔ وہ حقیقت ہے۔ مگر آپ یقین جانیئے کہ میں ہفتہ میں ایک آدھ بار آکر آپ سبھوں کو دیکھ جاتا ہوں۔ تو قطعی پرسکون ہو

عاطقہ

جاتا ہوں ۔!!

"رضی کب تک خود کو بہلاتے رہو گے ۔؟"

"امی آپ یقین جانیئے ۔!"

"بس جی چپ کرو... مجھ سے زیادہ تمہیں کوئی نہیں سمجھ سکتا.." ماں نے ایک پیار بھری ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا...

----- "امی آپ نے جو فیصلہ کیا ہے ۔میں اس کی شدت سے مخالفت اس لئے کر رہا ہوں ۔کہ فوزیہ جتنی خود غرض ہے ۔ وہ آپ بخوبی جانتی ہیں ۔فردوس ایک معصوم بھول سی بچی ہے ۔وہاں جا کر مرجھا جائے گی ...!"

"کیا اس کا بھائی اندھا ہے ۔جو اپنی بہن کے حالات نہ دیکھے گا ۔!"

"امّی وہ اندھا بنا دیا گیا ہے..... دیکھئے نا.... عمران گم ہو گیا... پرائیوں نے اتنا غم کھایا ۔کہ تین دن تک ان کا چولہا نہ جلا ۔اور یہاں سنا تھا کہ بھیا فیضی کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منا رہے تھے.... کہیئے امّی یہ جھوٹ ہے ۔؟ امی انہیں بے حس بنا دیا گیا ہے... جب سعدی کو لے کر میں آپ کے پاس آیا تو فوزیہ بھابی نے کیا کہا تھا ۔یاد ہے نا آپ کو ۔! ارے ایک معمولی سے گوشت کے لوتھڑے کے کھو جانے پر تم نے اپنی جان کیوں ہلکان کر رکھی ہے ۔؟! اور پھر سعدی اس فقرے پر کیسی پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی....!" رضوان نے بے قراری سے پہلو بدلتے ہوئے کہا ۔

"وہ تو ہے ہی بدزبان ۔!" ماں نے قدرے نفرت بھرے لہجے میں کہا ۔

امّی بدزبان ۔ نہیں خود غرض کہئے ۔ ابھی ان کی کوٹھی پر غلطی سے چلا بھی جاؤں مجھے وہاں اپنے بھائی کے بچوں کی کشش کھینچ کر لے جاتی ہے .... تو ان کے ماتھے پر ہزار ہزار بل پڑ جاتے ہیں ... تب نیا واقعہ گھڑ کر فضا کو مکدر کر دیتی ہیں کہ مجبوراً دل برداشتہ ہو کر اٹھ جانا پڑتا ہے ... اپنے بھائی کو دیکھنے کو جی چاہے تو ان کے کلینک میں جا کر دیکھ آتا ہوں"۔ رضوان نے سرد آہ بھری ....

"پھر۔ کیا کروں۔ مقدّر کے لکھے کو کیسے مٹاؤں ۔؟"

"امی آپ کیوں اپنا دل میلا کرتی ہیں۔ بھیّا تو خوش و خرم ہیں نا۔؟ ہم نے ان کی خوشی دیکھی ہے ۔!" رضوان نے تسلی آمیز لہجے میں سمجھاتے ہوئے کہا ....

"تو اب تمہارا مطلب یہ ہے۔ کہ میں بھی تمہارے گھر نہ آؤں ۔؟"

"توبہ استغفار ۔! امّی یہ عجیب و غریب سا سوال آپ کے ذہن میں آیا کیسے ۔؟ رضوان تو آپ کے قدموں کی خاک ہے۔ آپ تو میری قبلہ و کعبہ ہیں۔ آپ کے دم سے میری زندگی میں بہاریں رقصاں ہیں۔ آپ کا قدم میرے لئے باعث خوشی و برکت ہوگا ... میں تو اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھوں گا۔ کہ ماں کی خدمت کا حق میرے حصے میں آیا ... اور بہن کی خوشیاں دیکھنی مجھے نصیب ہوئیں۔ مگر میری بدقسمتی۔ کہ ٹرانسفر ہوا بھی تو ایسی جگہ ۔ کہ میں آپ سے دور چلا گیا۔ کوشش میری تو یہی ہے کہ میں بھی فیض آباد آجاؤں ۔ تاکہ اپنی ماں کے قدموں میں رہ کر زندگی کے آخری دن بھی گذار دوں ۔!" رضوان نے ماں کے پاؤں پیار و تقدس سے چھوتے ہوئے کہا۔

"ماں کو تسلی دینی خوب آتی ہے۔ تو یہ کہہ کر تسلی دے دی کہ اچانک دلہ

عاطفہ

کروالوں گا۔"! ماں نے پیار سے رضوان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔۔۔۔

"امی آپ دعا ہی تو نہیں مانگتیں۔ اگر صدق دل سے دعا مانگی ہوتی تو آج میں آپ کے قدموں میں ہوتا۔"!

"ماں کی دعائیں تو تمہارے ساتھ سائے کی طرح ہیں۔ اچھا اب جب تک تبادلہ نہ ہو تو کیا تم سعدیہ کو نہیں لے جاؤ گے۔؟"

"ہرگز نہیں۔" رضوان نے قدرے شوخ ہو کر کہا۔

"تم تو کہتے ہو۔ کہ کریم آباد ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ اور تمہیں شہر میں مکان ملا ہے۔ پھر کس بات کا خطرہ۔"

"امی میں دراصل اس جانکاہ حادثے کو بھولا نہیں۔۔۔ میرا کام دوروں پر جانا ہے۔ راتوں کو بھی میں گھر پر نہیں ہوتا۔۔۔۔ سعدیہ کی حالت آپ سے پوشیدہ نہیں۔ کہ وہ ذہنی طور پر بیمار ہے۔ ایسے میں اسے ایک پل بھی الگ رکھنا بے وقوفی نہیں۔؟" رضوان نے افسردگی سے کہا۔

"کسی اچھی سی ایماندار آیا کا بندوبست کیوں نہیں کر لیتے۔؟"

"امی یہ کام بھی آپ کا ہے۔ بھلا میں کیا جانوں۔؟ کہ کونسی عورت ایماندار ہے اور کونسی بے ایمان۔؟"

"نعیم کی خالہ زاد بہن بیوہ ہو چکی ہے۔ رشتہ دار بھی ہے۔ اچھی لڑکی ہے۔ کسی مناسب سی نوکری کے لئے اس کی ماں کہہ رہی تھی۔ آج ہی پیغام بھجوائے دوں گی۔ گھر کی بات ہے انہیں اعتراض نہ ہوگا۔"

"تو آپ گویا مجھے نکلوانے کے درپے ہوگئی ہیں۔" رضوان نے دلی خوشی کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"ماں ہوں نا۔ اولاد کی تکلیف کیسے دیکھوں"

"امی آپ کتنی اچھی ہیں۔" کہہ کر رضوان نے ماں کے گلے میں اپنی مضبوط بانہیں حمائل کردیں۔

اور اس طرح رضوان کی دانشمندی اور تدبیر سے پورا گھر بربادی کے ہاتھوں جاتے جاتے بچ گیا۔ نئی آیا لڑکی جس کا نام انجم تھا ایک شرمیلی اور جوان سی لڑکی تھی۔ اس کی بدنصیبی پر سب نے اظہار افسوس کیا۔ سعدیہ کو رضوان پہلے ہی بتلا چکا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اور اس طرح بہت جلد آپنے مرکز پر روانہ ہوگئے۔۔۔۔۔۔

سعدیہ کے آجانے سے گھر میں ایک بار پھر بہار آگئی۔ ننھے کامران نے اس اجڑے ہوئے گھر کو پھر سے آباد کردیا۔۔۔۔۔ رضوان اسی طرح دفتر سے جلد لوٹتا۔۔ مگر گھر آکر اسے قدرے دکھ ہوتا کہ صبح کا سارا کام بکھرا ہوا ہے۔ سعدیہ اسے اپنے بستر پر بیٹھی نظر آتی۔۔۔ کبھی وہ کامران کو سلاتی، تو کبھی اٹھاتی۔ انجم سے اس کے کپڑے دھلواتی۔ اس کا بستر دھوپ میں پھیلانے کو کہتی۔ اس کی دودھ کی بوتلیں صاف کرواتی۔ اب وہ بیچاری لڑکی کہاں تک دوسرے کاموں کو نبھاتی۔ سعدیہ ہی اسے دوسرے کاموں میں دلچسپی نہ لینے دیتی۔ اب سعدیہ کے دل میں وہ پہلی سی تڑپ اور محبت بھی نہ رہی۔۔۔۔۔ اس کی توجہ کا واحد مرکز۔ اس کا بچہ تھا۔ رضوان پہلی سی محبت کو ترس گیا تھا۔ نہ اس کے کپڑوں کی فکر۔ بٹن ٹوٹے

ہیں تو ٹوٹے رہیں۔ کالر پھٹے ہیں تو پھٹے رہیں۔ دھوبی نے کپڑا گم کر دیا۔ تو کسی کو پرواہ نہیں۔ بستر میلا ہے تو ہوتا رہے۔ جوتوں کو پالش اگر کرے گا بھی۔ تو وہ رضوان ہوگا۔ جرابیں میلی۔ کمرہ بے ترتیب۔ سارے سوٹ مٹی گرد سے بھرے ہوئے۔ جہاں اتارے وہیں پڑے ہوئے ملیں گے۔ وہ اپنے پسندیدہ کھانوں کو ترس گیا۔ وہ اپنی سعدی کے والہانہ پیار کو ترس گیا۔ وہ گھر کے حقیقی سکون کو ترس گیا۔ سعدیہ کی بے اعتنائی اور سرد مہری کی شکایت وہ کس سے کرتا۔ اس کا اپنا سکون دل کے بوجھ۔ اور دماغی الجھنوں کے بار تلے دب چکا تھا۔۔۔ اس کی اپنی حالت اتنی کمزور تھی۔ کہ چہرہ تو بالکل خزاں کے پتے کی مانند زرد پڑ چکا ہے۔۔۔۔ جسم بے جان۔ آنکھوں میں ہر وقت پریشان آرزؤں کی تاریک سائے لہرایا کرتے تھے۔۔۔۔۔ وہ خود گیلی لکڑیوں کی طرح سلگ رہی تھی۔ جب وہ اپنے بچے کو سینے سے بھینچتی۔ تو اس کے جسم میں تشنجی ابھار سا پیدا ہو جاتا۔ میرے عمران۔ میرے لعل کہہ کر وہ اسے بے تحاشا چومتی۔۔۔۔ اس کے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیرتی۔ اور پھر تڑپ تڑپ کر رو دیتی کہ دیکھنے والا بھی ایک دلفگار آہ بھر کے رہ جاتا۔

رضوان حتی المقدور اسے پیار دیتا رہا۔ اس کی دلجوئی کرتا رہا۔ اس لطیف احساسات کی قربت کو یاد کر کے بے تحاشا سگرٹ پھونکتا۔ اور اپنا سینہ اس دھوئیں بھرے ماحول سے جلاتا رہتا۔۔۔ بیتے دنوں کی یادیں۔ اسے مضطرب اور بے چین رکھتیں۔ اسے ایسا محسوس ہوتا گویا اس کا گھر لٹ گیا ہو۔ اور وہ اجاڑ ویرانوں میں گھوم رہا ہو۔ اس کے خوابوں کے شیش محل چکنا چور ہو کر۔ اس کے زخمی دل میں اپنی کرچیاں چبھا رہے تھے۔

عاطف

رات خاصی سرد ہو چلی تھی۔۔۔۔ آتشدان میں لکڑیاں سلگ رہی تھیں۔۔ بیڈروم کے دبیز پردوں کو منجمد کر دینے والی ہوائیں سرسرا رہی تھیں۔ رضوان آتشدان کے قریب کرسی بچھائے کسی گہری سوچ میں مستغرق تھے۔۔۔ شعلوں کی لپک کا عکس ان کے پروقار چہرے پر بھی پڑ رہا تھا۔۔۔۔ انجم کے سامنے رضوان کی ڈھیر ساری قمیضیں پڑی ہوئی تھیں جنہیں وہ بٹن لگا لگا کر تہہ کرتی جا رہی تھی۔۔۔۔ اچھی طرح تسلی کر کے جب وہ قمیضیں تہہ کرتی۔۔۔ تو ایک نظر سعدیہ پر ایک اور دزدیدہ نگاہ رضوان پر ڈالتی۔۔۔۔ اسے اس گھر میں آئے ہوئے پانچ برس گذر گئے تھے۔ ان پانچ برسوں میں وہ اس گھر کے مکینوں کی سلگتی زندگی کا بغور مطالعہ کرتی رہی۔۔۔۔ جن کی تاریک زندگی میں مسرت کی ذرا سی بھی رمق نہیں ملتی۔۔۔۔ سعدیہ نے اپنے گرد وحشت و جنون کا اس قدر مضبوط جال بن رکھا ہے کہ اسے رضوان کا بے پایاں پیار۔ اور خلوص بھی نہ کاٹ سکا۔ ان تاریکیوں۔۔۔ کے درمیان ایک نازک سا رشتہ ننھے گڈو کامران نے جوڑ رکھا تھا۔۔

عاطفہ

ورنہ کب کی ویرانیاں اس جال کو کتر ڈالتیں۔۔۔۔ جو سعدیہ اور رضوان کے درمیان حائل تھیں۔ انجم اس سوگوار خاندان کا ایک فرد بن کر رہ گئی تھی۔ وہ رضوان کی شرافت اور نجابت کی دل سے قائل ہو چکی تھی کہ اس نے کبھی اس پر نگاہ غلط نہیں ڈالی۔۔۔۔ حالانکہ وہ بھی جوان ہے۔ کئی مرتبہ کتنی کتنی دیر وہ سامنے رہی۔۔۔ سعدیہ کے پاؤں دباتی۔ یا سر۔۔۔ رضوان ہاتھ میں اخبار یا کوئی کتاب پکڑے اس سے قطعی بے نیاز بیٹھا رہتا۔۔۔۔ آج بھی وہ پاؤں پھیلائے۔ آنکھیں موندھے کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ایش ٹرے میں بے شمار ادھ جلے سگریٹ کے ٹکڑے ان کی پریشانی اور غم کو ظاہر کر رہے تھے۔۔۔۔ انجم بظاہر تو بٹن ٹانک رہی تھی۔ مگر دوزدیدہ نگاہوں سے رضوان کو دیکھے جا رہی تھی۔۔۔ یہ دراز قد۔۔۔ سڈول کسرتی جسم۔۔۔ سلیپنگ سوٹ میں ملبوس پریشان بالوں والا یہ جوان اس کی نگاہوں کا مرکز بنتا جا رہا تھا۔۔۔ اب اسے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر قوس و قزح کے رنگ بکھر جاتے۔ دل دھڑکنوں کی آماجگاہ بن جاتا۔۔۔۔ وہ رضوان کی پسند اور فطرت سے اچھی طرح واقف ہو چکی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے اس کے پسندیدہ کھانے پکاتی۔ اس کے کپڑے دھوتی۔۔۔۔ اپنے آرام کے لمحات میں اس کے لئے سوئیٹر بنتی۔ اس کے ٹوٹے بٹن ٹانکتی۔ اس کے کمرے کی صفائی دل و جان سے کرتی۔۔۔۔ اب ہر روز صبح رضوان کو پالش شدہ جوتے بھی مل جاتے۔۔۔۔ منہ ہاتھ دھونے کے لئے گرم پانی۔۔۔ صاف تولیہ۔ اور گرم گرم ناشتہ بھی مل جاتا۔۔۔۔ وہ بھی انجم کے مشکور تھے۔۔۔ جس نے ان کی ویران اجاڑ زندگی میں تھوڑی سی زندہ رہنے کی رمق پیدا کر دی تھی۔ اس وقت بھی وہ آنکھیں موندھے اسی کے متعلق سوچ رہے تھے کہ

کتنی وفادار شرمیلی۔ اور شریف لڑکی ہے۔۔۔ یہ پھول تو کسی مہکتے گلستان کی رونق ہونا چاہیئے تھا۔ مگر قدرت کی نیرنگیوں نے اسے ویرانے بیابانوں میں خار دار جھاڑیوں کے درمیان اٹکا دیا۔ جب دل سرگوشیاں سن کر مچل اٹھتا ہے۔ آنکھیں کسی حسین جرم کے ارتکاب میں جھک جاتی ہیں۔ قدموں میں کسی مست ہرنی کی چال آجاتی ہے۔ انسان چلتے پھرتے خوابوں کی دنیا میں بھٹکتا ہے۔ پروانے کا جلنا ایک کھیل سمجھ کر دیکھتا ہے۔ کوندتی بجلی کی لپک سے نازک سا دل دہل اٹھتا ہے۔۔۔ روشنیوں کا شیدائی اندھیروں سے خوفزدہ ہوتا ہے۔۔۔ بہاروں کی رنگینی۔ اور ماحول کی نغمگی میں اس کی روح کھل اٹھتی ہے۔ ایسے حسین لمحات میں قدرت نے کتنی بے رحمی کی۔۔ کہ اس ہنستے کھیلتے پھول کو خزاؤں کی گود میں لا پھینکا۔۔۔ سرخ و سفید رنگت شبنمی آنکھیں۔ نازک سا جسم۔۔۔ پتلی سی ناک اور دراز بالوں والی انجم جو سچ مچ ستاروں کی ملکہ نظر آتی ہے۔۔۔ مگر قدرت کا انوکھا مذاق۔ کہ صرف چھ ماہ کی بیاہی ہوئی سہاگن۔ ہمیشہ کے لئے بدنصیبی کو اپنے ماتھے پر بیوگی کا جھومر لگا بیٹھی۔۔۔ کمرے میں دودھیا روشنی ایک ساحرانہ جال بن رہی تھی۔۔۔ رضوان نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ تو انہیں یقین نہ آیا۔۔ کہ انجم ایک ادائے دل نوازی سے ان ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔۔۔ نگاہوں کی بات دل نے جھٹلا دی۔۔۔ دماغ جھنجلا اٹھا۔۔۔ اور یکبارگی پوری آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔۔ چوری پکڑے جانے پر انجم کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ ابھری۔ اور بہت جلد ڈوبی یہ سوچ کر کہ مالک کے دل میں اس کے متعلق کتنی قسم کی بدگمانی نہ پیدا ہو جائے "کتنی بیباک لڑکی ہے۔۔ جو ایک غیر مرد کو مسلسل گھور رہی تھی"۔ کانوں کی لوئیں تک سرخ ہو گئیں۔

جلدی سے کپڑے سمیٹے۔ نظریں جھکائے اپنے پہلو کو سکیڑ سمیٹ کر چاہتی تھی کہ باہر نکل جائے۔۔۔ کہ رضوان کی گھمبیر سی آواز نے فضا میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کر دیا۔

"انجم ٹین لگائیے۔؟"

"جی" ایک لرزیدہ سی آواز آئی۔

"صبح سے رات گئے تک میں نے تمہیں ہمیشہ کام میں مصروف دیکھا ہے۔ کیا تم انسان نہیں۔؟ تمہارا جی آرام کو نہیں چاہتا۔" رضوان نے سوئی ہوئی سعدیہ کی طرف دیکھتے ہوئے آہستگی سے پوچھا۔

"مالک یہ جبر تو نہیں۔ میری خوشی کا کام ہے۔ پھر مجھے کیوں تھکاوٹ محسوس ہو۔" انجم نے ایک ہاتھ سے دبیز پردے کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے جواب دیا۔۔۔

"انجم تم مجھے مالک کیوں پکارتی ہو۔؟" رضوان نے سگریٹ سلگاتے ہوئے اچانک اور سوال کر ڈالا۔

"تو کیا آپ میرے مالک نہیں۔؟" دل کے کسی گوشے سے ایک اچانک ایک حسرت لبوں پر آ کر مچل اٹھی۔ بے اختیار اس جملے نے اس کے احساس میں چنگاری بھڑکا دی۔۔۔۔ اور وہ جلدی سے پردہ ہٹا کر باہر نکل گئی۔۔۔۔۔

باہر چاند درختوں کے اوپر سے جھانک رہا تھا۔ ٹھنڈ کی وجہ سے اس کی چاندنی بھی سفید سفید دھند میں ڈوبی نظر آ رہی تھی۔۔۔۔ عجیب پراسرار سی یہ دھند اس کے گرد لپٹی جا رہی تھی۔۔۔۔ پتوں کی سرسراہٹ میں کوئی سرگوشیاں کر رہا تھا۔

"تو کیا آپ میرے مالک نہیں ۔؟"

باہر ٹھنڈ ہونے کے باوجود بھی ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اپنے جسم میں اک آگ سی لگی محسوس کر رہی تھی ۔ ہلکی ہلکی تپش نے امنگوں کی چاندنی میں اک آگ سی لگا دی تھی ۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے کمرے میں داخل ہوئی ۔ ۔ ۔ بٹن دبایا ۔ اور آن واحد میں سارے کمرے میں ایک پراسرار سی روشنی پھیل گئی ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے بڑی اپنائیت سے تہہ شدہ قمیضوں کو اپنے صندوق کے اوپر رکھا ۔ ۔ ۔ ۔ اور غیر ارادی طور پر آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی ۔ اچھی خوراک ۔ اچھے ماحول نے انجم کو یکسر بدل کر رکھ دیا تھا ۔ ۔ ۔ سرخ سرخ سے گال ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آنکھوں میں بے پناہ کشش پتلا سا نازک ستواں ناک ۔ ۔ ۔ ہزاروں گلاب کی پنکھڑیوں کے رنگ چرائے ہوئے تراشیدہ سے ہونٹ ۔ ۔ رنگت ایسی جیسے میدے میں زعفران گھول دیا ہو ۔ ۔ جسم بھرا بھرا ۔ ۔ ۔ ذہن سے ماضی کی تلخ یادوں کی بجائے حال کی میٹھی کسک اور انجانے سے سپنے اسے ہر وقت دکھائی دیتے ۔ ۔ ۔ "وہ کتنی بدل گئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اتنا ڈھیر سا حسن کہاں سے اسے مل گیا ۔؟ کونسی خلش نے اس کے ہونٹوں کو اک پراسرار سی مسکراہٹ بخشی ۔؟ کیوں اب زندہ رہنے کو جی چاہنے لگا ۔؟ آج سے پہلے تو کبھی آئینے کے سامنے کھڑے ہونے کی خواہش نہیں جاگی ۔؟؟"

اتنے میں دروازے پر کسی نے ہلکی سی دستک دی ۔

"کون ۔؟" کہہ کر انجم نے ایک دم جھٹکے سے اپنے کو آئینے کے سامنے سے ہٹایا ۔

"رضوان"

"مالک ۔؟ مجھے بلوا لیا ہوتا ۔ ۔ ۔ ۔ خیر تو ہے ۔؟" انجم نے سر پر دوپٹہ اوڑھتے

ہوئے کہا۔

"یہ ہیٹر لایا ہوں۔ سوچا بہت ٹھنڈ ہو رہی ہے۔ تمہارا کمرہ خاصہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔!!" اتنا کہہ کر رضوان نے ہیٹر کا سوئچ لگا دیا۔ اور چند منٹوں بعد ہیٹر سے سرخ سرخ سی روشنی نکلنے لگی۔

"آپ نے کیوں تکلیف کی۔؟" انجم نے رکتے رکتے کہا۔

"تکلیف... کیسی تکلیف۔؟ یہ میرا فرض تھا۔ تم میرا کتنا خیال رکھتی ہو۔ میں ایک ہیٹر لے آیا تو وہ تکلیف شمار ہونے لگا.." رضوان نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

"مالک..؟" کہتے کہتے انجم کے یاقوتی لب تھرتھرا اٹھے۔!

"کیا مجھے تم رضوان کہہ کر نہیں پکار سکتیں۔" رضوان نے جاکلیٹی شال کا پلو اپنے کاندھے پر ڈالتے ہوئے استفہامی نظروں سے پوچھا۔۔

انجم ایک لمحے کے لئے سٹپٹا گئی۔ نچلے ہونٹ کے دائیں گوشے کو حیرت سے دانتوں تلے دباتے ہوئے کہا۔

"میرے مالک۔ مجھے شرمسار نہ کیجئے۔ میں کون ہوں۔ کیا ہوں۔؟ بخوبی جانتی ہوں.....!!"

رضوان کی آنکھوں میں بے پناہ غم کے سائے لہرا گئے.... رکتے ہوئے کہا..

"انجم۔ تم میری دور کی رشتہ دار بھی ہو... اس رشتے کو تم جھٹلا نہ سکو گی۔ میں تمہیں سعدیہ کا مددگار بنا کر اس گھر میں لایا تھا۔ خدا گواہ ہے۔ میں نے کبھی تم کو اس نظریئے سے نہیں دیکھا... جو تم سوچ رہی ہو....!"

"مالک . . . امیروں اور غریبوں کا کیا جوڑ ۔؟"

"تو کیا تم رشتہ داری سے بھی انکار کرتی ہو ۔؟"

"انکار تو نہیں ۔ امی اکثر کہا کرتی تھیں ۔ کہ ان کے بہت امیر امیر سے رشتہ دار شہر میں رہتے ہیں ۔ اور خدا کا شکر ہے کہ آپ سب لوگوں کو کسی بہانے دیکھ لیا ۔ انجم نے معصومیت سے کہا ۔

"تمہاری بیوگی کی اطلاع مجھے بھی ملی ۔؟ سن کر شدید دھچکا پہنچا . . . قدرت کے کاموں میں کون دخل دے سکتا تھا . . . . میں کیسے تسلی دیتا . . کیونکر آتا ۔ جب کہ میں شادی میں بھی شریک نہیں ہوا تھا ۔ اپنے دل میں خود ہی ندامت محسوس کرتا رہا ۔ اور انہی دنوں میرا بچہ بھی کھویا ہوا تھا جس کی وجہ سے میرا ذہن بہت ہی پریشان تھا ۔"

"ہاں مالک ! وہ صدمہ میرے لئے یقیناً جانکاہ تھا ۔ چھ ماہ کی سہاگن . . . ."

کہتے کہتے اس کا درد آنکھوں کی راہ سے بہہ نکلا ۔ !

"انجم صبر کرو ۔ صبر کے سوا اب چارہ بھی کیا ہے ۔؟ تم نے تو صدمہ مرنے کے بعد برداشت کر لیا مگر مجھ کو جو جیتے جی چوٹیں مل رہی ہیں ۔ اس سے تم بھی ناآشنا نہیں ۔ اسعدی آج نیم دیوانوں کی سی زندگی بسر کر رہی ہے ۔ اپنے گڈو کے علاوہ ہر چیز سے بیگانہ آرزو ہو چکی ہے ۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ موت و زیست کی کشمکش میں گرفتار ہے . . . ڈاکٹروں نے اس کے بارے میں جو رائے مجھے دی ہے . . . . میں اتنی شدید چوٹ سننے کے بعد بھی زندہ ہوں ۔ انجم ۔ ! میں بہت دکھی ہوں ۔ انجم ۔ سعدی مجھ سے بے پناہ پیار کرتی تھی ۔ مگر آج وہ ہر چیز کو بھلا بیٹھی ہے . . . ؟ میں اس کے سوئے ذہن کو جگا جگا کر ہار چکا ہوں

مگر میری سعدی تو ہمیشہ کے لئے کہیں جا سوئی ہے۔؟" رضوان نے بیگانہ سی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا...

"مالک مجھے آپ کے دکھ کا گہرا احساس ہے... خدا سعدیہ بی بی کو کچھ نہ کرے میں کل سے ان کے لئے روزے رکھوں گی۔ کہ خدا انہیں جلدی صحتیاب کر دے... اور آپ کو پرسکون کر دے۔" انجم نے معصومیت سے اپنی دلی دعا پیش کی....

"انجم تمہارا خلوص ہی بے پایاں ہے... روزوں کی ضرورت نہیں۔ سارا دن ویسے تم کام میں مصروف رہتی ہو۔!"

"نہیں مالک... میں بی بی سعدیہ کے لئے منت کے روزے ضرور رکھوں گی۔!"

"ابھی نہیں......!"

"کب۔؟"

"جب میں کہوں...!" رضوان نے اپنائیت سے کہا۔ "اچھا انجم خدا حافظ" اور وہ تیزی سے باہر نکل گئے۔ انجم ان کے نقشِ پا کو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

انجم نے رضوان کی پسند کے نرگسی کوفتے بڑی محنت اور اپنائیت سے تیار کئے۔ وہ چپاتیاں بنا رہی تھی۔ جب رضوان دفتر سے لوٹے... ان کے ہاتھوں میں دو بنڈل تھے.. خوشی سے چہرہ دمک رہا تھا... ذرا سا باورچی خانے میں جھانکتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"انجم مجھے ترقی ملی ہے۔ سعدیہ کہاں ہے؟"

"مبارک ہو مالک... بی بی گڈو کو سلا رہی ہیں......" انجم نے پیڑا بناتے ہوئے کہا.....

"آج تو تم نے میرا پسندیدہ رنگ فیروزی پہنا ہے.... میری سعدیہ بھی اکثر یہی رنگ پہنا کرتی تھیں۔" اتنا کہہ کر وہ کمرے کا دبیز پردہ اٹھا کر اندر چلے گئے۔ اور انجم سوچتی کی سوچتی رہ گئی۔ کہ مالک کو اپنی سعدیہ سے کتنا پیار ہے۔ کسی بھی بات میں وہ اسے نہیں بھولتے... "مجھے یہ رنگ نہیں پہننا چاہیئے" خدا جانے آج انہیں

اس رنگ کو دیکھ کر کتنی تکلیف پہنچی ہو گی۔ انجم نے خود سے سوچا... توے پر روٹی جل رہی تھی۔ دل میں ایک بے چینی اور تڑپ کی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھی۔ اور اپنے کمرے میں جاکر فوراً اپنا سفید لباس پہنا۔ بڑی حقارت سے اس لباس کو دور پھینکا... مالک کی بھوک کا خیال آتے ہی فوراً باہر نکلی... ابھی ایک قدم دروازے کے اندر دوسرا باہر تھا... کہ اچانک رضوان سے مٹھ بھیڑ ہو گئی۔

"انجم کپڑے کیوں بدلے ہیں۔؟" رضوان نے بھرپور اپنائیت سے پوچھا....

"مجھے وہ رنگ بالکل پسند نہیں تھا۔؟" انجم نے آنسوؤں کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"پھر پہنا کیوں تھا۔؟"

"بھول ہو گئی۔!" انجم نے ڈرتے ڈرتے کہا...

"تمہیں اس بھول کی سزا ملنی چاہیئے..." رضوان نے سہمی ہوئی انجم کو نیم وا آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا....

"جی۔!" وہ ہچکچا کر رہ گئی۔

"جی۔!" کہہ کر رضوان نے ایک بنڈل انجم کے آگے کر دیا۔

"یہ کیا ہے۔؟"

"کھول کر دیکھو۔"

"ابھی۔!"

"ہاں۔"

انجم نے جلدی جلدی بنڈل کھولا... تو تربوزی رنگ کا ایک خوبصورت

سوٹ معدو دوپٹہ کے اس کے خوبصورت ہاتھوں سے پھسلا جارہا ہے ۔۔۔۔

"مالک یہ کیا ۔؟"

"کپڑے ہیں ۔ کوئی خاص چیز تو نہیں ۔!"

"میں نہیں پہنوں گی ۔؟"

"کیوں ۔ ؟"

"مالک! یہ شاید آپ بھول گئے ہیں کہ میں بیوہ ہوں ۔ اور بیوہ کو دنیا کی کسی بھی دلچسپی میں حصّہ نہیں دیا جاتا ۔!"

"انجم کس دور کی بات کر رہی ہو ۔؟ کس مذہب کی بات کر رہی ہو ۔۔؟ ہمارا مذہب تو ایک عالمگیر مذہب ہے ۔ جس میں بڑی وسعت اور بڑی لچک ہے ۔!"

"مالک یہ آپ کی بھول ہے ۔۔۔ خدا تو پھر پوچھے گا ۔ مجھے تو یہ دنیا والے ہی جینے نہ دیں گے ۔!"

"تمہیں دنیا والوں کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے ۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو مالک ۔ دنیا میں رہنا ۔ اور دنیا والوں کی پرواہ نہ کرنا ۔۔۔ مجھے میرے حال پر رہنے دیجئے ۔ یہ سوٹ بی بی سعدیہ کو بہت کھلے گا ۔۔۔" کہہ کر وہی بنڈل انجم نے رضوان کے ہاتھ میں تھمایا ۔ اور خود جلدی سے باورچی خانے کی طرف بڑھی ۔ مگر دروازے پر سعدیہ کو دیکھ کر ایک دم اس کا رنگ فق ہو گیا ۔۔۔

"روٹی پکاتے پکاتے تمہیں کونسے کام یاد آجاتے ہیں ۔؟" سعدیہ نے تلخ لہجے میں کہا ۔

"جی - ذرا وہاں.....!"

"بہانے بنانے کوئی تم سے سیکھے... گڈو جاگ گیا ہے۔ اس کا سوپ تیار ہو گیا ہے۔!!"

"جی باجی۔" سہمے ہوئے لہجے میں انجم نے جواب دیا...

"جلدی سے لاؤ۔ میرا عمران رو رہا ہے۔" کہہ کر وہ کمرے میں چلی گئی.....

انجم کی حالت دگرگوں ہو رہی تھی۔ رہ رہ کر رضوان کی آنکھوں کی بے بسی... اور ان کی خوابیدہ تمنائیں۔ تربوزی سوٹ کے ساتھ لپٹی یاد آ رہی تھیں۔ اس نے سوچا۔ کہ اگر یہ سب کچھ سعدیہ کو معلوم ہو گیا۔ تو وہ اسے کھڑے کھڑے نکلوا دے گی۔ پھر اس کا کہاں ٹھکانا۔؟ بیوہ ہونے کے بعد جب وہ بھائیوں کے پاس پہنچی۔ چند روز تو خیر سے گذر گئے۔ مگر پھر بھاوجوں کا راج۔ اور ان کی تلخ باتیں اور طعنے... گھر میں کوئی بیمار ہوا نہیں۔ اور ان کی زبان کھلی نہیں " اپنا گھر تو برباد کر کے آئی ہے۔ اب ہماری باری ہے۔!" انجم سنتی۔ اور خون کے گھونٹ پیتی.... آنسو ہی اس کے مونس و ہمدم رہ گئے تھے..... اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر وہ بیمار ہو گئی..... ماں نے اپنی بہن کے پاس شہر بھجوا دیا۔ خالہ کا بیٹا نعیم ایک غریب کلرک تھا..! اس کے اپنے بھی بال بچے تھے۔ ماں بہن بھائیوں کا بوجھ الگ۔!! مگر ہمدرد اور مخلص ضرور تھا... اپنی خالہ زاد بہن کی یہ حالت دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا۔ اُسے فوراً اسپتال داخل کروا دیا۔ مسلسل علاج اور دیکھ بھال سے اس کی صحت بحال ہونے لگی۔ خالہ تو اس پر بچپن سے ہی جان چھڑکتی تھی... مگر قسمت کے چکروں نے کچھ ایسا گھیرا۔ کہ یہ چاند

اس کے گھر میں طلوع ہوتے ہوتے۔ اس کے باپ کے رشتہ داروں کے گھر نکل آیا۔ بہنوں میں بول چال بھی ختم ہو گئی۔ اس نے اپنے نعیم کی نسبت ایک اچھے شریف مگر غریب گھرانے میں طے کر دی۔ اور اس طرح جمیلہ اس کی بہو بن کر اس کے گھر آ گئی۔ اب پھر قدرت نے انجم کو اس کے گھر لا ڈالا۔ مگر کس حالت میں۔۔؟ یہ اس کی بے پرواہیاں ہیں۔!!

انجم کی صحت جب بحال ہوئی۔ تو اس نے اپنے یہاں بھی گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ خوددار تو تھی ہی۔۔ یہاں بھی خود کو ایک بوجھ سمجھا۔ اپنے مستقبل سے وہ تقریباً نا امید ہو چکی تھی۔ بھائیوں پر مزید بوجھ بننا نہیں چاہتی تھی۔ زندہ رہنے کے لئے کچھ تقاضے بھی ہوتے ہیں۔ ایک دن اس نے دبے دبے لفظوں میں خالہ کے سامنے اپنا مدعا پیش کر دیا۔ کہ کسی شریف گھر میں اسے ملازمت دلوا دے۔ پڑھی لکھی تو ہے نہیں۔ کہ کوئی معزز ملازمت کر لیتی۔۔۔ رابعہ بیگم کو رضوان کی امّی کا خیال آیا بھی۔ مگر پھر دور کی رشتہ داری کا سوچ کر چپ ہو رہی۔ کہ انسان غیروں کے گھر ملازمت کرے تو خودی کو ٹھیس نہیں پہنچتی۔ مگر اپنوں کے ہاں جانے کا کون حوصلہ لے کر آئے۔۔؟ دن گذرتے رہے۔ انجم حالات کی چکی میں پستی رہی۔ آخر کار اس نے خالہ رابعہ کو پھر رضامند کر کے۔ رضوان کے گھر بھیجا۔۔۔ اتفاق سے انہیں بچے کی نگہداشت کے لئے کسی ذمہ دار لڑکی کی ضرورت پڑی۔۔۔ اور اس طرح انجم نے سبھوں کے سینے پر سے سل اٹھا دی۔ شروع شروع میں گاؤں سے اس کی بھاوجوں نے طنزوں کے تیر برسائے۔ ایک آدھ بھائی تسلیوں پر سے مٹی بھی جھاڑنے آیا۔۔۔ مگر انجم نے یہ کہہ کر۔ کہ ایک تو اپنے ہیں۔ دوسرے غم کا بوجھ

سینے پر رکھ رکھ کر بیمار ہو گئی ہو۔ امیر الکم از کم اس طرح غم تو بہلا رہے گا۔ سبھوں کو مطمئن کر دیا۔ یہاں آکر اسے شروع شروع میں اجنبیت کا احساس ضرور ہوا ۔۔۔ کچھ سعدیہ کی بیماری۔ کچھ رضوان کی پریشانی ۔۔۔ مگر آہستہ آہستہ انسان اپنے ماحول سے مانوس ہو ہی جاتا ہے۔ شریف گھرانا پاکر انجم خدا کا شکر بجا لائی۔ اور اس طرح اس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ مگر اب حالات اسے جس موڑ پر لا رہے تھے۔ اس نے اسے عجیب سی کشمکش و پیچ میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں غرق تھی ۔۔۔ کہ سعدیہ کی زہر بست آواز سنائی دی ۔۔۔۔

"انجم آج کل تم کافی اونچا سننے لگ گئی ہو۔ کب سے گڑ گڑا کان ہو رہا ہے تمہیں کچھ سنائی ہی نہیں دیتا۔!"

"سعدی اتنا اونچا نہیں بولتے۔ وہ بھی تو انسان ہے۔ صبح سے شام تک گدھے کی طرح کام کرتی رہتی ہے۔!"

"رضوان تم آج کل اس کی بہت حمایت کرتے ہو۔" سعدیہ نے براہ راست چوٹ کرتے ہوئے کہا ۔۔۔

رضوان حیران ۔ ہکا بکا رہ گیا۔ کہ جو عورت ہوش و خرد سے خود کو بیگانہ ظاہر کرتی رہی ۔۔۔ وہ کتنی عمیق گہرائی سے اس گھر کے ماحول کا جائزہ لے رہی ہے۔ اس نے ایک دم بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا ۔۔۔

"سعدی تم غلط سمجھی ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں ۔۔۔!"

کہ اتنے میں انجم سر جھکائے سوپ کا پیالہ تھامے آہستگی سے چلی آ رہی تھی۔

"شکر ہے تمہیں گڈو کا کچھ خیال تو آیا۔؟" سعدی نے طنزیہ کہا۔

"باجی آئندہ آپ کو شکایت کا موقعہ نہیں ملے گا۔" اس نے سر جھکائے جھکائے ندامت سے کہا۔

رضوان اسے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اس نے خاص طور پہ حزن و ملال کے آثار دیکھے تو وہ پھر بے چین ہو اٹھا۔۔۔

"آپ کے لئے کھانا لگا دوں۔؟"

"جی نہیں چاہ رہا۔" رضوان نے برجستہ جواب دیا۔۔ انجم نے بے ساختہ پلکیں اٹھائیں۔ اور گرائیں۔ رضوان کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ انجم روتی رہی ہے۔۔۔

"انجم تم کھانا لگاؤ۔ یہ ہمیشہ یونہی کہتے رہتے ہیں۔"

اور انجم خاموشی سے سر جھکائے آہستہ آہستہ قدموں سے باہر نکل گئی۔۔۔۔

رضوان انجم کے رویے سے ناراض تھا۔ اس نے صرف سعدی کا دل رکھنے کی خاطر ایک دو لقمے اٹھائے تھے۔۔۔۔ انجم باہر کھڑکی سے لگی رضوان کی بے دلی کا مظاہرہ دیکھ رہی تھی۔۔۔۔

"مالک جو تم چاہتے ہو۔ وہ میں کیسے کروں۔؟"

وہ سسک اٹھی۔ اور سیدھی اپنے کمرے میں گئی اور دھم سے اپنے بستر پر اوندھی ہو کر تڑپنے لگی۔۔۔۔ زندگی کس موڑ پہ لانا چاہتی ہے۔؟ سوچ سوچ کر اس کا دماغ ماؤف ہوتا رہا۔۔۔ کہ اتنے میں آہستگی سے کسی نے سرگوشی کی۔

"انجم کیوں رو رہی ہو۔؟"

"مالک -" کہتے کہتے انجم کی آواز رندھ گئی - اور وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی - متورم آنکھیں اور زیادہ پیاری نظر آ رہی تھیں . . . . آنسوؤں سے تر شہابی چہرہ اتنا حسین لگا . . . جیسے کسی صبح کے نوشگفتہ گلاب پر بے شمار شبنم کے قطرے پڑے ہوں . . . . رضوان کا جی چاہا - کہ وہ ایک بار دنیا کے تمام بندھن توڑ کر ان شبنمی قطروں کو اپنے رومال میں جذب کر لے . . . مگر ہوش و خرد نے خبردار کیا " یہ لڑکی کسی کی امانت ہے . . . سنبھل جاؤ -"

رضوان اسے مجبورانہ انداز سے دیکھے جا رہا تھا . . . اس کا جی چاہا . . . کہ ایک بار وقت کی نبضیں تھم جائیں - اور وہ اسے جی بھر کے دیکھ سکے . . .

"مالک آپ نے کھانا کیوں نہیں کھایا -؟" انجم نے کانپتی پلکوں کو دھیرے سے اٹھاتے ہوئے کہا -

"تم میری دی ہوئی چیز کو لوٹا سکتی ہو - تو میں تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کیسے کھاؤں —؟"

"مالک آپ میری مجبوریوں کو کیوں نہیں سمجھتے -" اور ایک دم آنکھوں سے آنسوؤں کی ندی بہہ نکلی . . . .

"کیا تم اس گھر کا فرد نہیں -؟ کیا تم گڈو کی ماں نہیں . . . ایک دم رضوان کے لہجے میں ہچکچاہٹ پیدا ہو گئی اور وضاحت کرتے ہوئے بولے . . .

"کیا تم نے گڈو کو دل و جان سے نہیں پالا -؟ کیا تمہارا اس گھر میں کوئی حق نہیں؟ ساری ساری رات جب سعدیہ کی طبیعت خراب ہوتی تھی تو تم نے آنکھوں میں رات نہیں کاٹی —؟"

"مالک سب کچھ ٹھیک ہے۔۔۔۔ مگر میں اس گھر کی ایک ادنیٰ خدمت گار ہوں یہ مجھے معلوم ہے۔" انجم کے ہونٹوں پر ایک جلتی مسکراہٹ نظر آئی۔

"خدمت گار مت کہو خدارا۔۔۔۔ تم میری عزیز پہلے ہو۔ اور بعد میں کوئی اور رشتہ ہوگا۔" رضوان کے لہجے میں شرمندگی عنصر صاف نظر آ رہا تھا۔

"مالک!۔۔۔ آپ میرے مالک ہیں۔۔۔۔ میں آپ کی کسی بات کو رد تو نہیں کر سکتی۔۔۔ جھٹلانے کی بھی طاقت نہیں۔۔۔۔۔ مگر اتنا کہہ لینے دیجئے کہ رشتہ داری میں شرط وضع داری ہوتی ہے۔۔۔ جو وضع داری کو نبھا نہ سکا۔۔۔ اسے اس کے منہ پر آپ اجنبی بھی کہہ سکتے ہیں۔۔۔۔ ہم آپ کی امّی کے رشتے کی ماموں زاد بہن کی اولاد ہیں۔ مگر غریب ہیں۔ اور ناداری نے ہمیں مجبور کر دیا تھا کہ سب رشتہ داروں سے منہ چھپا کر دیہات کے کسی گوشے میں پناہ گزیں ہو جائیں۔۔۔ وہاں شادیاں بھی ہوئیں۔ بربادیاں بھی ہوئیں۔ مگر یہ کیسی رشتہ داری تھی کہ کسی نے کبھی جھانک کر بھی نہ دیکھا کہ کس حال میں ہو۔ آپ کو آیا کی ضرورت تھی۔ اور مجھے با عزت زندگی گذارنے کی تمنّا۔ آپ کی ضرورت۔ اور میری مجبوری نے مجھے آپ کے قدموں میں لا ڈالا۔۔۔ خدا کے لئے آپ سابقہ رشتہ داریاں کو بھول جایئے میں آپ کے سامنے گڈو بہارے کی آیا بن کر آئی ہوں۔ اور آیا بن کر رہوں گی۔" انجم نے زہر خند سے دل کا سارا زہر اگل دیا۔

"مجھے مزید شرمسار نہ کرو انجم۔ میں تمہیں پھر کبھی کسی بات کے لئے مجبور نہ کروں گا۔" کہہ کر رضوان تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔ اور پہروہ بہت دیر تک ملتا رہا۔۔۔ اور انجم دل کھول کر اپنی تقدیر پر آنسو بہاتی رہی۔۔۔۔۔

عاطفہ

انجم نے دیکھا رضوان کا دیا ہوا سوٹ اس کی پائنتی کی طرف بے بسی سے پڑا ہوا ہے۔۔۔ اس نے آہستگی سے اسے اٹھایا۔۔ اور گرما گرم آنسوؤں کے قطرے اس سوٹ پہ گرنے لگے۔۔ کچھ سوچ کر اس نے اسے ٹرنک میں رکھ دیا۔۔۔ اور پھر گھر کے ہنگاموں میں مصروف ہو گئی۔۔۔ اب انجم نے کچھ اس طرح اپنا وطیرہ رکھا کہ وہ رضوان سے جان بوجھ کر اپنا دامن بچاتی رہی۔۔۔ اور حتی المقدور کوشش کرتی رہی کہ اس کا سامنا نہ ہو۔۔۔ رضوان بھی کچھ ناراض ناراض یا پھر بیزار سے ہو گئے تھے۔۔ سعدیہ کی طبیعت کبھی ایک دم بگڑ جاتی۔ تو کبھی خاصی ہشاش بشاش ہو جاتی۔۔۔ گڈو کو اسکول میں داخل کروا دیا گیا تھا۔۔۔ اس کی دیکھ بھال کے لئے ایک چپڑاسی باقاعدہ رکھا گیا تھا جو اسے اسکول لے جانے رہنے آنے پر مامور تھا۔۔ جتنی دیر گڈو باہر رہتا۔۔۔ سعدیہ کی طبیعت بے قرار اور مچلی مچلی سی رہتی۔۔ جونہی گڈو گھر میں قدم رکھتا۔۔ زخمی ممتا کو سکون مل جاتا۔ اور بقیہ دیر اسے اپنی نظروں سے جدا نہ ہونے دیتی۔۔۔ ہر وقت اس پر سائے کی طرح رہتی۔ کمرے کی چار دیواری سے اسے باہر نہ نکلنے دیتی۔ کھانے پلانے میں کمی نہ آتی۔۔۔ مگر قدرت کی کھلی فضا کی پرورش کچھ اور چیز ہے۔ ہزار لاڈ پیار کے باوجود گڈو جسمانی لحاظ سے بہت کمزور تھا۔۔ پیلا پیلا چہرہ۔۔۔ اور کمزور جسامت والا یہ بچہ ماں کی زندگی بنا ہوا تھا۔ رضوان نے کئی بار اس غلط پرورش پر احتجاج کیا۔ مگر سعدیہ نے ہر بار اس احتجاج کا پرجوش جواب دیا کہ "میں ماں ہوں۔ تم سے بہتر پرورش کر سکتی ہوں۔۔۔"

ٹن۔۔۔ٹن۔۔۔ٹرن۔۔۔ٹن ٹن۔۔۔

"انجم دیکھو تو باہر کون آیا ہے۔ سعدیہ نے کنگھی ایک طرف رکھتے ہوئے کمرے سے گھنٹی کی آواز سن کر انجم کو آواز دی۔

"اچھا باجی۔" کہہ کر وہ باہر کی طرف لپکی۔۔۔ اور ایک لفافہ لے کر تقریباً بھاگتی ہوئی اندر آئی۔

"کیا بات ہے انجم۔"

"باجی تار آیا ہے۔"

"کس کا۔"

"معلوم نہیں، تار والا کہتا ہے کہ یہاں دستخط کر دو۔" انجم نے معصومیت سے ایک کاغذ پر انگلی رکھتے ہوئے بتلایا۔۔۔

"تار آیا ہے۔ الٰہی خیر۔۔" اور سعدیہ نے دھڑکتے دل سے لفافہ کھول لیا

عاطقہ

"آصف سخت بیمار ہیں جلدی پہنچو۔"

"فرحت"

سعدیہ کا رنگ ایک دم سفید پڑ گیا۔۔۔۔ قبل اس کے وہ گرتی۔۔۔۔۔ انجم نے اسے ایک دم سہارا دیا۔۔۔۔ اور پلنگ پر لٹایا۔۔۔ جلدی سے پانی میں گلوکوز ڈال کر اسے پلایا۔۔۔۔ اس کے پاؤں کے تلوے ملے۔۔۔۔ گھنٹی کی آواز بدستور آرہی تھی۔۔۔۔۔۔

ٹن۔۔۔۔ٹن۔۔۔۔ٹرن۔۔۔۔ٹن ٹن۔۔۔۔

"سعدیہ نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔۔۔۔" انجم پھر گھنٹی کی آواز آرہی ہے۔"

"باجی وہ تار والا اپنا کاغذ مانگتا ہے۔"

"یہاں لاؤ میں دستخط کر دوں۔"

اور اس نے کانپتے ہاتھوں سے دستخط کر دیئے۔۔" باجی کس کا تار آیا ہے۔" انجم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔۔۔۔

"میرے بھیا کا۔"

"کیا لکھا ہے۔ خیریت تو ہے نا۔"

"وہ سخت بیمار ہیں۔" سعدیہ نے نحیف آواز میں کہا۔

"اللہ تعالے انہیں زندگی دے۔۔۔۔ صحت دے۔۔۔۔" انجم نے بھولے پن سے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہوئے کہا۔

یکایک پھر گھنٹی کی آواز سنائی دی۔۔۔۔

عاطقہ

"ادھورا کاغذ تو میرے ہاتھ میں ہی ہے۔ کیا کہتا ہوگا تار والا کس گھر آنکلا۔؟"

انجم بھاگتی ہوئی باہر نکلی.... اتفاق سے رضوان دفتر سے جلدی آگئے تھے۔

انجم ان سے ٹکرا گئی.... مگر اپنے سامنے رضوان کو پاکر ایک دم بیر بہوٹی بن گئی۔

اور گھبرگڑاتے ہوئے بولی....

"مالک معاف کر دیجئے گا.... یہ تار.... یہ کاغذ...." کچھ بے ربط سے

جملے اس کے منہ سے ادا ہوئے....

رضوان اس کی جھکتی ہوئی سانسوں کو محسوس کر کے اپنے دل و دماغ میں ایک

لطیف سی گدگدی محسوس کر رہے تھے.... کہ انجم کی آواز سنائی دی....

"مالک ذرا جلدی کیجئے۔ باجی کی طبیعت تار پڑھ کر خراب ہو گئی ہے۔"

"کس کا تار آیا ہے۔"

وہ پوچھتے رہ گئے۔ اور انجم کمرے کی طرف بھاگتی ہوئی جا چکی تھی....

رضوان لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کمرے کا دبیز آسمانی پردہ اٹھا کر اندر داخل

ہوئے۔ اور وہیں سے بے قراری سے پوچھا....

"سعدی کیسی طبیعت ہے۔؟ کس کا تار آیا ہے۔؟" ایک ہاتھ سے سعدی کی

نبض دیکھی اور دوسرے ہاتھ سے تار پڑھا.... سعدی آنکھیں بند کئے لیٹی ہوئی تھی

رنگت پر ایک دم پیلی سرسوں کا گمان ہو رہا تھا۔

"سعدی آنکھیں کھولو۔ دیکھو تمہارا رضی آیا ہوا ہے...." رضوان نے پیار

سے اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا....

"رضی.... کتنا پیارا نام ہے.... انجم نے دل میں سوچا.... کتنا چاہتے ہیں مالک اپنی بیوی کو.... خدا ان کی جوڑی سلامت رکھے.... وہ دل ہی دل میں سوچتی رہی۔ اور پھر ایک دم تیزی سے تلوے ملنے لگی....

رضوان نے نیم وا آنکھوں سے انجم کا جائزہ لیا.... وہ سر جھکائے سوچوں میں غرق تھی....

"بھیا کو دیکھنے جانا ہے۔؟" رضوان نے پوچھا۔۔

اور اثبات میں سعدیہ نے سر ہلا دیا....

"پہلے اپنی طبیعت ٹھیک کر لو۔ پھر چلیں گے.... بیماری یاری تو انسان کے ساتھ لگی رہتی ہے.... تم اپنا دل چھوٹا مت کیا کرو...." رضوان نے اس کے ہاتھوں کو پیار سے دباتے ہوئے کہا۔

"گڈو کو اسکول سے بلوا لو۔" سعدیہ نے نحیف آواز میں کہا۔

"گڈو بس ابھی آیا چاہتا ہے۔" رضوان نے اپنی کلائی کی طرف بندھی گھڑی کو دیکھ کر کہا۔

"میں ذرا ڈاکٹر رحمان کو فون کر دوں۔ تاکہ وہ تمہیں طاقت کا ایک انجکشن دے دے۔ ورنہ اتنا طویل سفر کیسے طے کرو گی۔" اس نے اٹھتے ہوئے پھر کہا....

"انجم تم ذرا جلدی سے میرا اور گڈو کا ایک اٹیچی تو تیار کر دو۔" سعدیہ نے آہستگی سے انجم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

انجم نے فوراً ایک اٹیچی خالی کی۔ اور دونوں کے کپڑے بڑی ترتیب سے رکھے

ڈاکٹر رحمان نے آکر ایک انجکشن دیا ۔ ۔ کچھ ٹانک لکھ دیں ۔ اور سانت تسلی بخش کہہ کر چلتا بنا ۔ گڈو اسکول سے آچکا تھا ۔ انجم نے اسے کھانا کھلایا ۔ اس کا منہ ہاتھ دھلایا ۔ صاف ستھرے کپڑے پہنائے ۔ ۔ ۔ ۔ اور اسے بالکل تیار کر دیا ۔ اس اثنا میں اس نے سعدیہ کو بھی تیار ہونے میں مدد دی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رضوان کی رائے میں "کہ جیپ میں چلیں گے" مگر سعدیہ کا اصرار کہ گاڑی پر چلیں گے ۔ تسلی اطمینان سے پہنچ جائیں گے ۔ پٹرول سے اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے ۔ ۔ ۔ " بالآخر رضوان کو اپنی رائے بدلنا پڑی ۔ ۔ ۔ رضوان نے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا کہ انجم تیار نہیں ہو رہی ۔ ۔ ۔ اس نے سعدیہ سے پوچھا ۔

"کیا انجم نہیں جائیں گی"

"گھر بھر اکیلا ہو جائے گا ۔ آج کل چوریاں بھی بہت ہو رہی ہیں ۔ آپ اپنے چپڑاسی کو کہہ دو کہ دن میں ایک آدھ دفعہ چکر لگا جایا کرے ۔ ۔ ۔ " سعدیہ نے اطمینان سے جواب دیا ۔

"تنہائی میں گھبرا نہ جائے" ۔ رضوان کے منہ سے بیساختہ نکلا ۔

"تو پھر آپ رہ جائیے ۔" سعدیہ نے برجستہ کہا ۔

رضوان اس براہ راست چوٹ پر تلملا گیا ۔ مگر چلنے کا وقت تھا کچھ اس کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی ۔ اس لئے خاموشی اختیار کرنی پڑی ۔ ۔ ۔ ۔ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا ۔ ۔ ۔ کہ عورت ہے نا اس لئے رشک و حسد کی آگ ہر وقت دل میں بھڑکتی رہتی ہے ۔ ۔ کہ کہیں اس کا شوہر اس کی طرف رجوع نہ ہو جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر اسے کیا معلوم ۔ ۔ کہ اس کا شوہر اس کی خدمت ، اس کے خلوص سے متاثر ہے کچھ اس کی بے بسی ۔ جوانی کی بیوگی ۔ ۔ اور

مظلومیت سے بھی متاثر تھا۔۔۔۔۔ مصلحت کا تقاضہ یہی تھا کہ بات کو خاموشی سے ختم کیا جائے۔ گاڑی کا وقت ہو چلا تھا۔ تیاری مکمل تھی۔ سعدیہ غسل خانے میں تھی۔ رضوان جلدی سے باورچی خانے کی طرف آیا۔۔۔ انجم گڈو کو دودھ پلا رہی تھی۔۔۔

"انجم دو تین دن لگ جائیں گے۔۔۔ اگر بھابی آصف کی طبیعت بہتر ہوئی تو میں بہت جلد آجاؤں گا۔۔۔۔ گھبرا تو نہ جاؤ گی۔" رضوان نے آخری فقرہ کچھ اس دلسوزی سے کہا۔۔۔ کہ اچانک انجم نے کانپتی پلکوں سے اس کی طرف دیکھا۔۔۔ ان کے ہونٹوں پر محجوب سا تبسّم۔ اور آنکھوں میں بے پناہ خلوص دیکھ کر پل بھر کے لئے وہ ساکت سی ہوگئی۔ دل کی دھڑکن نقارے کی طرح بجنے لگی۔ خون کی روانی میں ہلچل سی مچ گئی۔ چہرے پر قوس و قزح کے رنگ بکھر گئے منہ پر خون کی شرمیلی لہریں رقصاں دیکھ کر رضوان کا کچھ حوصلہ بندھا۔۔۔

"میں نے انجم کیا پوچھا ہے۔ گھبرا تو نہ جاؤ گی۔؟"

"نہیں مالک۔۔۔ تنہائی تو میرا مقدر بن چکی ہے۔ اس سے گھبرانا کیسا۔؟"

"ایسی باتیں سوچنا چھوڑ دو۔ گڈو تمہارا ساتھی ہے۔ سعدی تمہارے پاس ہے اور۔۔۔"

"مالک بی بی آرہی ہیں۔" انجم نے ان کی بات کاٹتے ہوئے فوراً کہا۔۔۔

"میں بہت جلد آجاؤں گا۔" رضوان اتنا کہہ کر آگے بڑھے۔ گڈو کی انگلی تھامی۔ اور باورچی خانے سے باہر کی طرف چل پڑے۔۔۔۔۔ انجم کی دنیا میں تہلکہ مچا کر وہ سب جا چکے تھے وہ حیرانی سے اس گھر کو دیکھ رہی تھی۔ جس میں ایک آیا کی حیثیت سے آئی۔ ارمانوں، آرزوؤں کی لاش کو اپنے دل کے اندر دفن کر کے باہر کی دنیا کو قبول کیا۔۔۔ جلال اس کا شوہر ایک خوبرو۔ تنومند۔ اور بہادر انسان تھا۔۔۔۔ جسے اس نے شوہر کے روپ میں دیکھا۔ دل و جان

سے اس کی پرستش کی۔ ابھی بہاروں کی وادی میں محو گلگشت تھی۔ زندگی کے شام و سحر کا ساحرانہ لطف اٹھا رہی تھی کہ بدنصیبیوں کے جھکڑ چلنے شروع ہوئے۔ خزاں کی اچانک آمد نے جلال کو اس سے جدا کر دیا۔ . . . وہ کسی مل میں ملازم تھا۔ اچانک مشین میں آجانے کی اس کا جلال ہمیشہ کے لئے اس سے بچھڑ گیا۔ . . . یہاں تک کہ اس کا آخری دیدار بھی نہ کرایا گیا۔ وہ زندگی بھر تڑپنے کے لئے تنہا رہ گئی۔ حالات خاموشی سے گذرتے رہے . . . دبے قدموں پھر کسی نے اس کے دل پر دستک دی . . . . . دل نے ہولے سے سرگوشی کی . . . . . کون جلال۔؟ نہیں رضوان . . . . !! یہاں رضوان کا کیا کام۔؟؟ یہ در تو جلال کے لئے کھل سکتا ہے . . . . . ایک چاند کا عکس۔ جس کی ٹھنڈی ٹھنڈی لہروں میں کوثر و تسنیم کا دھوکہ۔ خوابیدہ نیم وا۔ مستانہ سی آنکھیں۔ بھرپور مردانہ وجاہت کا جیتا جاگتا شاہکار۔ بالکل ابا لو کے مجسمے سے ملتا جلتا عکس جو دل کی دھڑکن کو بے طرح چھیڑ دیتا ہے . . . . . .

وہ سعدی سے عشق کرتا ہے۔

وہ گڈو کا باپ ہے۔

دل کے قانون نرالے۔ اس کے کان بہرے۔ اور آنکھیں اندھی ہوتی ہیں۔ وہ سعدی کا ہو۔ یا گڈو کا۔ میرا تو مالک ہے۔ جلال کے بعد دنیا کا دوسرا انسان جس نے مجھے محبت سے دیکھا . . . دلی ہمدردی سے نوازا۔ میری بے بسی پر کڑھا۔ میرے آنسوؤں پر تڑپا . . . . جو مجھے زندہ دیکھنا چاہتا ہے۔ بے لوث خلوص . . . جس میں ذرہ بھر بھی کسی لالچ یا غرض کا شائبہ نہیں۔

میں بیوہ ہوں۔

عاطفہ

غریب ہوں۔

قدرت کا تازیانہ۔

سماج کے دل پر رستا ہوا ناسور۔

بیوہ......

یہ سب کچھ سمجھتے جانتے ہوئے بھی وہ میرا کتنا خیال رکھتے ہیں.... وہ میرے محسن ہیں۔ میرے مالک ہیں.... آقا دروازے پر آئے۔ اور کواڑ بند ہوں... یہ کیسے ممکن ہے.... پگلی دل کے کواڑ کھول دے.... خزاں زدہ زندگی میں کہیں سے تو تازہ لطیف ہوا کا معطر جھونکا آنے دو۔ تمہیں بھی زندہ رہنے کا حق ہے... محبت کسی کی میراث نہیں۔ بے لوث محبت بدلے کی خواہاں نہیں ہوتی... ضروری نہیں کہ محبت وصال کے لئے تڑپے.... قربانی ایثار تو محبت کو جلا بخشتی ہے.... تو اپنے مالک کو دل میں چھپا لے۔ پھر جلدی سے کواڑ دل بند کر دے... تاکہ کوئی اس عکس کو تم سے چھین نہ سکے... چھپ چھپ کر چوری چوری اپنی پرستش کرتی رہ... زندگی میں تڑپ اور خلش مل جائے تو زندگی حسین تر ہو جاتی ہے... سکون وجود... تو موت کی آگہی دیتا ہے.... وہ تیرا مالک ہے.... وہ تیرا مالک ہے.... اس کی قدر کر۔

انجم اپنی سوچ سے چونکی۔ اپنے انوکھے خیالات کو سوچ کر اس کی روح مخمور ہو چلی زندگی پر پیار آنے لگا.... اور زندگی دینے والے پر.... نثار ہونے کو جی چاہنے لگا.. جلدی جلدی گھر کا کام کاج کیا اور دل کی لگن کے ساتھ رضوان کے کمرے کی صفائی کی۔ ہر چیز کی ترتیب بدل دی.... جس نے اس کے خیالات کے دھارے کو بدلا... اسے جینے

کے نئے ڈھنگ سکھائے۔ وہ چیزوں کی ترتیب میں اپنی نفاست دکھانے لگی ۔۔۔اس کی مسہری پر خوبصورت سفید چادر بچھائی تکیئے کے غلاف تبدیل کئے ۔۔۔ عقیدت سے اس کی تصویر کو اپنے پلو سے صاف کیا ۔۔۔ تڑپتی نگاہوں نے بھرپور عکس اس کے دل میں جمایا اس کے کپڑوں کو وارڈروب میں ترتیب سے رکھا ۔۔۔ سارے رومالوں کو دھو کر استری کر کے ترتیب سے رکھا۔ جوتے صاف ہوئے ۔ اور انہیں ریک پر سجایا ۔۔۔ گرد نہ پڑ جائے سفید کپڑا ان پر بچھایا۔ اپنے دل کی پوری تسلی کر کے کمرے کو بند کیا ۔۔۔ باقی کمرے بھی صاف کئے اس کمرے سے وہ ایک چیز چرا کر لائی تھی ۔ وہ اپنے مالک کی تصویر۔ اور ایک چیز اس کے بدلے چھوڑ کر آئی ۔ وہ اپنا ارمانوں آرزوؤں سے بھرا ہوا دل ۔!

شام ہو چلی تھی۔ آج یہ شام اسے بے حد سلونی لگی ۔۔۔۔ اس اندھیرے میں بھی اسے ایک خوابناک سحر نظر آیا۔ سردی کچھ بڑھ گئی تھی ۔۔۔ مگر محبت کی حدت نے محسوس نہ ہونے دیا وہ دبے قدموں مالک کے کمرے کی طرف بڑھی ۔ کنڈی کھولی ۔ دروازہ ذرا سی چرچراہٹ سے کھل گیا ۔۔۔ کمرے میں ہلکی روشنی و اندھیرا چھایا ہوا تھا ۔ ان کی مخصوص خوشبو کمرے کو معطر کر رہی تھی ۔۔۔۔ وہ آہستہ آہستہ عقبی دریچے کے پاس آئی ۔ خوبصورت دبیز پردہ سرکایا اور کھڑکی کھول دی ۔۔۔ ایک تیز اور شوخ جھونکا ہوا کا آیا ۔ اور اس کی زلفوں کو گستاخانہ چھیڑتا ہوا گذر گیا ۔۔۔ ایک دلنوازمسکراہٹ اس کے لبوں پر رقصاں ہوگئی ۔۔۔ اسنے ادائے بے نیازی سے اپنے دائیں ہاتھ سے اپنی زلفوں کو سنوارا ۔ شام کی بھیگی بھیگی ہوائیں کمرے میں گنگناتی چلی آ رہی تھیں ۔ انجم نے بالکل اپنے آقا کی طرح دائیں کہنی دریچے سے ٹیکی اور ہاتھوں کو ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر منہ اس پر رکھ دیا اور خود ماحول کی نغمگی میں کھو گئی ۔ جاگتے میں اسنے انجانے

کتنے ہی حسین خواب دیکھ ڈالے.... اپنی قسمت پر خود ہی رشک آنے لگا.... رات ہو رہی تھی.... بھوک بالکل ختم ہو چکی تھی۔ وہ اپنی اس متغیر حالت پر خود حیران تھی.... آہستگی سے کھڑکی بند کی۔ پردہ ٹھیک کیا۔ سوئچ آن کیا۔ آن واحد میں پورا کمرہ روشنی سے جگمگا اٹھا.... کمرے کی صفائی نفاست اور ترتیب نے اس کی شان کو دوبالا کر دیا.... وہ بڑی گہری نظروں سے ہر چیز کا معائنہ کرنے لگی۔ کچھ سوچ کر وہ رضوان کی مسہری پر بیٹھی.... مگر ایک دم چونک کر کھڑی ہو گئی.... "مالک کی مسہری ہے.... " ایک پُراسرار سی آواز نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا....

وہ گھبرائی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی.... اچانک پھر ایک آواز سنائی دی۔

"انجم گھبرا تو نہ جاؤ گی۔"

"انجم گھبرا تو نہ جاؤ گی۔" وہ آنکھیں پھاڑے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ کہ ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔

"میں بہت جلد آؤں گا۔"

"میں بہت جلد آؤں گا۔"

"کب۔ میرے مالک کب.... ؟ انجم ان راستوں پر اپنی بے قرار آنکھیں بچھائے رکھے گی۔ جن راستوں سے تم چل کر میرے پاس آؤ گے...." انجم زیرِ لب بڑبڑائی۔ اور خود ہی اپنے جواب پر شرما گئی۔

وہ رات بڑے حسین خوابوں میں گذر گئی۔ دوسرے دن بھی وہ چلتے پھرتے خوابوں

کی دنیا میں رہی۔۔۔ نہا دھو کر رضوان کا پسندیدہ رنگ فیروزی پہنا۔ جسے وہ ایک وقت غصّے سے اتار کر ٹرنک کے کسی کونے میں پھینک چکی تھی۔۔۔۔ اس سوٹ کو ٹرنک سے نکالتے وقت جانے کیوں بہت ہی مسرور تھی۔ نہا دھو کر فیروزی سوٹ پر اس کے دھلے گیلے دراز بال بہت ہی پھب رہے تھے۔۔۔۔۔ شہابی رنگت۔ شفاف آنکھیں۔۔۔۔ ان آنکھوں میں محبت کا نشہ۔۔۔ انداز میں رعنائیاں۔ اس کے قدم خود بخود آئینے کی طرف اٹھ گئے۔۔۔۔ وہ دیر تک اپنے سراپا کو دیکھتی رہی۔ اور ایک دلنواز سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل گئی۔ لمبی لمبی حسین پلکوں کا عکس اس کی صندلی رنگت اور گلابی رخساروں پر پڑ رہا تھا۔ فیروزی سوٹ کا عکس اس کے حسن کو اور دوبالا کر رہا تھا۔۔۔۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر رضوان کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی ڈریسنگ ٹیبل سے اس کا پسندیدہ پوڈر چھڑکا۔ اور اس کا پسندیدہ سینٹ لگایا۔۔۔ اس کا وجود ایک خوابناک سی خوشبو میں بس گیا۔ بیخودی سے اس نے اپنا سر اپنے کندھوں پر جھکایا۔۔۔۔ اور ایک نشیلی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ اچانک اس کی نگاہ رضوان کی تصویر پر پڑی۔۔۔۔۔

میرے مالک۔۔۔۔ یہ ہلچل۔۔۔۔ یہ اضطراب۔۔۔ یہ نئی زندگی آپ ہی کی دی ہوئی ہے۔ یہ پسندیدہ رنگ آپ کے لئے پہنا ہے۔؟ آپ ناراض تو نہیں کہ انجم نے آپ کی بغیر اجازت آپ کا پسندیدہ سینٹ اور پوڈر کیوں استعمال کیا۔؟ ان چیزوں پر میرا کوئی حق نہیں۔۔۔ وہ کارنس کے بالکل قریب پہنچ کر بے خودی میں باتیں کر رہی تھی۔۔۔ کہ ایک دم گھنٹی کی آواز سنائی دی۔۔۔۔

کون۔؟ دل نے پکارا۔۔۔ تیرا مالک۔۔۔۔!

عاطقہ

ہائے اللہ ۔ اگر وہ یہ باتیں سن لیتے ۔ ! تو میں لاج کی ماری مر ہی جاتی ۔ ۔ ۔ آج پھر تمہیں وہ اس سوٹ میں دیکھیں گے ۔ تو کیا سمجھیں گے ۔ ۔؟ دل نے سرگوشی کی ۔ ۔ ۔ ۔ وہ سب کچھ سمجھتے ہیں ۔ انہیں سمجھ جانا چاہیئے ۔

ٹن ۔ ٹن ۔ ٹرن ۔ ۔ ۔ ٹرن ۔ ۔ ۔ ٹن ۔ ۔ ۔

وہ تیز تیز قدموں سے باہر نکلی ۔ ۔ ۔ سر پر دوپٹہ حیا سے اوڑھا اور دھیمی لاج بھری آواز میں پوچھا ۔

"کون ؟"

"خاموشی ! !"

انجم نے اپنے بھیگے بالوں کو جو سامنے آ گئے تھے ۔ پیچھے ہٹاتے ہوئے پھر آہستگی سے پوچھا ۔

"کون ؟"

"بی بی جی خداداد ۔ !"

"خدا پوچھے تمہیں ۔ میرے حسین سپنے کو بکھیرنے والے ۔ ۔ ۔ اس وقت تمہارے آنے کی کیا تک تھی ۔ وہ آہستہ سے بڑبڑائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"بی بی جی کسی چیز کی ضرورت نہیں ۔ بابو صاحب جاتے ہوئے یہ مجھے کہہ گئے تھے" خداداد کی آواز سنائی دی ۔

"کسی چیز کی ضرورت نہیں ۔ ؟"

"گوشت سبزی وغیرہ نہیں منگوانا ۔ ؟"

"نہیں ۔؟"

"پھر میں چلا جاؤں ۔!"

"ہاں ۔"

"اسلام علیکم ۔"

وہ سلام کر کے جا چکا تھا ۔ ۔ ۔ انجم قدرے جھنجھلا گئی تھی ۔ اسے خیال آیا ۔ کہ کچھ نہ کچھ منگوا لینا چاہیئے تھا ۔ ۔ ۔ پھر سوچا اکیلی جان ہوں ۔ انڈے وغیرہ سے کھانا کھا لوں گی ۔ کیوں اتنا دھندا کروں ۔ دو چپاتیاں ایک انڈا اس نے اپنے لئے بنایا ۔ ۔ ۔ وہیں باورچی خانے میں بیٹھے بیٹھے کھانا کھا لیا ۔ ۔ ۔ کچھ دیر دھوپ میں بیٹھی رہی ۔ پھر لیٹ گئی ۔ اور ایسی آنکھ لگی کہ دھوپ کے سائے لمبے ہو چکے تھے ۔ ۔ ۔ شام ہو رہی تھی ۔ ۔ ۔ ہلکی ہلکی خنکی فضا میں پھیل چکی تھی ۔ ۔ ۔ وہ کمرے میں آئی ۔ بالوں کو گوندھا ۔ ۔ ۔ اور سوچنے لگی ۔ کہ ابھی کیا کام کروں ۔؟ اسے اچانک خیال آیا ۔ ۔ ۔ کہ اس کے پاس سفید لٹھا اور کچھ دھاگے موجود ہیں ۔ کیوں نہ مالک کے لئے اپنے ہاتھوں سے ایک تکیئے کا غلاف کاڑھوں ۔ ۔ ۔ اس نے سامان نکالا ۔ اور بڑے ارمانوں سے دھاگے ملا کر غلاف شروع کر دیا ۔ ۔ خلوص لگن سے بنانا شروع کیا ۔ باریک باریک دھاگے سے خوبصورت گلاب ابھرنے لگا ۔ ۔ ۔ وہ ستائش بھری نظروں سے تک رہی تھی ۔ ۔ ۔ کہ اچانک پردہ ہلا ۔ فاختئی سوٹ میں ملبوس چہرے پر ایک ساحرانہ مسکراہٹ لئے رضوان کھڑا تھا ۔ ۔ ۔"

"آپ ۔ ۔ ۔" اس کے منہ سے صرف اتنا ہی حیرت سے نکل سکا ۔

"میں اندر آ سکتا ہوں ۔؟" رضوان نے وارفتگی سے پوچھا ۔

"دروازہ تو بند تھا.... آپ کیسے آ گئے۔؟" انجم نے کھڑے ہو کر حیرت سے سوال کیا۔

"دروازہ کھلا تھا۔؟"

"کیسے۔؟" انجم کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"ایسے۔؟" رضوان نے اس کے کمرے کے دونوں دروازے کھولتے ہوئے کہا......

"میں نے تو بند کئے تھے۔" وہ آہستگی سے بڑبڑائی۔

"اب تو میں آ ہی گیا ہوں۔ کیا کوئی اعتراض ہے۔؟" رضوان نے شوخی سے کہا......

"خدا نہ کرے مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ باجی سعدیہ بھی آئی ہیں.... گڈو کہاں ہے؟" انجم نے یکے بعد دیگرے کئی سوالات کر ڈالے۔

"میرے سوا کوئی نہیں آیا۔"

"آپ اکیلے۔"

"بالکل۔؟"

"سعدیہ باجی کے بھائی کی طبیعت کیسی ہے۔؟" انجم نے اپنی پریشانی اور خوف کو قدرے چھپاتے ہوئے کہا۔

"دل کا دورہ پڑا تھا.... اب تو کچھ طبیعت بہتر ہے..."

"آپ کیوں آ گئے۔؟"

"تم جو اکیلی تھیں۔۔۔" رضوان نے بے ساختہ کہا۔

انجم کے جسم میں ایک ٹھنڈی سی لہر دوڑ گئی۔ شرمیلی مسکراہٹ کی بجائے ایک انجانہ سا خوف اس کے چہرے پر چھا گیا۔۔۔ اور وہ پریشانی کے عالم میں زمین کو اپنے انگوٹھے سے کریدنے لگی۔۔۔۔ رضوان نے فوراً اس کا خوف بھانپ لیا۔۔۔ ایک جوان لڑکی کسی جوان لڑکے کے ساتھ مشرقی ماحول میں تنہائی میں ملتے قدرتی خوف محسوس کرتی ہے۔ انجم کا خوف بھی بجا تھا۔۔۔ رضوان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔۔۔ مگر اب تو وہ ایک فاش غلطی کر ہی چکا تھا۔ گوشۂ چشم سے اس نے سہمی خوف زدہ انجم کو دیکھا۔۔۔ جو سراپا قیامت بنی اس کے سامنے پریشان پریشان سی کھڑی تھی۔ وہ اس کا پسندیدہ رنگ پہنے۔ ادائے دلنوازی سے سر جھکائے کھڑی تھی۔۔۔۔ خوف سے چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا۔ دراز چوٹی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی سامنے لہرا رہی تھی۔ اس کے صبر و شکیب کی طنابیں ٹوٹنے لگیں۔۔۔۔ اس نے خوابیدہ سی نظروں سے اسے دیکھا۔۔ مگر ایک دم اپنی شرافت اور نجابت کا خیال آتے ہی واپس مڑتے ہوئے کہا۔۔۔۔

"انجم میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ تم تکلیف مت کرنا" وہ ہلکے ہلکے قدموں سے جا چکے تھے۔ اور انجم جھلاتی نظروں سے جاتا دیکھتی رہی۔۔۔۔

"وہ کیوں آئے۔ انہیں نہیں آنا چاہیئے تھا۔۔ دنیا والے اسے کبھی نہیں چھوڑیں گے۔۔۔ وہ مقدس مریم پر الزام لگا بیٹھے۔۔۔۔ وہ تو بے چاری قسمت کی راندہ درگاہ تھی۔۔۔۔۔!! انجم خیالوں کے سراب میں بھٹکتی رہی۔۔۔۔۔ دل پریشانیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔۔۔۔ کتنی عجب بات ہے۔۔۔۔ تنہائی میں جسے وہ تڑپ تڑپ کر

پکارتی رہی۔ سامنے آتے ہی ظاہرداری کا لبادہ اوڑھنا پڑا۔ وہ شل احساسات اور دماغ ماؤف کیے ساتھ جانے کیا کچھ سوچتی رہی۔ احساس جاگ اٹھا۔ ضمیر کی آواز ابھری۔

"انجم یہ مت بھولنا۔ کہ تم کون ہو۔۔؟ اور یہاں کس لئے آئی ہو۔۔؟ تمہارا مالک آیا ہے۔ اس کی خدمت تمہارا فرض ہے۔!"

انجم بوجھل دل اور ماؤف دماغ سے باہر نکلی۔ سارے گھر کی بتیاں روشن کیں۔ باہر کے دروازے کو اچھی طرح سے بند کیا۔ باورچی خانہ کھولا۔۔۔ اور رضوان کے لئے جلدی جلدی کافی بنائی۔ ٹرے میں سب چیزیں احتیاط و ترتیب سے سجا کر آہستہ سے اس کے کمرے کا پردہ ہٹا کر داخل ہوئی۔۔۔ رضوان اپنے مخصوص انداز میں پاؤں پسارے آنکھیں موندھے۔۔ ہونٹوں پر انگلی رکھے کسی گہری سوچ میں مستغرق تھے۔ ایش ٹرے میں آدھ جلے سگریٹ سلگ رہے تھے۔ اور فضا میں ہلکا ہلکا دھواں پھیلا ہوا تھا۔

انجم نے ٹرے میز پر رکھی۔ کافی بنائی۔ اور پیالی بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مالک کافی پی لیجئے۔ تھکان دور ہو جائے گی۔"

"آں۔۔ کیا۔!" رضوان نے گمبھیر آواز میں نیم وا آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کافی۔۔۔۔!"

"انجم تم نے کیوں تکلیف کی۔ تمہارا یہی خلوص تو مجھے تڑپ بخش رہا ہے۔ میں کچھ نہیں سوچنا چاہتا۔ میں کچھ نہیں سوچ سکتا۔۔۔ خدا کے لئے تم یہاں سے چلی

جاؤ۔ میں صبح ہوتے ہی چلا جاؤں گا۔ . . . میں نے یہاں آکر بہت بڑی غلطی کی . . . تمہارا تقدس مجھے ہر حال میں عزیز ہے۔ . . . تم مجھے معاف کر دینا . . . میں چلا جاؤں گا . . . میں چلا جاؤں گا۔" رضوان بے قراری سے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرنے لگے . . .

"مالک . . . میں آپ کی ادنیٰ ملازمہ ہوں۔"

"انجم خدا کے لئے اس تصور کو ذہن سے نکال پھینکو . . . ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔" رضوان نے گھمبیر آواز میں کہا . . . .

"معاف کر دیجئے مالک . . . اگر اس بات سے آپ کو دکھ پہنچتا ہے . . . تو میں کبھی اپنی زبان سے ایسی بات نہیں نکالوں گی . . ." انجم نے سوگوار آنکھوں کو زمین بوس کرتے ہوئے کہا . . . .

"او انجم تم کتنی اچھی ہو۔ کتنی اچھی ہو۔"

"مالک کافی پیجئے . . ." انجم نے پیالی بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیا تم میرا کوئی اور نام نہیں لے سکتیں . . ." رضوان نے پیالی پکڑتے ہوئے کہا۔

"آپ بتلا دیجئے۔ میں وہی پکارا کروں گی۔" انجم نے معصومیت سے کہا۔

"رضی۔" رضوان نے مچلی ہوئی جبلت کی باگ انجم کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا

"نہیں نہیں . . . یہ نام باجی سعدیہ کا ہے . . . آپ میرے مالک ہیں . . خدا کے لئے مجھ سے میرا نام نہ چھینئے . . ."

"تم نے یہ سوٹ آج پھر کیوں پہنا۔" رضوان نے ایک دم بات پلٹتے ہوئے کہا۔

"اور کافی لیں گے۔" انجم نے بھی بات پلٹتے ہوئے کہا۔

"تم پیو ۔!"

"مجھے تو پیاس نہیں ۔!"

"تو کیا مجھے پیاس لگی ہے ۔"

"آپ تو سفر سے آئے ہیں ۔۔۔ یقیناً پیاس لگی ہوگی" انجم نے سادگی سے کہا۔

"یہ کمرہ تم نے سجایا ہے ۔؟" رضوان نے خوابیدہ سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ۔۔۔!"

"بس انجم اب تم جاکر آرام کرو ۔۔۔ بے فکر ہوکر سو رہو ۔۔۔ میں نے آکر تمہیں بہت پریشان کیا۔ اس کی معافی دے دینا ۔۔۔"

اور انجم خاموشی سے اپنے کمرے میں آگئی ۔۔۔ دروازے کو کنڈی لگاتے ہوئے اس نے سوچا ۔۔۔ مالک بہت پریشان نظر آتے ہیں ۔ جانے کیا بات ہو ۔؟ ساری رات کروٹیں لیتے دونوں کی گذر گئی۔ ایک آکر پریشان ہوا ۔۔۔ اور دوسرا اچانک پاکر ۔۔!!

دنیا والوں کی خوفناک اور تیز نظروں سے بچ کر رضوان دورے کے بہانے یہاں آتو گیا۔ مگر پھر انجم کی معصوم صورت دیکھتے ہی اُن سوالات کے جواب دینے کی ہمت اپنے دل میں نہ پائی۔ جو زمانے والے اس سے پوچھیں گے ۔ بلاوجہ معصوم انجم بدنام ہو جائے گی ۔۔۔ اس کی ذرا سی لغزش نے شکوک کو ہوا دی ۔۔۔

صبح ہوتے ہی وہ انجم کو بتلائے بغیر چلا گیا ۔۔۔ انجم بیڈ ٹی بناکر جب آہستہ سے اس کے دروازے کو ہاتھ لگاتی ہے ۔ تو وہ خاموشی سے اک ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھل جاتا ہے ۔۔۔"

عاطقہ

بستر کی شکنیں بتا رہی تھیں ۔ کہ سونے والا ساری رات بے چینی سے کروٹیں لیتا رہا ۔ ایش ٹرے کی راکھ اور بہت سی سگریٹ کی ڈبیاں اور ماچس کی بے شمار تیلیوں نے اس حقیقت کو سامنے کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ وہ ساری رات بے چین رہے ۔ انجم نے چائے آہستگی سے رکھ دی ، اور خود باہر نکل آئی ۔ صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو چلی ۔ مگر جانے والے لوٹ کر نہ آئے ۔ ۔ ۔ ۔ وہ دل گرفتہ سی رہی ۔ کہ اس کی ذات نے مالک کو پریشان اور نئے غم سے دوچار کر دیا ۔ پہلے وہ کیا کم دکھی تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جن حالات کے تحت وہ چپکے سے لوٹ گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ان حالات کو چھپانے کے لئے رات کو انجم نے ان کا کمرہ بڑی صفائی سے صاف کر دیا ۔ تاکہ کوئی ثبوت نہ مل سکے کہ کوئی بھولا بھٹکا راہی ایک شب کے لئے اپنی منزل کی طرف بڑھا تھا ۔ ۔ ۔ ۔

سیٹھ آصف سعدیہ کا اکلوتا بھائی تھا۔ اور عاطفہ اس کی اکلوتی بچی تھی.....
کامران بمشکل اس سے چھ ماہ بڑا ہوگا..... آصف کامران کی پیدائش پر مع فرحت کے
آیا تھا۔ اس وقت عاطفہ دنیا میں نہیں آئی تھی..... بہن کو بہت ہی کمزور و بیمار دیکھ کر آصف
کا دل بھر آیا۔ اور رضوان سے التجا بھی کی کہ اس کے ہمراہ سعدیہ کو روانہ کر دے... رضوان
کو تو کوئی اعتراض نہیں تھا... مگر ماں نے بھیجنے سے انکار کر دیا کہ ابھی وہ کمزور ہے۔
پھر حالات ایسے رہے کہ دوبارہ سیٹھ آصف بہن کو دیکھنے نہ آسکے..... اچانک دل
کا دورہ پڑنے سے فرحت پریشان ہوگئی اور اس نے پریشانی کے عالم میں سعدیہ کو تار
دے دیا۔ اگلے ہی روز سعدیہ مع کامران و رضوان کے جام نگر پہنچ گئی۔ ٹیکسی جب
"آصف ولا" کے سامنے کھڑی ہوئی... تو سعدیہ کسی قرآنی آیت کا ورد زیر زبان کر رہی
تھی..... رضوان نے اسے گوشۂ چشم سے دیکھا.... تو زرد زرد سی سعدیہ اسے
بڑی پیاری محسوس ہوئی..... اس نے اسے آہستہ سے پکارا۔

عاطفہ

"سعدی آصف ولا آگیا ہے۔ اترو۔!"

"الٰہی خیر۔ میرے بھیا کی خیر" بے ساختہ سعدیہ کے منہ سے نکلا۔

"تم کامران کو لے کر چلو۔ میں سامان اتروا کر آرہا ہوں...." رضوان نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"سعدی جلدی جلدی اتری... گیٹ پر آصف کا پرانا چوکیدار فضلو باوردی بیٹھا ہوا تھا.... سعدیہ کو دیکھتے ہی اس نے باادب ہو کر سلام کیا۔ سعدیہ نے فوراً پوچھا....

"بابا بھیا کی طبیعت کیسی ہے۔؟"

"بی بی جی اب تو بہت اچھی ہے......!!"

"اللہ تیرا لاکھ شکر ہے کہ میں اپنے بھائی کو صحیح سلامت دیکھوں گی..."

سعدیہ زیر لب بڑبڑائی... کامران کی انگلی پکڑے وہ آہستہ آہستہ سلیٹی بجری کی سڑک پر چلتی رہی... "آصف ولا" خوبصورت سی شہر کی کوٹھی اپنی نرالی شان سے رہنے والوں کے ذوق کی داد چاہ رہی تھی.... سعدیہ بھی مدت سالوں کے بعد بھائی کے گھر آئی تھی کوٹھی میں جابجا پھولوں کی روشیں بچھا دی گئی تھیں... نیلے پیلے کاسنی، گلابی پھول اپنی خوبصورتی اور مہک سے آنے والوں کا استقبال کر رہے تھے.... باغیچے کے وسط میں خوبصورت سا فوارہ دھیرے دھیرے اپنی پھوار چھوڑ رہا تھا.... مالی بڑی پھرتی اور چابکدستی سے گھاس کاٹنے کی مشین سے گھاس کو سنوار رہا تھا.... سفید مرمریں خوبصورت کوٹھی کا برآمدہ نظر آرہا تھا۔ چلتے چلتے سعدیہ کو ہلکا ہلکا سانس چڑھا ہوا تھا....

برآمدے کے کناروں پر خوبصورت چوکور گملے بڑے دیدہ زیب نظر آرہے تھے۔۔۔ برآمدے کی دیواروں پر منی پلانٹ کی بیلیں خوب پھیلی ہوئی تھیں۔۔۔ کمرے کا دروازہ کھلا۔۔ آپا کے ساتھ ایک خوبصورت سی گول مٹول لڑکی۔۔۔ سنہری بالوں والی۔۔ آنکھوں کی رنگت بھی سنہری سی۔۔۔ سرخ و سفید۔۔۔ سفید ریشمی گھیرے والا فراک، سرخ سوئیٹر سرخ ربن باندھے پاؤں میں سفید جرابیں اور سرخ جوتی پہنے وہ آپا کے ساتھ انگلی پکڑے برآمدے میں نمودار ہوئی۔ سعدیہ کے چہرے پر ایک دم محبت کی حدّت پیدا ہوگئی۔ اگرچہ اس نے عاطقہ کو بہت بچپن میں دیکھا تھا۔ مگر یہ سمجھتے ہوئے اسے ذرا دیر نہ لگی کہ یہی پیاری سی لڑکی اس کے بھائی کی اکلوتی بچی عاطقہ ہے۔۔۔

"امی یہ کون ہیں۔" کامران نے پوچھا

"بیٹے یہ آپ کی بہن ہیں۔۔۔" سعدیہ نے گڑیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔۔۔

آپا کی نظر سعدیہ پر پڑی۔ اور وہ وہیں سے چلائی۔۔۔۔

"بڑی باجی کامران کی امی آگئیں ہیں۔۔۔"

سعدیہ نے بے قراری سے عاطقہ کو سینے سے لگایا۔۔۔ اس کے سنہری بالوں کو پیار سے چوما۔۔۔ اس کی بھابی فرحت بھی بھاگی بھاگی باہر نکلیں۔۔۔ سعدیہ نے عاطقہ کو علیحدہ کیا۔ اور بھابی کے سینے سے لگ کر سسکنے لگی۔۔۔

"تم بہت کمزور ہوگئی ہو۔ کیا بات ہے بیمار رہی ہو۔۔۔ فرحت نے پیار سے پوچھا۔۔

"میری ممانی کیا بات ہے۔" بھیا کی سناؤ کیسی طبیعت ہے۔۔۔ خدا انہیں کبھی کچھ

نہ کرے ۔" سعدیہ نے رندھی آواز میں کہا ۔ ۔ ۔ ۔

"سعدی بہت طبیعت بگڑ گئی تھی ۔ میں گھبرا گئی ۔ اور تمہیں تار دے بیٹھی ۔

"گھبرانے کی تو بات ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا ہوا بھائی کو دیکھے ہوئے بہت عرصہ بھی گذر گیا تھا ۔"

"تمہاری تو صحت اتنی کمزور ہے ۔ میں تو تمہیں دو تین مہینے سے پہلے جانے نہ دوں گی ——"

"ارے بھابی ! کسے دو تین مہینے روکا جا رہا ہے ؟" رضوان نے ہنستے ہوئے دخل در معقولات دیتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔

"بھائی جان اسلام علیکم ۔" فرحت نے سر پر دوپٹہ اوڑھتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔

"وعلیکم اسلام ۔ بھابی کیسی طبیعت ہے بھائی جان کی ۔" عاطفہ کہاں ہے ؟"

رضوان نے ادھر ادھر متلاشی نگاہوں سے دیکھا ۔ عاطفہ نے اپنی سائیکل کے پیچھے کامران کو بٹھایا ہوا ہے اور خود بڑی تیزی سے سلیٹی بجری کی روش پر سائیکل چلا رہی ہے ۔ اس کے سنہری سنہری بال ہوا میں لہرا رہے ہیں ۔ چہرہ بالکل سرخ گلاب ہو رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ سب کی نظریں یکبارگی ان دونوں پر اٹھیں ۔ ۔ ۔ ۔ اچانک فرحت نے سعدیہ کی طرف اس وقت دیکھا ۔ جبکہ سعدیہ بھی فرحت کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ فرحت نے سعدیہ کی آنکھوں میں کئی حسرتوں کو تڑپتے دیکھا ۔ ۔ ۔ ۔ کہ اچانک رضوان کی آواز فضا کے دوش پر لہرائی ۔

"بیٹا تم سائیکل چلاؤ ۔ اور بہن کو پیچھے بٹھاؤ ۔ ۔"

عاطفہ

عاطفہ تیزی سے سائیکل انہی کی طرف لا رہی تھی۔ بالکل قریب پہنچ کر کامران نے بیچارگی سے کہا.....

"ابو یہ نہیں مانتیں۔ ۔ !"

"بیٹا آپ پیچھے بیٹھ جایئے۔ آپ کا بھائی آپ کو سیر کروائے گا۔۔"

عاطفہ نے اپنے خوبصورت سے سر کو پیار سے جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

"ہم بھائی کو خود سیر کروائیں گے" کہہ کر اس نے تیزی و جوش سے پاؤں پیڈل پر مارا.... سائیکل کے پہیوں سے بجری میں چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ اور وہ ایک جھٹکے سے روانہ ہو گئی۔ کامران کی خوشی کا اندازہ کیجئے کہ وہ سب برآمدے میں کھڑے لوگوں کو خدا حافظ کرنے کے لئے فضا میں ہاتھ لہرانے لگا۔

"بھابی چلیئے اندر چلتے ہیں۔" سعدیہ نے شال کو اپنے کندھوں پر ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"چلیئے۔" اور وہ سب دھیرے دھیرے قدموں سے اندر کی جانب بڑھے خوبصورت چپس کے فرش جو خاصے چکنے ہو رہے تھے۔ گیلری سے ہوتے ہوئے جہاں خوبصورت دو رویہ سبز بیلیں لگی ہوئی تھیں۔ رضوان انہیں بغور دیکھے جا رہے تھے۔ سعدیہ اور فرحت آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں... ایک کمرے کے قریب سب رک گئے۔ فرحت نے دھیرے سے دروازہ بڑھایا۔ ہلکے سے گلابی و سبز خوبصورت پردے کو کھسکایا... دیکھا آصف جاگ رہے ہیں۔ اس نے ہاتھ سے باقی لوگوں کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔۔

"کون۔ سعدی۔۔۔" آصف نے خوشی و حیرت کے ملے جلے جذبے

انداز میں پوچھا۔

بھائی نے محبت و گرمجوشی سے اپنی بانہیں پھیلا دیں۔۔۔

"بھیا۔۔۔ میرے آصف" کہہ کر سعدی ان کے سینے سے جا لگی۔ اور سسکنے لگی۔

آصف کے چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگا۔۔۔ رضوان جلدی سے آگے بڑھے، اور آہستگی سے سرگوشی کی۔۔۔ "سعدی بھیا بیمار ہیں۔ تمہیں اس کا احساس ہونا چاہیئے۔۔۔"

سعدی نے بے قراری سے بھائی کی طرف دیکھا۔ ان کے نحیف کمزور ہاتھوں کو یک بارگی اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ اور دھیرے سے بڑبڑائی۔

"الٰہی میری زندگی بھی میرے بھیا کو دے دے!"

"سعدی بیٹھ کر بھیا کی مزاج پرسی کرو۔۔۔" رضوان نے پھر سرگوشی کی۔۔۔

سعدیہ تھکے تھکے قدموں سے بھیا کے پاس بچھی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔۔۔

"اور رضوان تم۔" آصف نے دھیمی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے کہا۔

"بھیا کیسی طبیعت ہے؟"

"اب تو بہتر ہوں۔ کب آئے ہو؟"

"ابھی ابھی میل سے آ رہے ہیں۔"

"کامران کہاں چھوڑ آئے؟"

"اسے عاطقہ لے گئی ہے۔" فرحت نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا

"کہاں؟" آصف نے حیرانی سے پوچھا۔۔۔

"باغ کی سیر کرا رہی ہے۔ اپنے کھلونے دکھا رہی ہے۔" فرحت نے

مسکراتے ہوئے کہا۔۔

"بڑی پیاری بچی ہے۔ خدا اسے نظرِ بد سے بچائے"! رضوان نے دیوار پر لگی ایک سینری جس میں ایک ماں اپنی پوری ممتا کے جوش میں اپنے بچے کو سینے سے لگائے بیٹھی ہے..... مصوّر نے جس جانفشانی سے وہ حقیقی تاثرات جو ماں کے چہرے پر ہویدا تھے..... غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کامران کو دیکھنے کو جی چاہتا ہے"! آصف نے دھیرے سے کہا۔

"میں لا رہی ہوں دونوں کو۔"! کہہ کر فرحت آہستگی سے پردہ ہٹا کر باہر نکل گئی۔

رضوان نے دیکھا۔ سعدیہ بڑی محبت اور گرمجوشی سے بھائی کے ہاتھ کو تھامے بیٹھی ہے اس نے گردوپیش پر نگاہ ڈالی..... تو اس کمرے میں واقعی ہر چیز قیمتی اور انوکھی موجود تھی..... کمرے پر ہلکا گلابی پینٹ کیا ہوا تھا..... قیمتی ہریری گلابی پردوں نے اس کے حُسن کو اور چمکا دیا تھا..... فرش پر قیمتی دبیز سرخ ایرانی قالین اپنی شاہکاری کا نمونہ پیش کر رہا تھا..... سامنے کی دیوار پر ایک خوبصورت نمونے کا قالین جس پر ایک بھیڑیا منہ پھاڑے کھڑا تھا..... بنانے والے کی عظمت کو ظاہر کر رہا تھا..... آصف کی مسہری کھڑکی سے قدرے کچھ فاصلے پر بچھی ہوئی تھی۔ جس پر شاندار بستر بچھا ہوا ان کی امارت اور ذوق کو سراہ رہا تھا۔ رضائی کے اوپر ہلکے گلابی رنگ کی شنیل کی لمبی چوڑی چادر جس کے بارڈر پر خوبصورت گلابی ریشم سے بیلیں بنی ہوئی تھیں۔ بستر کی شان دو بالا کر رہی تھیں شنیل کا نرم و نازک تکیہ جس پر شہر کے ایک مشہور و معروف سیٹھ آصف کا سراپنے پورے وقار سے نظر آرہا تھا۔ بکھرے بکھرے سے گھنگھریالے بال..... بیماری کی وجہ سے بالکل سفید

رنگت موٹی موٹی غلافی آنکھیں جن پر قدرے ورم نظر آرہا تھا...... گلابی گلابی ڈوروں نے ان کی غلافی آنکھیں کو اور نشیلی بنا دیا تھا..... بالکل سعدیہ کی طرح پتلی سی خوبصورت سی ناک..... گلابی سے ہونٹ ۔شیو بڑھا ہوا...... کھلی سی قمیض کی آستینیں اٹھی ہوئیں ۔جن سے ان کی خوبصورت سفید کلائی کے بال ان کی مردانہ وجاہت کو دوبالا کر رہے تھے ۔ایک بازو کو وہ سر پر رکھے ہوئے تھے۔ان کے قریب ہی ایک آبنوس کی نازک سی تپائی رکھی ہوئی تھی۔جس پر ان کی دوائیاں رکھی ہوئی تھیں۔کارنس پر پیتل کے خوبصورت سے گلدان اور عاطقہ کی بڑی سی تصویر رکھی ہوئی تھی۔

ابو جانی ۔یہ والے بھائی بہت اچھے ہیں ۔" عاطقہ خوشی سے تقریباً چلاتے ہوئے اندر داخل ہوئی.....

آصف نے اپنے سر کو اٹھانے کی کوشش کی.... مگر کمزوری اتنی تھی کہ پسینے کے سفید سفید موتیوں جیسے قطرے ان کی پیشانی پر ابھر آئے ۔رضوان جلدی سے آگے بڑھے سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر بڑے خلوص سے انہیں اٹھایا ۔سعدیہ نے گاؤ تکیے کی ٹیک لگا کر بٹھا دیا.....

"کہاں ہے میرا بیٹا ۔؟" آصف نے نحیف آواز میں پوچھا

"بیٹے ماموں جان کو سلام کیجئے ۔" ! رضوان نے کامران کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ماموں جان آداب "! ننھے کامران نے ماتھے پر اپنا نازک ہاتھ رکھتے ہوئے کہا.......

"جیتے رہو میرے لال..... میرے قریب آجاؤ..... میں تمہیں ایکبار

سینے سے تو لگا لوں ...." آصف نے اپنے بازو پھیلاتے ہوئے۔

کامران بھاگ کر اپنے ماموں کے سینے سے جا لگا۔ سعدیہ کی آنکھوں سے بے طرح آنسو رواں تھے .... رضوان بھی اس سین سے بہت متاثر ہوئے۔ فرحت کی بھی آنکھیں بھیگ گئیں .....

"بس ابو اب مجھے اپنے سینے سے لگا لیجئے"! عاطفہ نے کامران کو پیچھے سے کھینچتے ہوئے کہا .....

اس پر سب دھیرے سے مسکرا دیئے .... آصف نے اپنا بایاں بازو بڑھا کر اسے بھی اپنے سینے سے چمٹا لیا ....

"تم دونوں تو میرے جگر گوشے ہو۔ اس مختصر سے خاندان کے دو چراغ۔ انہی چراغوں کی روشنی سے تو میں اپنی پشت کو روشن کرتا ہوں ...." آصف نے گھمبیر آواز میں کہا۔

"میرے بھیا۔ میرے چاند۔ آج آپ نے میری دیرینہ حسرت کو پورا کر دیا ...."

سعدیہ نے آصف کے سر کو دیوانگی سے چومتے ہوئے کہا۔

"بھابی مبارک ہو۔ آج سے میں اور آپ سمدھی بن گئے ہیں"۔ رضوان نے شوخی سے کہا .....

"بھیا خدا وہ دن جلد لائے"۔ راہین آصف کی آواز سب سے دھیمی سنائی دی ....

"فرحت بھئی! میری بہن کی خوب خاطر تواضع کرنا .... بہت دنوں کے بعد آئی ہیں۔ اب انہیں جانے نہ دینا ...."

"تمہاری بہن ہے۔ تو میری پیاری سی نند ہے۔ کیا سمجھے"

عاطفہ

"ارے بھئی کوئی ہمارا رشتہ بھی تو گنوا دیجئے" رضوان نے اپنا حق فوراً جماتے ہوئے کہا۔۔۔۔

"تم تو میری عزت میرا وقار۔ میرا غرور سبھی کچھ ہو۔۔۔" آصف کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔۔۔۔

"بھیا دل چھوٹا نہ کیجئے۔ خدا آپ کو بہت جلد شفایاب کرے گا۔ پھر ہم سب وادی کاغان کی سیر کو چلیں گے۔۔۔ رضوان نے باتوں کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔۔۔

اور اس طرح بچھڑے ہوئے مل گئے۔۔۔ فرحت نے دل کھول کر ان کی خاطر مدارات کی۔۔۔ عاطفہ اور کامران تو ایسے مل گئے۔ جیسے جنم جنم سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔۔۔

وہ رات رضوان نے بڑی بے چینی سے کاٹی تھی۔ رہ رہ کر بدنصیب انجم کا خیال آتا رہا۔ کہ وہ تنہائی سے گھبرا نہ گئی ہو۔ ساری رات کروٹیں لیتے گذر گئی۔ وہ حیران تھے کہ انجم سے انہیں اتنی گہری ہمدردی کیوں ہو گئی ہے۔ اب اس کی ذرا ذرا سی تکلیف و دکھ وہ کیوں محسوس کرنے لگے ہیں۔۔۔۔ خیالوں میں اس کے تصور کے سوا کسی اور کا نقشہ کیوں نہیں جمتا۔ رات بھر پریشان رہ کر فیصلہ کر لیا کہ صبح دورے کا بہانہ کر کے دو ایک روز کے لئے انجم کے پاس ضرور پہنچ جائیں گے۔ اور اگلے روز بہت منع کرنے کے باوجود رضوان نے بہانے کے مطابق کہ یہاں سے نوّے میل کی دوری پر ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ اگلے روز تک ضرور پہنچ جاؤں گا۔۔

سعدیہ کی آنکھوں میں بے اطمینانی اور شکوک جھلکنے لگے۔ مگر نوکر نے آ کر تصدیق کر دی کہ بابو صاحب روپ نگر کی بس میں بیٹھ کر چلے گئے ہیں۔ وہاں رضوان نے فیض نگر سے

ایک دوسری بس تبدیل کی۔ اور سیدھا چاند نگر انجم کے پاس پہنچ گئے۔۔۔ مگر وہاں پہنچ کر اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ساری رات تڑپتے گذر گئی۔ اور اگلی صبح اپنی غلطی کا خمیازہ بھگتنے کے لئے واپس جام نگر بھو کے پاس سے روانہ ہو گئے۔ راستے بھر رہ رہ کر یہ خیال ستاتا رہا کہ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہئیے تھا۔۔۔ انجم ایک جوان بیوہ ہے۔۔۔ ہر کسی کی نگاہ میں اس کا آنا اس کی عزت اس کے وقار کو ذلتوں میں دھکیل سکتا۔ وہ ایک معصوم لڑکی ہے۔۔۔۔ کس کس کو جواب دیتی پھرے گی "کہ مالک کیوں آیا" کتنے تقدس سے وہ میرا نام لیتی ہے۔ مالک۔۔۔ مالک۔۔۔۔ رضوان انہی سوچوں میں غرق بیٹھے رہے۔ بس چلتی رہی۔ مسافر اترتے چڑھتے رہے۔۔۔ اور وہ اپنی دنیا میں کھوئے رہے۔۔۔ یہاں تک کہ جام نگر آگیا۔۔ ساری رات کی پریشانی۔ اور جاگنے سے رضوان کا چہرہ اترا اترا سا صاف نظر آرہا تھا۔۔۔۔ وہ کھوئے کھوئے قدموں سے "آصف ولا" میں داخل ہوئے۔۔۔ تو دیکھا کہ باغیچے میں بید کی کرسیاں بچھی ہوئی ہیں۔ زمستان کی چمکیلی دھوپ نے سبزے کو رونق بخش رکھی ہے۔۔۔۔ ارد گرد کاسنی اور پیلے پھول کھلے ہیں۔ فوارے سے ہلکا ہلکا پانی پھوار کی صورت میں سبزے پر گر رہا ہے۔۔۔۔ فرحت سعدیہ بچوں کے گرد کھڑی ہیں۔۔۔ کہ اچانک عاطقہ کی نگاہ ان پر پڑی۔ اور وہ وہیں سے چلائی۔۔۔۔

"آہا۔ پھوپھا جان آگئے۔۔۔ آگئے" اور وہ خوشی سے تالیاں بجانے لگی۔

کامران تیزی سے بھاگا۔ اور باپ کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

سعدیہ کے دل میں جو شکوک جنم لے رہے تھے۔ اس وقت رضوان کو دیکھ کر ایک دم مٹ گئے۔

عاطقہ

"آ گئے آپ۔"

"ہاں سعدی... بھائی جان کی طبیعت کیسی ہے۔" اس نے اپنے بالوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"اب تو بہت بہتر ہیں۔ چلئے آرام کیجئے۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے" سعدیہ نے پیار سے سرزنش کرتے ہوئے کہا...

"یہ کون ہے؟" رضوان نے ایک غریب سے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا...

"کوئی بھیک منگا ہے" فرحت نے حقارت سے کہا۔

"ہاں کسی ماں کا لعل ضرور ہے"!

"ارے سعدیہ مجھے تمہاری یہ ہمدردی بالکل پسند نہیں... جب سے اس بھیک منگے کو دیکھا ہے۔ صدقے قربان ہوئی جا رہی ہیں"۔ فرحت نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"بھابی خدا جانے مجھے یہ بچہ کیوں پیارا لگا ہے دیکھو نا۔ کپڑے کیسے پھٹے پرانے ہیں اور صورت چاند کو شرما رہی ہے...."

"شاید اسی کو گدڑی کا لعل کہتے ہیں" رضوان نے سعدیہ کا جملہ پورا کرتے ہوئے کہا...

"چلو کچھ خیرات دے کر اسے چلتا کرو.... آج کل بھیک منگوں نے گھر لوٹنے کے اور بھی بہت سے جدید طریقے ایجاد کر لئے ہیں" رضوان نے اس

سے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا۔۔۔

فرحت نے اس کے ہاتھ پر دونی رکھی اور تیز آواز میں کہا۔۔۔ "بس اب بھاگ جاؤ۔ پھر مت آنا۔۔۔

لڑکا دھیرے دھیرے قدموں سے گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔۔۔ وہ پیچھے مڑ مڑ کر حسرت بھری نظروں سے عاطفہ اور کامران کو دیکھ رہا تھا۔ جو ایک خوبصورت بال سے کھیل رہے تھے۔۔۔

فرحت رضوان اور سعدیہ کمرے میں چلے گئے۔۔۔ وہ لڑکا وہیں گیٹ کے پاس رک گیا۔ انہیں جاتا دیکھ کر وہ پھر حوصلہ کر کے قریب آیا۔

"کھیلو گے۔؟" عاطفہ نے پیار سے پوچھا۔۔۔

"مجھے کھیلنا نہیں آتا۔" اس نے بے ساختہ کہا۔۔۔

"ہم تمہیں سکھا دیں گے۔!" عاطفہ نے شان سے کہا۔۔۔

"پھر کھیلوں گا۔!"

"تمہارا نام کیا ہے؟" کامران نے پوچھا

"گل خان!" اس نے بھولا سا منہ بنا کر کہا۔۔۔

"بہت اچھا نام ہے۔۔۔ میرا نام عاطفہ۔ اور ان کا نام عمران ہے۔۔۔!" عاطفہ نے کامران کے سینے پر انگلی رکھ کر تعارف کروایا۔۔۔

"کیا نام بتلایا اپنا۔ تم نے!" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"عاطفہ۔!" عاطفہ نے پیار سے منہ کھول کر بتلایا۔

"بھئی تمہارا نام بہت مشکل ہے۔ ۔ ۔ میں تو تمہیں عطی کہوں گا۔" گل خاں نے ایک دم پیار سے مانوس ہوتے ہوئے کہا۔

"عطی۔ ۔؟" عاطفہ نے حیرانی سے پوچھا

"ہاں عطی۔ ۔ ۔ ۔ کیوں اچھا لگا ہے یہ نام۔؟" گل خاں نے اس سے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"بہت اچھا۔ ۔ ۔ کامران تو مجھے بے بی کہتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ابو امی۔ ۔ ۔ پھوپھی جان سبھی مجھے بے بی کہتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم نے بڑا اچھا کیا۔ جو مجھے بے بی نہیں کہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"بے بی چلو کھیلو۔ ورنہ میں چلا جاؤں گا۔!" کامران نے بیزار ہوتے ہوئے کہا۔

"چلے جاؤ۔ تمہارے بڑے نخرے ہیں۔ ہم تو گل کے ساتھ کھیلیں گے۔" عاطفہ نے بھی غصے سے جواب دیا۔

"دیکھیں گے گل تمہارے ساتھ کب تک کھیلتا ہے۔؟" یہ کہہ کر کامران غصے سے پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا۔ ۔ ۔ ۔ عاطفہ پیار و خلوص سے گل خاں کو کھیل سکھاتی رہی۔ دونوں بال پکڑتے رہے۔ کہ اچانک گل خاں نے کہا۔

"عطی۔ میں کل پھر ضرور آجاؤں گا۔ آج مجھے دیر ہو گئی ہے۔ ۔ ۔ ۔ اور بابا میری پٹائی کریں گے۔ ۔!"

"تمہارا گھر کہاں ہے۔؟"

"میرا گھر دور۔ شہر کے باہر ایک جھونپڑی میں ہے۔ ۔" گل نے حیرت سے اس کی کوٹھی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ۔ ۔ ۔

"ایسا نہیں ہے تمہارا گھر۔؟"

"اوں ہونہہ۔" گل خاں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"میرا گھر تو بہت چھوٹا ہے۔ تمہارا تو اتنا بڑا ہے۔۔" گل خاں نے اپنے بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔۔۔۔

"ارے یہ تمہارے بازوؤں پر کس قسم کے نشان ہیں" عاطقہ نے حیرانی سے پوچھا۔۔۔

"مار کے" گل خاں نے اُداس ہوتے ہوئے کہا

"کیا تم شرارت کرتے ہو۔" امی کہتی ہیں جو بچہ شرارتی ہوتا ہے۔ اس کی پٹائی ہوتی ہے۔۔"

"نہیں عطی میں بالکل شرارت نہیں کرتا۔ میرے بابا بہت ظالم ہیں۔ ہم صبح سے شام تک خیرات مانگتے ہیں۔ اگر کسی شام خیرات کم لے کر جائیں۔ تو بابا ایک موٹے سے ڈنڈے کے ساتھ خوب پٹائی کرتے ہیں" گل خاں کی نظروں سے خوف جھلکنے لگا۔۔۔۔

"تو کیا تم اسکول نہیں پڑھتے؟"

"نہیں۔"

"خیرات مانگتے ہو۔"

"ہاں"

"یہ تو بہت بڑی بات ہے۔۔۔ ہم تم سے نہیں بولیں گے" عاطقہ

نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"ہاں عطی مجھے خود خیرات مانگتے ہوئے بڑی شرم محسوس ہوتی ہے۔ کیا کروں مار کھا کھا کر بابا سے بڑا ڈر لگنے لگا ہے۔!"

"کیا تمہارے بابا جن ہیں۔ جن سے تمہیں ڈر لگتا ہے۔ میرے ابّو تو بہت پیارے ہیں۔ مجھے تو ان سے کبھی ڈر نہیں لگا۔" عاطقہ نے پیار سے اپنے ابّو کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔۔۔

فرحت برآمدے میں کھڑی عاطقہ کو آوازیں دے رہی تھی۔ گل خان کی نظروں میں ایک دم بے بسی و خوف کے سائے لہرانے لگے۔۔۔۔ پتھر پر رکھی ہوئی دونی کو جلدی سے مٹھی میں دبا لیا۔ اور آہستگی سے کہا۔ "عطی میں کل پھر آؤں گا!"

"خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" کہہ کر عاطقہ بھاگتی ہوئی ماں سے لپٹ گئی۔۔۔۔

"یہ بھیک منگا ابھی تک کھڑا ہے۔"

"امی بہت اچھا لڑکا ہے۔ کامران بھیا تو بار بار روٹھتے ہیں۔ وہ ذرا بھی نہیں روٹھتا۔"

"عاطقہ۔ آج کے بعد کبھی اس لڑکے سے بات مت کرنا۔۔۔ یہ بہت گندے لوگ ہوتے ہیں۔" ماں نے ڈانٹ پلائی۔۔۔

دن گذرتے رہے۔ بھیک منگا برابر آتا رہا۔۔۔ ہزار گھرکیوں کے باوجود وہ گیٹ کے پیچھے چھپ کر بیٹھ جاتا۔ عطی سے دو چار باتیں کر کے چلا جاتا۔۔۔ ایک

دن پھر اسی طرح وہ عاطفہ کو اس کے سائیکل پر بٹھائے تیزی سے سیر کروا رہا تھا۔ کہ فرحت نے اسے دیکھ لیا۔ . . . وہ آگ بگولا سی ہو گئی۔ آگے بڑھ کر اپنی پوری قوت سے اس نے اس کے گالوں پر طمانچے رسید کر دیئے۔

"واہ رے بھیک منگے۔ تیری یہ شان . . . پھر کبھی اس کوٹھی کا رخ نہ کرنا۔ ورنہ تیرا خون پی جاؤں گی۔ . . . اترو نیچے" یہ کہہ کر ایک اور زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا۔ . . . کہ اچانک سعدیہ کمرے سے باہر نکلی . . .

"بھابی خدا کے لئے یہ ظلم نہ کرو۔ بچہ ہی تو ہے . . ."!

"سعدیہ یہ اپنی حیثیت بھول گیا ہے . . . ."!

"بھابی آخر تو بچہ ہے نا۔"! سعدیہ نے بسورتے ہوئے گل کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"پھوپھی امّی کہتی ہیں۔ یہ دوبارہ نہ آئے ورنہ خون . . ." کہہ کر عاطفہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی . . .

"عاطفہ۔ فوراً نیچے اترو۔ اور چلو اپنے کمرے میں۔ آج میں مریم کو بھی ٹھیک کر لوں گی۔ وہ کس بات کی تنخواہ لے رہی ہے"! فرحت نے اسے سائیکل سے گھسیٹتے ہوئے تقریباً اُتارا . . . .

عاطفہ روتی ہوئی کمرے میں جا رہی تھی۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتی جا رہی تھی۔ اور گل آنسو بھری آنکھوں سے اسے تک رہا تھا۔ . . . کہ سعدیہ کی میٹھی سی آواز اس نے سنی . . . ."!

عاطفہ

"تمہارے ماں باپ ہیں۔؟"

"جی۔ بی بی جی۔!"

"تمہارا گھر کہاں ہے۔؟"

"یہاں سے بہت دور ہے۔"

"تم خیرات کیوں مانگتے ہو۔"

"بابا بھی تو مانگتے ہیں۔" گل نے معصومیت سے دلیل دی۔

"کیا تم بھیک مانگنا نہیں چھوڑ سکتے۔؟"

"تو پھر ہم کھائیں گے کہاں سے۔؟" گل نے اپنی عمر سے بڑی بات کرتے ہوئے کہا۔۔۔

"سچ کہتے ہو۔ اس پیٹ نے کیا کیا پیٹے انسان سے نہ کروائے۔" یہ کہہ کر سعدیہ نے اس کی مٹھی میں ایک روپیہ دیتے ہوئے کہا۔۔۔

"لو بیٹا یہ روپیہ۔ اور سیدھے گھر چلے جانا۔ شام ہو رہی ہے۔ کہیں کھو نہ جاؤ۔ پھر تمہاری ماں کیا کرے گی۔؟" اتنا کہہ کر سعدیہ کا دبا ہوا لاوا پھوٹ نکلا۔۔۔۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔۔۔۔ کمزوری نے اسے بیحال کر دیا۔ اور وہ بیہوش ہو گئی۔۔۔

سب گھر والوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔۔۔ رضوان اپنی ڈیوٹی پر جا چکے تھے سعدیہ کو ان کے بھائی بھاوج کے اصرار پر چھوڑ گئے تھے۔ بہن کی رفاقت نے آصف کو بہت جلد اچھا کر دیا۔ اب تو وہ خود اٹھنے بیٹھنے لگے تھے۔۔۔ سعدیہ کی خوفناک حد تک کمزوری دیکھ کر وہ شہر کے چوٹی کے ڈاکٹروں کا علاج کروا رہے تھے۔۔۔ اس بیہوشی نے

اس کی حالت پھر خراب کر دی۔۔۔ اور وہ بہت پریشان سے ہو گئے۔۔۔

ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ "کہ کسی اچانک صدمے کی وجہ سے بیہوش ہو گئی ہیں۔"

آصف کی سمجھ نہ آئی کہ اچانک صدمہ کس بات کا ہو گا۔ فرحت سے پوچھا تو وہ ٹال گئی۔۔۔ مگر رات کو عاطفہ باپ کی رضائی میں گھسی۔ شام کا ایک ایک واقعہ باپ کو سنا رہی تھی کہ امی نے کس طرح اس بچے کو بیدردی سے پیٹا، اور پھوپھی اسے کس طرح پیار کر رہی تھیں۔ آصف بھی سرد آہ بھر کر رہ گئے۔ سعدیہ کو خدا نے سات سال کے بعد کتنی منتوں مرادوں کے ساتھ اولاد بخشی۔ مگر قدرت کی نیرنگی۔ کہ وہ بچہ کسی ظالم نے ماں کی گود سے جدا کر دیا۔ اگر مر جاتا۔ تو شاید صبر آ جاتا۔ مگر جیتے جی کیسے صبر کر لیتی۔۔۔ دل پر اس غم کی آنچ محسوس کرتے کرتے آج اس کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ ذرا سی سخت بات سنتی نہیں اور بیہوش ہو جاتی ہے۔ آصف بہن کا غم بٹانا چاہتے تھے۔ اس کی ہر ممکن طریقے سے دل جوئی کرنا چاہتے تھے۔ مگر وہ زخم جس کی جڑیں روح تک اتر گئی تھیں۔ اسے مندمل کرنا ان کے بس میں نہ تھا۔۔۔ سعدیہ کی صحت اچھی ہونے کی بجائے دن بدن گرتی ہی جا رہی تھی۔

"بابا عظمیٰ کہاں ہے . . . ؟" گل خان نے گیٹ پر بیٹھے چوکیدار سے پوچھا . . . ."

"بیمار ہیں —" "کب سے —؟"

"کل رات سے بے بی کو سخت بخار چڑھا ہوا ہے"

"بابا کیا میں اندر جا سکتا ہوں . . . ؟" گل خان نے منت کرتے ہوئے پوچھا

"بیٹا اندر غریبوں کا کیا کام . . . . ؟ تم اتنا ہی شکر کرو کہ بے بی تمہارے ساتھ کھیل لیتی ہے . . . ورنہ امیروں کے دماغ تو بچپن سے ہی بگڑے ہوتے ہیں . . . ."

"بابا خدا کے لئے مجھے عظمیٰ کا کمرہ دکھا دیجئے ۔ میں صرف ایک جھلک دیکھ کر آجاؤں گا . . . ورنہ وہ کیا سوچے گی . . . کہ گل خان میں انسانیت نہیں

کھیلنے کے لئے تو ہر روز آجایا کرتا تھا اور بیماری میں ایک دن بھی نہ پوچھا.... !"
گل خان نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

فضلو بابا گل خان کی بھولی بھالی صورت اور نیک صورت کو بخوبی سمجھتے تھے۔ وہ کئی دنوں سے آصف ولا میں آرہا تھا۔ مگر کیا مجال کہ کسی پھول کو ہاتھ لگائے یا کوئی پھل توڑے.... ؟ یا کسی کھانے پینے کی اور چیز کو دیکھے۔ بچہ تو وہ غریب بھکاری کا تھا۔ مگر طبیعت عجیب و غریب لے کر وہ اس دنیا میں آیا تھا اسے معلوم تھا کہ بے بی اسے بہت پسند کرتی ہیں۔ سکول سے آتے ہی اس سے پوچھتی ہیں.... "بابا گل تو نہیں آئے" ؟

پہلے پہل فرحت اسے دیکھ کر جھنجھلا جایا کرتی تھی۔ مگر سعدیہ اور آصف کے سمجھانے پر اس کی جھنجھلاہٹ قدرے کم ہوئی۔ مگر پھر بھی وہ اس کا آنا اپنی کوٹھی پر اچھا نہیں سمجھتی تھی....

ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ موسم بھی ابر آلود تھا۔ بھیگی بھیگی سی فضاؤں نے موسم کی رنگینی کو بڑھا دیا تھا.... سعدیہ کی طبیعت آج قدرے بہتر تھی۔ پھر بھی نقاہت اس کے چہرے سے صاف نظر آرہی تھی.... زرد زرد سا چہرہ.... اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں عجب بیچارگی نظر آرہی تھی.... کامران پاس ہی ایک ننھی کرسی پر بیٹھا کوئی ڈرائنگ کر رہا تھا۔

"بیٹے بے بی کہاں ہے.... ؟"

"امی اُسے بخار ہے۔" کامران نے لمحہ بھر کے لئے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے

کہا۔۔۔!

اتنے میں پردہ ذرا سا ہلا۔۔۔ ایک ننھا منا سا سر نظر آیا۔ سعدیہ کو پہچاننے میں دیر نہ لگی کہ وہ گل ہے۔۔۔۔

"گل۔۔۔ اندر آجاؤ۔۔۔۔!" سعدیہ نے نحیف آواز میں پکارا۔

گل نے پھر بے یقینی سے تھوڑا سا سر پردے کے اندر سے نکال کر دیکھا

"بیٹے اندر آجاؤ۔۔۔ کافی دنوں سے تمہیں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اچھا ہوا کہ تم آگئے۔۔۔۔!"

گل آہستہ آہستہ قدموں سے مسہری کی طرف بڑھا۔۔۔ سعدیہ کی طرف بہت ہی مقدس نظروں سے دیکھا۔۔۔۔ اور آہستگی سے پوچھا۔

"آپ بیمار ہیں۔۔۔۔؟"

"ہاں بیٹے میں تو بہت بیمار رہی ہوں۔"

"مجھ سے تو کسی نے ذکر نہیں کیا۔۔۔۔ نہ عظمیٰ نے نہ کامران نے۔۔۔۔"

"ہمیں کیا ضرورت پڑی تھی۔۔۔۔ کہ تمہیں اپنی ماں کی بیماری کی اطلاع دیتے۔"

کامران نے سڑے لہجے میں پٹاخ سے جواب دیا۔

"نہیں بیٹے ایسی بات نہیں کرنی چاہیئے۔ گل تو بہت اچھا بچہ ہے۔"

"امی یہ خیرات مانگتا ہے۔ آپ اسے اچھا بچہ کہتی ہیں۔" کامران نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔۔۔

"کامران! آئندہ میں تمہارے منہ سے ایسی بات نہ سنوں۔"

ماں نے ڈانٹتے ہوئے کہا:

"بس امّی ہم ان سے بات نہیں کریں گے.....!

گل نے آہستگی سے سر جھکا لیا۔ اسے اُداس دیکھ کر سعدیہ بے چین ہو اُٹھی۔ اسے اپنے قریب بلایا۔ اور یکبارگی اُسے سینے سے لگالیا۔ گل بھی سسکنے لگا" امّی بھائی مجھ سے بات نہیں کریں گے۔!!

امّی کا لفظ سُن کر سعدیہ بیقرار ہو گئی....

"میرے بیٹے تمہارے ساتھ کوئی نہ بولے۔ ماں بولے گی... ماں بولے گی..."

وہ اس کے سر کو بے تحاشہ چُومنے لگیں.....

"امّی آپ کتنی اچھی ہیں.....!" گل نے ان کے مقدس ہاتھوں کو چومتے ہوئے کہا کہ اتنے میں آصف آ گئے...."

"ارے بھئی یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"بھیّا خدا جانے یہ بچہ مجھے کیوں عزیز ہے.... میرا عمران اگر ہوتا تو بالکل اسی کی عمر کا ہوتا.... اسے دیکھ کر مجھے وہ بے تحاشہ یاد آنے لگتا ہے"

"بچہ تو مجھے بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ ہماری غطی تو اس کی بڑی تعریفیں کرتی ہیں"

"آداب!" گل نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا۔ اور قدرے خوف سے پیچھے ہٹ گیا... چہرے پر ایک دم بے چارگی کے سائے سے لہرا گئے۔

"کیا نام ہے تمہارا....؟"

"گل خان....!"

"تمہارے والدین ہیں؟"

"جی سیٹھ صاحب!"

"کہاں رہتے ہو تم؟"

"بڑے نالے کے پاس جھونپڑیوں میں!"

"کیا تمہارے اور بہن بھائی ہیں؟"

"بھیّا تم تو بڑے خدا ترس اور رحمدل ہو۔ تمہارے دستر خوان پر تو دنیا جہاں کے لوگ پلتے ہیں۔ تمہارے عطیے تو یتیم خانوں میں جاتے ہیں۔ کیا اس بچّے کی زندگی تم نہیں سنوار سکتے۔۔۔ اسے اس ماحول سے نکال کر اچھے ماحول میں جگہ دیجیئے۔ یہی بچہ کل کو اچھا شہری بن کر ابھرے گا۔ خدا ہو سکتا ہے تم سے اتنا خوش ہو۔۔۔ کہ تمہیں کلّی صحت عطا فرمائے۔"

"سعدی تمہاری بات ٹھوس ہے۔ مگر تم ان لوگوں کو نہیں جانتیں۔ بہت ہی لالچی قسم کے یہ لوگ ہوتے ہیں۔ جگہ جگہ ڈیرے ڈالنا ان کا خاص رہن سہن ہے ایک شہر سے دوسرے شہر پھر پھر کر اپنا گذارا کرتے ہیں۔ بھلا وہ اپنا کماؤ بچہ ہمیں کیسے دے دیں گے!" آصف نے دھیرے دھیرے سعدیہ کو سمجھایا۔

"ہمیں ان کا کماؤ بچہ اپنے لئے تو نہیں چاہیئے۔ ہم تو اس بچّے کی زندگی بنانا چاہتے ہیں۔ اس کی عادات نیک ہیں۔ شکل وصورت ٹیکتا ہے۔ بہت ہی سنجیدہ بچہ ہے۔ بارہا اپنے منہ سے اپنے پیشے کی برائی کر چکا ہے۔۔۔"

"سعدی یہ تو ٹھیک ہے کہ بچہ اس پیشے سے بغاوت چاہتا ہے۔ مگر

تمہیں معلوم ہے کہ اپنے اپنے رسم ورواج اور پیشوں کو ٹھکرانا آسان نہیں۔۔۔۔۔"

"بھیا کیا ایسا ممکن نہیں کہ اس کے ماں باپ کا مُنہ کچھ بھر کر بند کر دیا جائے۔"

"سعدی ایسا بھی کر دیکھو۔ لالچی پھر لالچی ہوتا ہے۔۔۔۔ ہر پندرہ روز بعد گیٹ کے باہر میرا انتظار کرے گا۔"

"بھیا تم نے ایک اَن دیکھے شخص کو لالچی کیسے جانا؟"

"سعدی یہ پیشہ ہی لالچی لوگ اپناتے ہیں۔ سارا سارا دن در در مارے پھرتے ہیں۔ روٹیوں اور پیسوں سے جیبیں بھری رہتی ہیں۔ مگر ایک ہی صدا۔۔۔۔" کہ خدا کے لئے کچھ دیتے جاؤ۔ صبح سے بھوکا ہوں" گھر جا کر چاہے ان روٹیوں کو سوکھے ٹکڑوں میں پھینکنا پڑے۔۔۔۔ مگر کسی کے مُنہ سے نکالنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ہٹے کٹے سنڈے آدمی ایک بیلچہ ماریں تو زمین پھاڑ دیں۔ مگر دیکھو نا۔۔۔ کس بے شرمی سے اپنا ہاتھ بڑھا کر خیرات مانگتے ہیں۔"

"بھیا اسی برائی کو پیشِ نظر رکھ کر میں اس بچّے کی تقدیر بدلنا چاہتی ہوں۔"

"سعدی یہ تمہاری بھول ہو گی۔۔۔۔ فقیر کا بچّہ پھر فقیر ہے۔ اس کی عادت اس کی فطرت تم نہیں بدل سکتیں۔ خواہ اسے کتنا ہی بہترین ماحول کیوں نہ بخشا جائے۔"

"بھیا اس بارے میں میں آپ کی مخالفت کرتی ہوں۔۔۔ ہر انسان اچھی فطرت اور نیک عادت لے کر اس جہاں میں آتا ہے۔۔۔ جس ماحول میں وہ آنکھیں کھولے گا اسی ماحول کا رنگ اس پر چڑھے گا۔"

"تو تمہارا یہ خیال ہے کہ ایک پیشہ ور فقیر کو صحت بخش ماحول دیا جائے۔۔۔

تو وہ اپنی فطرت بدل دے گا۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

" بالکل ایسا ممکن ہے ۔ ۔ ۔ ۔ !" سعدی نے پیار سے گل خان کی طرف دیکھا جو کامران کی ڈرائنگ کو بڑی محویت سے تک رہا تھا۔

" سعدی تمہارا خیال قطعی غلط ہے ۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہماری حکومت نے انسدادِ گداگری کے لئے ہر ممکن کوشش کر دیکھی ۔ ۔ ۔ کئی ادارے قائم کئے ۔ ۔ ۔ محتاج گھر بنائے ۔ ۔ ۔ ۔ بھیک مانگنا جرم قرار دیا گیا۔ بھیک مانگتے فقیروں کو رنگے ہاتھوں پکڑا ۔ ۔ ۔ پولیس کی گاڑیوں میں بھر بھر کے جیل پہنچایا۔ اور وہاں سے انہیں محتاج گھروں یا مختلف اداروں میں بھیجا۔ لیکن چند مہینوں یا چند ہفتوں کے بعد وہی گداگر بڑی ڈھٹائی اور بے شرمی سے خیرات مانگتے نظر آئے ۔ ۔ ۔ ۔ پولیس والے نالاں ۔ ۔ ۔ اور حکومت خاموش ہو گئی ۔ ۔ ۔ ۔!"

" بھیا ایک جواری کا آپ پورا گروہ عین جوئے پر پکڑیں اور انہیں یکجا بند کر دیں ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے خیالات ۔ ۔ ۔ ۔ ان کی عادات ۔ ۔ ۔ ۔ ان کا ماحول تو یکساں رہا نا ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ پھر بھلا وہ کیسے اپنی بُری عادات سے چھٹکارا پا سکیں گے ۔ اگر ان ہی لوگوں کو کسی اچھے متقی ، پرہیزگار ، باعزت شہریوں کے پاس ایک ایک کر کے رکھا جائے ۔ تو میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ ہمارے معاشرے سے ہر قسم کی برائی کا خاتمہ ہو جائے گا ۔ گروہ یا جماعت کو توڑ دیں ۔ ۔ ۔ ۔ شیرازہ بکھر جائے گا ۔ ۔ ۔ ۔ مجمع لوگوں کو اپنے خیالات ایک دوسرے تک پہنچانے آسان ہو جاتے ہیں ۔ مگر شیرازہ بکھر جانے کے بعد خیالات بھی بکھر جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اس وقت ایک گرے ہوئے

انسان .... یا غلط راستے پر چلتے ہوئے انسان کو سہارا دینے کی ضرورت پڑتی ہے .... آپ اپنی انگلی آگے کر دیجیے۔ تا کہ گرا ہوا انسان اسے تھام کر اُٹھ کھڑا ہو.... اب آپ اس کی رہنمائی کیجیے۔ وہ یقیناً آپ کے قدموں کے نشانوں کے پیچھے چلتا رہے گا.... ہمدردی، خلوص، پیار.... باہمی یگانگت کا رشتہ قائم رکھیے.... آپ بڑے سے بڑے گناہ گار کو بھی رُلا سکتے ہیں... یہ تو ایک معصوم بچہ ہے.... اس کا ذہن تو ایک کچی دھات کی طرح ہے.... آپ جس طرح اور جس وقت چاہیں اس کچی دھات کو کار آمد بنا سکتے ہیں...."
سعدی نے اپنے چڑھتے سانس کو قابو میں کرتے ہوئے کہا۔

"سعدی خیال تمہارا ہے۔ تجربہ میں کر دیکھتا ہوں۔ اگر ناکام رہا تو زندگی میں تجربہ اور شامل ہو جائے گا۔ اگر کامیاب رہا تو یہی کامیابی ان بگڑے ہوئے انسانوں کو صحت بخش ماحول دے دے گی۔ اور یہ بھی ایک باعزت شہری بن کر معاشرے کا ایک اہم کردار بن جائیں گے۔"

"بے شک! اگر آپ جیسے صاحب ثروت لوگ اس مسئلے کو ایک تلخ مسئلہ سمجھ کر غور کریں....!" سعدی نے ہلکی سی چوٹ کرتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی! ہم تو حاضر ہیں۔ اب تم ہی گل زماں کے باپ کو بُلوا کر کوئی آخری فیصلہ کر دیکھو....!" آصف نے دھیمی سی مسکراہٹ سے بہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھیا! میرے مان رکھنے والے بھیا.... خدا آپ کو عمر دراز عطا

فرمائیے۔ سعدی زندہ نہیں رہے گی۔ مگر اس کا کامران آپ سے زندگی بھر ایسی نوازشوں کا اُمیدوار رہے گا۔ جو آپ سعدی کی زندگی میں ماموں بن کر اُسے دیتے رہے ؛؛ سعدیہ کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔

" سعدی ! (آصف نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا) خدا تمہیں صحت و زندگی دے۔ کامران تمہارے سائے تلے پروان چڑھے.... مجھے جیسے عاطقہ عزیز ہے.... ویسا ہی کامران عزیز ہے.... اور تا حیات رہے گا.... !؛

" میں پھر پُر سکون ہو کر مر جاؤں.... کہ عاطقہ میرے کامران کی زندگی بن کر میرے گھر کی چار دیواری کو جگمگائے گی...؛ سعدیہ نے آصف کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پوچھا....

" سعدی ہم دو تو بہن بھائی رہ گئے ہیں۔ اور اتفاق سے دونوں اکلوتی اولادوں کے مالک ہیں۔ کیا ہم اپنے اس آخری رشتے کو ایک گرہ میں نہیں باندھیں گے.... میرا تو شروع سے ہی خیال تھا.... مگر لڑکی کا باپ ہو کر کچھ جھجک مانع رہی.... !؛

" عاطقہ آپ کی نہیں.... میری بچی ہے۔ کامران آپ کا ہے۔ اور اس کا خیال آپ نے زندگی کے ہر موڑ پر کرنا ہے.... اگر میں آپ کے درمیان نہ بھی رہی تو میری یہ نشانی ہر دم آپ کو میری یاد دلاتی رہے گی !؛ سعدیہ نے گھمبیر آواز میں کہا.... !؛

"سعدی ایسا نہ کہو۔ خدارا ۔ ۔ ۔ ۔ میرا دل ڈوبتا ہے۔ تم زندہ اور ہمیشہ زندہ رہو گی۔ کامران میرا بچہ ہے۔ اس کا وعدہ میں تم سے کرتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔" آصف نے پیار سے بہن کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"وعدہ رہا نا ۔ ۔ ۔ ۔" سعدی نے بھائی کا ہاتھ دباتے ہوئے دوبارہ اقرار چاہا ۔ ۔ ۔ ۔"

"وعدہ رہا ۔ ۔ ۔ ۔ پکا وعدہ ۔ ۔ ۔ ۔" آصف نے جلدی سے کہا ۔ ۔ ۔ ۔"

"اگر میرا وعدہ زندگی کے کسی موڑ پر توڑا ۔ ۔ ۔ ۔ تو روزِ قیامت آپ کا گریبان اور میرا ہاتھ ہو گا۔" سعدیہ کے چہرے پر بلا کی زردی چھا گئی۔

"سعدی کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ۔ ۔ ۔ ۔؟"

"بھیا آپ تو میرا ایمان ہیں۔ مگر بعض اوقات انسان حالات سے بھی مجبور ہو جاتا ہے۔"

"مجھے دنیا کی کوئی مجبوری ۔ ۔ ۔ ۔ میرے وعدے کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی ۔ ۔ ۔ ۔"

گل خان اُٹھ کر جانے لگا ۔ ۔ ۔ ۔ تو آصف نے آواز دی ۔ ۔ ۔ ۔

"بیٹے ذرا یہاں تو آؤ ۔ ۔ ۔ ۔!"

"بھیا خدا کے لیے اس بچے سے بھی وہی سلوک کرنا۔ جو اولاد والے اپنی اولاد سے کرتے ہیں۔"

"سعدی اگر قدرت اس بچے کو میرے گھر لے آئی تو میں اس کی ایسی شاندار

تعلیم و تربیت کروں گا کہ یہ اپنے ماضی کی زندگی کو یکسر بھول جائے گا۔"

"خدا آپ کو آپ کے ارادوں میں کامیاب کرے اور اس کا ثواب آپ کو اسی دنیا میں دے!" سعدی نے بصدق خلوص دعا دی۔

"بیٹے اپنے والد سے کہو، کہ وہ مجھے آج شام آکر مل جائیں!"

"اچھا جی!" گل نے سر جھکا کر مؤدبانہ طریق سے کہا۔

"گل بیٹے ضرور اپنے ابا کو لے کر آجانا۔ ایک ضروری بات کہنی ہے!" سعدیہ نے تاکید کرتے ہوئے کہا۔ کامران بھی گل کے پیچھے جانے لگا... تو سعدیہ نے پوچھا،

"کہاں جا رہے ہو بیٹے؟"

"امی یہ کہہ رہے ہیں... کہ عاطفہ کے کمرے میں چلو...!" کامران نے پیار سے گل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا...

"جاؤ لے جاؤ... جاؤ... جاؤ بیٹے...!" آصف نے پیار سے چمکارتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں عاطفہ کے کمرے میں چلے گئے.... اس کی آیا اس کے سنہری بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ گل خان کے قدم اتنے شاندار کمرے میں آکر رک سے گئے۔ ہر طرف خوبصورت کھلونوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ شاندار شیشے کی الماریوں میں خوبصورت کھلونے... کسی کونے میں ایک شاندار لکڑی کا گھوڑا مع ساز و سامان کے....

وہ ہر چیز کو حیرت سے تک رہا تھا... کہ عاطفہ خوشی سے چلائی!

"گل تم آگئے؟"

"ہاں عطی! میں تو بہت دیر سے امّی کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔۔۔"

"کونسی امّی۔۔۔۔؟" عاطقہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"کامران کی۔۔۔۔!" گل نے دھیرے سے کہا۔۔۔۔

"اوہ پھوپھو جان۔۔۔۔ وہ تو بہت ہی اچھی ہیں۔۔۔ تم سے پیار بھی بہت کرتی ہیں۔"

"ہاں عطی۔۔۔۔ وہ تو بہت اچھی ہیں"۔۔۔۔ اور وہ حیرت سے ایک ایک الماری کے پاس جا کر کھڑا ہوتا رہا۔ پھر گھوڑے کی زین کو ہاتھ لگا کر دیکھتا رہا اس کی باگ کو کھینچتا رہا۔۔۔ اور عاطقہ اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔۔۔۔

"گل جب میں اچھی ہو جاؤں گی تو تمہیں اپنے اس گھوڑے کی سیر کراؤں گی۔۔۔"

"بے بی کو خدا جلدی اچھا کرے۔۔۔ گل تم بھی دعا کرنا۔۔۔" آیا نے اسے پیار سے لٹاتے ہوئے کہا۔۔۔۔

"میں تو رات کو بھی بہت سی دعائیں مانگتا رہا۔۔۔۔ کہ خدا میری بہن کو جلدی اچھا کر دے۔۔۔۔ تاکہ گیند کھیل سکیں۔۔۔۔ سائیکل چلا سکیں۔۔۔۔ اور!"

"اور گھوڑے سواری کر سکیں۔۔۔"، عاطقہ نے بات مکمل کر دی اور وہ دونوں کھکھلا کر ہنس دیئے۔۔۔۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ ان کی معصومیت پر جھوم اٹھا۔۔۔!

بھیگی بھیگی ہوائیں چل رہی تھیں۔ بنفشی شعاعیں پہاڑوں کے پیچھے سے نمودار ہو کر فضا میں بکھر چکی تھیں.... رضوان نائٹ گون پہنے عقبی دریچے کے پٹ کھولے ایک ادھ جلے سگریٹ کو انگلیوں میں پکڑے چہرے پر گھمبیر سی اُداسی لیے کسی گہری سوچ میں مستغرق تھے.... انجم کے چلتے پھرتے سراپے نے انہیں ایک عجیب سے درد سے واقف کروا دیا تھا۔ اس کی اداس جلتی ہوئی آنکھیں.... اس کا مایوس تبسم... ایک اندرونی کرب میں جلتا ہوا وجود.... بعض اوقات زہریلا سا تبسم... جو اس کے لبوں پر کھیلنے لگتا.... تو رضوان کو اپنا رواں رواں جلتا ہوا محسوس ہوتا!!

قدرت کا تازیانہ،

ایک جوان حسرت کا بیوہ ہونا
نئے جوش نئے ولولوں کو یکسر کچل دینا

عاطقہ

وہ بیوہ ہے۔ اور اسے زندگی کی کسی بھی رنگینی سے اس وقت تک کھیلنے کا حق حاصل نہیں۔ جب تک وہ کسی بھی طرح شرعی طور پر نکاح ثانی نہ کرلے۔ ورنہ وہ کس کس کے طعنوں کا جواب دے گی۔ کس کس کی اُٹھتی ہوئی انگلیوں کو دیکھے گی.... کس کس کی بھرپور نظروں کے تعاقب پر اپنی حیا کی چلمن گراتی جھکاتی رہے گی۔ وہ اس کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہوتے رہے۔ وہ اس کی زندگی میں بادِ بہار کی آمد دیکھنا چاہتے تھے۔ اسلام ایک جامع مذہب ہے۔ وہاں بیوہ کو شرعی طور پر صحت مند زندگی گذارنے کا حق حاصل ہے۔ مرنے والوں کے ساتھ ستی ہو جانا ایک ناجائز فعل ہے۔ جس کی اجازت اسلام نہیں دیتا۔ وہ یہ بھی محسوس کر رہے تھے کہ انجم کون سی سلگتی آنچ میں جل رہی ہے۔ گیلی لکڑی کی طرح اندر ہی اندر سُلگ رہی ہے.... وہ اس قیامت خیز طوفان سے بھی خوفزدہ تھے.... جو کسی وقت بھی ان کی شرافت نجابت.... اور انجم کے تقدس پر بجلی گرا سکتا ہے.... کیونکہ قدرتی طور پر ایک جوان بیوہ کا ایک جوان آدمی کے ساتھ رہنا ہمارے معاشرے میں معیوب سمجھا جاتا ہے.... کسی وقت بھی لوگوں کے دل میں جلتے ہوئے یہ شکوک لبوں پر آسکتے ہیں.... سعدیہ کو اس کے بھائی آصف نے زبردستی روک لیا تھا.... رضوان موجودہ حالات کے تحت سعدیہ کو ہمراہ لانا چاہتا تھا.... وہ اپنے بھٹکے ہوئے خیالوں کو کسی مضبوط سنگم پر باندھنا چاہتا تھا.... سعدیہ کی موجودگی میں یہ بھٹکے ہوئے خیالات کسی حد تک وارفتگی کی حدود سے ہٹ جاتے تھے.... مگر اس کی غیر موجودگی میں تو یہ خیالات اور اس کی یلغاریں اس کا صبر و قرار چھین کر لے گئیں.... ہوش و خرد نے مشورہ دیا کہ اگر وہ انجم کا سچا بہی خواہ ہے۔ تو

اس کا نکاح کسی شریف اور نیک انسان سے کر دے۔ ۔ ۔ تا کہ وہ بھی جینے کا کا حق حاصل کر سکے۔ ۔ ۔ وقتی طور پر جذبات برانگیختہ ہو گئے۔ ۔ ۔ سگریٹ پی پی کر حلق جلنے لگا۔ ۔ ۔ انجم دبے قدموں سے کتنی دیر کی اندر کھڑی تھی۔ "مالک چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ ۔ ۔ !" اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کون۔ ۔ ۔ ؟ تم۔ ۔ ۔ ؟" انجم کی آواز پر بے طرح چونکتے ہوئے رضوان نے مُڑ کر دیکھا۔ ۔ ۔ سیاہ کپڑوں میں ملبوس انجم کا سراپا قیامت بنے اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ ۔ ۔ گورا گورا شہابی رنگ ان کپڑوں میں اور زیادہ نکھرا نظر آ رہا تھا۔ مخمور سی آنکھوں سے بے طرح کی مایوسی جھلک رہی تھی۔

"انجم میری ایک بات مانو گی۔ ۔ ۔ ؟" رضوان نے ایک دم پلٹتے ہوئے اس کے قریب آکر پوچھا۔ ۔ ۔

"مالک۔ ۔ ۔ آپ تو میرے مالک ہیں۔ میں آپ کی بات کیسے رد کر سکتی ہوں" اس نے بالکل سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"کیا تم شادی کرو گی۔ ۔ ۔ ؟" رضوان نے ایک دم اس پر بجلی گراتے ہوئے کہا۔

"شادی۔ ۔ ۔ !! مالک میری شادی تو ہو چکی ہے۔ ۔ ۔ عورت زندگی میں صرف ایک بار کسی کے حجلہ عروسی کی زینت بنتی ہے۔ ۔ ۔ بار بار نہیں۔ ۔ ۔ !" انجم کے لہجے میں تلخی صاف نمایاں تھی۔

"انجم میں مانتا ہوں۔ ۔ ۔ کہ تم ایک باعصمت خاتون ہو۔ قدرت نے

جس عمر میں تم سے یہ سنگین مذاق کیا ہے۔ . . . میں صرف اس کے پیش نظر یہ چاہتا ہوں کہ تمہیں کوئی مضبوط سہارا مل جائے تاکہ تم سکھ کی چھاؤں میں زندگی کے چند دن گزار سکو۔ . . . رضوان نے ہچکچاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مالک آپ میرے آقا ہیں . . . ورنہ اگر کوئی اور ایسی بات کرتا . . . تو . . . . . !"

"انجم بخدا میں نے بصدق خلوص ایسا سوچا ہے" رضوان نے خوف سے سہمتے ہوئے ایک دم بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"مالک میں بے سہارا نہیں . . . . میرے پاس ایمان کی بے پناہ دولت ہے قناعت ہے . . . . عاجزی ہے انکساری ہے۔ اور خدمت کرنے کا بے پناہ جذبہ موجود ہے۔ میں جہاں بھی رہوں گی باعزت زندگی گزار سکتی ہوں . . . . رہی مضبوط سہارے کی بات . . . . !! تو مالک آج ہر سہارا ناپید ہے۔ کوئی کسی کا ساتھ نہیں دے سکتا . . . . جمال بھی بہت کچھ کہتا تھا . . . . وہ بہت بے وفا نکلا . . . وہ بھی دغاباز نکلا . . ." کہہ کر ایک دم صبر کا پل ٹوٹ گیا . . . اور وہ سسک سسک کر رو دی۔ . . .

رضوان اپنے ہونٹ شدت ضبط سے کاٹنے لگا . . . وہ اُسے تسلی دینا چاہتا تھا . . . وہ اس کے آنسو پونچھنا چاہتا تھا . . . مگر اس کی شرافت دیوار بنے اس کا راستہ روک رہی تھی . . . کہ کہیں انجم اس کی ہمدردی کو غلط نہ سمجھے . . . !! انجم تھوڑی دیر روتی رہی۔ اور پھر سر جھکائے باہر نکل گئی . . . دو تین دن اسی حالت میں

خاموشی سے گزر گئے۔ انجم نے ایک چپ سادھ رکھی تھی۔۔۔ اور رضوان حیران و پریشان۔۔۔ کہ وہ انجم کے دل سے اُمنڈتے ہوئے اس طوفاں کو جو خاموشی کے بعد تباہی مچانے والا تھا اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔۔۔

ایک طوفانی رات جبکہ ہوائیں کسی برہن کی طرح بین کر رہی تھیں۔۔۔ فضا میں ایک خوفناک قسم کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔۔۔ بادل غضبناک ہو کر گرج رہے تھے۔ کوندتی بجلی کی لپک پل بھر میں آنکھوں کو خیرہ کرتی رہی۔۔۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔۔۔ کوٹھی کی چھتوں پر جلترنگ بجنے لگا۔ پھر یکایک بارش تیز ہو گئی۔۔۔ دروازے سے دروازہ بجنے لگا۔۔۔ دبیز پردے ہوا کے زور سے لہرا رہے تھے۔۔۔ رضوان آنکھوں پر ہاتھ رکھے خاموشی سے لیٹے ہوئے تھے۔۔۔ کہ اچانک انہیں محسوس ہوا۔۔۔ کہ کوئی دبے قدموں سے برآمدے سے گزر کر صحن کی طرف جا رہا ہے۔۔۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اُٹھے۔۔۔ کمرے کا پردہ ہٹا کر باہر نکلے۔۔۔ تو مسلسل بارش بادلوں کی گھن گرج۔۔۔ اور خوفناک اندھیرے میں انہیں کچھ بھی نظر نہ آیا۔۔۔ اتنے میں برق چمکی۔۔۔ تو انہیں ایک سیاہ کپڑوں میں ملبوس ایک سایہ نظر آیا جو باہر کی جانب بڑھ رہا تھا۔۔۔ اس نے وہیں سے للکارا۔۔۔

کون ہو۔۔۔؟"

مگر سایہ آگے بڑھتا ہی رہا۔۔۔

"کون ہو۔۔۔؟" رضوان نے قدرے زور سے کہا۔

ایک دم باہر کی کنڈی کھلنے کی آواز سنائی دی۔۔۔ رضوان گھبرا کر تیز تیز قدموں

سے صحن کو پار کرتے ہوئے باہر نکلے۔۔۔۔ سایہ بڑی تیزی سے بھاگ رہا تھا۔۔۔
رضوان کا ذہن بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔۔۔۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔۔۔۔ کہ وہ بھاگ کر اس کا پیچھا کرتے۔۔۔۔ وہ اپنی پوری طاقت سے بھاگے۔۔۔ اور آنِ واحد میں اس کے قریب پہنچ گئے۔ پیچھے سے کندھوں کو زور سے پکڑ کر اس کا منہ اپنی طرف کیا۔ کہ اچانک بجلی چمکی۔۔۔۔ اس کی زرد زرد سی روشنی میں سہمی، خوفزدہ۔۔۔۔ سفید سفید سی انجم کالے لبادے میں بڑی معصوم سی نظر آئی۔۔۔ جو خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔۔۔۔ کپڑے اس کے سب بھیگ چکے تھے۔ اس نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا۔ وہ مالک کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔۔۔

"انجم۔۔۔ تم اتنی بیزار تھیں تو مجھے بتلا دیا ہوتا۔ میں خود تمہیں نعیم کے ہاں چھوڑ آتا۔۔۔!" رضوان نے بدستور اس کے کندھوں پر اپنے مضبوط ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔۔۔

دوسری جانب ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز سنائی دیتی رہی۔۔۔۔

"انجم گھر چلو۔۔۔ میں تمہارے سامنے زندگی بھر نہ آؤں گا۔۔۔ مگر میں جہاں سے تمہیں لایا ہوں۔۔۔۔ وہیں پہنچا دوں۔۔۔۔ تاکہ میرا ضمیر مطمئن ہو جائے۔۔۔ چلو انجم۔۔۔۔ اس سنسان سڑک پر یوں کھڑے ہونا بہت ہی معیوب ہے۔۔۔ چلو نا۔۔۔۔!"

انجم نے اس کی التجا کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا۔۔۔

"مالک میں اب اس گھر میں قدم نہ رکھوں گی۔۔۔۔ جس گھر کو میں چھوڑ آئی ہوں۔"
اسے چھوڑنا نہیں کہتے۔۔۔۔ انجم۔۔۔۔ صرف آج رات کے لئے میری خاطر واپس

چلی چلو.... نئی صبح میں خود تمہیں تمہاری منزل پر چھوڑ آؤں گا۔"

"مالک میری کوئی منزل نہیں.... میرا کوئی ٹھکانہ نہیں.... جن راہوں کو میں نے خلوص و عقیدت سے ڈھونڈا تھا اب تو وہ راہیں بھی دُھندلا سی گئی ہیں۔ میرا کوئی نہیں مالک.... میرا کوئی نہیں.... اور وہ پھوٹ پھوٹ کر بے طرح رو دی....

رضوان کے دل میں ایک تڑپ، ایک خلش نے ہلچل سی مچادی۔ اس نے بے تابی سے انجم کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا....

"انجم تمہیں واپس لوٹنا ہوگا.... میری خاطر....!"

"نہیں مالک اب میں کبھی واپس نہ جاسکوں گی...."

رضوان کا خون کھول اُٹھا.... اس کا دماغ جلنے لگا.... آنکھوں سے غصے کے شعلے نکلنے لگے.... اور اچانک اس کا ہاتھ اُٹھ گیا....

ایک آواز نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔

تڑ.... تڑ.... تڑاخ.... اس نے دو زناٹے دار تھپیڑ اس کے معصوم گالوں پر جڑ دیئے....

اچانک فضا میں بادلوں کی گھن گرج نے گڑگڑاہٹ پیدا کر دی۔ آسمانی بجلی چشمک زنی کر رہی تھی۔ باریک سی تیز روشنی کی لہر اُبھری.... موٹی موٹی متورم آنکھیں میں موٹے موٹے شفاف آنسوؤں کے قطرے دیکھ کر رضوان کا دل بیٹھنے لگا....

"نہیں چلوگی گھر....؟" اس نے ایک جھٹکا دے کر سر کو پیچھے کی طرف کرتے ہوئے کہا....

"نہیں جاؤں گی ـــــــ" ایک ستم گر ضدی آواز پھر سے گونجی ....

"نہیں جاؤ گی ـــــ"

"ہرگز نہیں !!"

اور اس کے بعد پھر .... تڑ .... تڑ .... تڑ تڑاخ .... دو تھپڑ اور ملے .... اس نے اپنا مرمریں ہاتھ اپنے گالوں پر رکھ لیا، اور انہیں سسکتی ہوئی سہلانے لگی اور پھر بے اختیار ہو کر اس نے اپنا سر رضوان کے سینے پر رکھ دیا.... اس کی قمیض کے کالر پکڑتے ہوئے بولی ....

"مالک میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی ــــــ ساری دنیا کو چھوڑ دوں ــــــ مگر تمہیں کیونکر چھوڑوں .... !"

رضوان نے اس کی مہکتی ہوئی سانسوں کو اپنے سے بہت قریب پایا۔ بے اختیار اس کی انگلیاں اس کے بالوں میں چلنے لگیں .... اس نے مخمور آواز میں کہا۔

"انجمی ــــــ گھر چلو ــــــ اپنے گھر ــــــ !"

اور انجم کے قدم خود بخود ایک بہکتے ہوئے شرابی کی طرح گھر کی طرف بڑھنے لگے .... رضوان اسے سہارا دیئے گھر لے آیا ....

بارش سے دونوں کے کپڑے گیلے ہو چکے تھے۔ کمرے کی روشنی چھن چھن کر برآمدے میں آ رہی تھی۔ سرد سرد ہوا کے جھونکوں سے پردے لہرا رہے تھے .... یکبارگی دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں ــــــ ایک خاموش سا پیغام دو دلوں نے ایک دوسرے کو پہنچا دیا .... گیلے ہونے کے باوجود جسم میں ایک کرنٹ کی لہر سی دوڑ گئی ....

انجم نے بے اختیار نظریں یوں جھکا دیں جیسے اس کے پردوں پر ہزاروں من کا بوجھ پڑ گیا ہو۔

"نجمی جاؤ کپڑے تبدیل کر لو ——— ٹھنڈ لگ جائے گی ———!" رضوان نے ہیجانی کیفیّت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔۔۔

"آپ کی طبیعت بھی تو ٹھیک نہیں تھی، آپ بھی تو گیلے ہو رہے ہیں۔۔۔!" ایک شرمیلی آواز ہلکی سی اُبھری۔

"نجمی! اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔ بالکل۔۔۔"

انجم بہکتے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ رضوان اسے جاتا دیکھتے رہے۔۔۔ دل میں طوفان اُٹھا ہوا تھا۔۔۔ رہ رہ کر یہی افسوس ہو رہا تھا۔۔ کہ ان کا ہاتھ کیوں اُٹھا۔۔۔ کچھ متضاد کیفیّت لئے وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتے رہے۔۔۔

"تمہیں اس گستاخی کی کس نے اجازت دی تھی ———؟" وہ غصّے سے اپنے ہاتھوں سے مخاطب تھے۔

"اس گستاخی کی سزا تمہیں ملنی چاہیئے۔۔۔" یہ کہہ کر اُٹھے۔۔۔ اور دروازے کے پاس پہنچ کر اپنا ہاتھ اس میں رکھ کر دروازہ بند کرنا چاہا۔۔۔ کہ ایک نرم و نازک ہوا کے جھونکے کی طرح کسی نے ان کے ہاتھوں کو تھام لیا۔۔۔

"خدا کے لئے اتنا ظلم نہ کیجیئے ———!"

رضوان نے پردہ ہٹا کر دیکھا ——— تو وہ انجم تھی۔ جو اپنے کمرے سے ہیٹر اُٹھائے مالک کے کمرے میں آ رہی تھی۔۔۔

"نجمی خدا کے لئے اسے سزا دینے دیتیں... آج اس نے یہ کیا حرکت کر دی
میں اسے روزِ قیامت تک نہ بخشوں گا...." ان کے چہرے پہ کرب کے آثار
ہویدا ہو گئے ——

"اسے میں سزا دوں گی —— یہ میرا مجرم ہے...." انجم نے ہیٹر نیچے
رکھتے ہوئے کہا —— !

او نجمی ! تم نے میری مشکل آسان کر دی.... اسے اتنی کڑی اور سخت
سزا دو، کہ زندگی بھر یاد رہے...."

"آپ آنکھیں بند کیجیے —— !"

"کیوں —— ؟"

"سزا کے کرب کو برداشت نہ کر سکیں گے...."

"بہتر —— ویسے تو جی چاہتا ہے۔ کہ سنگدل کو کھلی آنکھوں سے
دیکھوں کہ یہ معصوم چہرہ بھی سنگدلی کر سکتا ہے...."

"آنکھیں بند کیجیے —— "

"کر لیں —— !" اور رضوان نے سچ مچ آنکھیں میچ لیں۔

انجم نے لرزتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل سے ان کا ہاتھ تھاما.... بھیگی
بھیگی آنکھیں جس میں نشے کے ڈوروں نے اسے اور مخمور و نشیلی بنا دیا تھا.... پل بھر
کے لئے آنکھوں کی چلمن کے پردوں کو گرایا اُٹھایا۔ مالک کی آنکھیں بند دیکھ کر جلدی سے
ان ہاتھوں کو جنہوں نے اس کے دل میں سوئی ہوئی محبت کو پل بھر میں بھڑکا دیا....

عاطفہ

ایک انجانی دنیا میں پہنچا دیا .... وہ جھجک ..... وہ کیفیت ..... وہ وجدانی کیف اور لمحات جو اُسے نئی زندگی بخش گئے .... اپنی آنکھوں سے لگائے.... اور دو قیمتی ہیرے گرم گرم سے آنسوؤں کی صورت میں ان کے ہاتھوں پر گرے .... رضوان کب کی آنکھیں کھولے ان کیف آور حسین لمحات کو اپنی آنکھوں میں سمو دینا چاہتے تھے ۔ ایک مہکتا ہوا وجود .... بھیگے بھیگے چہرے پر حیا کی سُرخی لئے .... اپنے گرد تقدس کا ہالہ ڈالے بالکل عمر خیام کی رباعی نظر آ رہی تھی .... جیسے ہی انجم نے آنکھیں کھولیں ——— دو مقناطیسی نگاہیں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں .... اس نے گھبرا کر اپنی لمبی لمبی پلکوں کی جھالر کو جُھکا یا .... اور شرما کر اک ادا کے ساتھ مستانہ وار کمرے سے بھاگ کر اپنے کمرے کی کنڈی لگالی .... یہ سب کچھ پلک جھپکتے ہی ہو گیا ——— رضوان ورطۂ حیرت میں ڈوبے کھڑے کے کھڑے رہ گئے .... بہت دیر کے بعد جب انہیں بادلوں کی گرج زیادہ زور سے سنائی دی .... تو ان کے ذہن کو بھی ایک جھٹکا سا لگا ——— کہ ان کی دنیا میں جو طوفان آنا تھا وہ آ گیا... اب یہ طوفان کیا قیامت ڈھائے گا .... اس نے بے خودی سے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا، آنسوؤں کی نمی ابھی تک موجود تھی .... اُس نے اپنے تڑپتے جلتے ہونٹ ان آنسوؤں پر رکھ دیئے .... لمحہ بھر کے لئے وہ کوثر و تسنیم کی لہروں میں ڈوب گیا .... عقبی دریچے کا پٹ ہوا کے زور سے کُھل گیا .... ننھے ننھے بارش کے قطرے دریا دلی کے ساتھ اس کے کمرے میں اُس کی مسہری پر پڑنے لگے .... رضوان اپنے خیالوں سے چونکا... جلدی سے آگے بڑھا .... بجلی کی چمک نے پل بھر کے لئے سارے باغ میں روشنی

کی ایک پھیری سی ڈال دی۔۔۔۔اس نے دیکھا سارا باغ جل تھل ہو رہا تھا۔ وہ شگفتہ مزاجی سے مسکرایا۔۔۔کہ آج ابھی ——— ابھی کسی کے پیار نے بھی اس کی خشک اور بے کیف زندگی کو سیراب کر دیا ہے۔۔۔اب اس کی امیدوں کی دنیا میں دور دور تک بھی کسی بھی گرد و غبار کا نشان نہیں۔۔۔۔اس نے خوش دلی سے کھڑکی مضبوطی سے بند کی۔۔۔۔کچھ سردی محسوس ہوئی۔۔۔۔کپڑے تبدیل کئے۔۔۔۔ہیٹر لگایا اور ساری رات حسین خوابوں کے تانے بانے بنتے گزر گئی۔۔۔۔صبح جب وہ بیدار ہوئے تو انجانے میں اس کی آنکھیں ان راہوں پر بچھی ہوئی تھیں ——— جن پر چل کر نجی نے آنا تھا۔۔۔۔انتظار کی راہیں بڑی کٹھن ہوتی ہیں۔۔۔۔کافی دیر کے بعد کمرے کا پردہ ہلا ——— وہ ہاتھوں میں چائے کی ٹرے لئے اندر داخل ہوئی ——— اس کے چہرے پر خون کی شرمیلی لہریں رقصاں تھیں ——— آنکھیں کسی حسین تصور میں جھکی ہوئی تھیں ——— لرزتے قدموں سے وہ میز تک پہنچی۔ ٹرے رکھی ——— اور چائے بنانے لگی ——— رضوان نے سر اونچا کر کے سراپا کو دیکھا۔۔۔۔اس کی شرافت و حیا پر مٹنے کو جی چاہا ——— "نجی کیسی طبیعت ہے ———؟" انہوں نے وارفتگی سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں ———!"

"چپ کیوں ہو ———" رضوان نے پیالی پکڑتے ہوئے پوچھا۔۔۔

"یونہی ———!"

"پھر بھی ——— کیا میری رات کی حرکت سے تو دل گرفتہ نہیں ہو ———؟"

"مالک ـــــ آپ تو میرے مالک ہیں ـــــ آپ سے دل گرفتہ رہوں ـــــ تو جی کیسے سکوں گی ـــــ!" اُس کے مایوس تکلّم سے رضوان اُٹھ کر بیٹھ گئے ۔ ۔ ۔ ۔

"نجی تمہاری آواز میں آنسوؤں کی نمی محسوس ہو رہی ہے ـــــ" (پل بھر کے لئے اس نے دیکھا ـــــ کہ نجمی کی آنکھیں اتنی متورم ہو رہی ہیں ۔ ۔ ۔ کہ وہ پوری طرح کھول نہیں سکتی)

"نجمی کیا رات بھر روتی رہی ہو؟ ـــــ خدا کے لئے صاف صاف جو دل میں ہے کہہ دو ـــــ میں دنیا کی ہر طاقت سے ٹکرا کر تمہارے چہرے کے یہ مقدس آنسو دھو دوں گا ۔ ۔ ۔!"

"ڈر لگتا ہے ـــــ!" کہہ کر انجم کی سسکی سی نکل گئی ۔

"کس خود نے تم سے جینے کا حق چھین لیا ہے نجی ـــــ؟"

"دنیا سے ۔ ۔ ۔ ۔ سماج سے ۔ ۔ ۔ ۔!"

"وہ کیوں ـــــ؟" رضوان نے حیران ہو کر پوچھا ۔ ۔ ۔ ۔

"مالک خدا کے لئے جب تک باجی نہیں آتیں، مجھے آپ اتنی اجازت دے دیجئے کہ میں کچھ دنوں کے لئے اماں کو دیکھ آؤں ـــــ!"

"کیا مجھ سے ڈر لگنے لگا ہے ـــــ؟" رضوان نے اس کی بے داغ اوڑھنی کے پلو کو پکڑتے ہوئے پوچھا ۔

"مجھے اپنی عزت سے ڈر لگتا ہے ـــــ!"

"تو کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ——— ؟"

"کبھی کوئی اپنے مالک سے بھی بے اعتباری کا سوچ سکتا ہے۔۔۔۔ بس حالات ایسے موڑ پر آ گئے ہیں ——— کہ خدا کے لئے مجھے چند دن کے لئے اجازت دیجئے کہ میں اماں کے پاس چلی جاؤں ——— !"

"مجھے اکیلا چھوڑ کر ——— !" رضوان نے چور تبسم ہونٹوں میں چھپائے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"مالک آپ کیوں اکیلے ہیں ——— باجی سعدیہ آپ کی ——— گڈو آپ کا ——— اور !"

"اور تم میری ——— !" رضوان نے شرارت سے بات کاٹتے ہوئے کہا۔۔۔

"ایسا نہ سوچیے ——— مجھے گناہگار نہ کیجئے ——— میں آپ کی۔۔۔۔ !"

"بس ——— بس آگے تم نے کچھ بھی کہا میں ناراض ہو جاؤں گا۔ !"

"میں کچھ نہیں کہوں گی ——— مجھے بصد خوشی اجازت دے دیجیے !"

"اچھا دفتر سے آ کر ——— تمہیں اجازت دوں گا۔۔۔ !"

"بہتر ——— !"

"ایسا نہ ہو ——— کہ تم رات کی طرح پھر فرار ہو جاؤ" ——— رضوان نے شوخی سے دوپٹہ کھینچتے ہوئے کہا۔

"ایسے فرار ہونے سے کیا فائدہ ——— ہے کہ آپ گرفتار کر لیں۔۔۔" کہہ کر انجم جلدی سے باہر نکل گئی ——— اور رضوان مسکرانے لگا۔

عاطفہ

"سیٹھ صاحب! گل خان نے کہا تھا کہ آپ نے مجھے یاد فرمایا ہے" ! ایک موٹی موٹی مونچھوں والا خوفناک سی آنکھیں لئے ایک جنگلی کوٹھی کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔۔۔"

"کیا آپ گل کے والد ہیں ــــــ ؟" آصف نے دزدیدہ نگاہوں سے نووارد کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ہم اس کا باپ ہے" ! نووارد نے اکھڑ لہجے میں جواب دیا۔

"آپ کے اور بچے بھی ہیں ــــــ ؟"

"ہاں ہیں ــــــ !"

"گل خان بہت اچھا بچہ ہے" ! آصف نے بات کا سرا ڈھونڈتے ہوئے کہا۔

"مطلب کا بات کرو" ! جنگلی کی مونچھیں پُراسرار طریقے سے پھیلنے لگیں۔ اور

صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ایک پُر اسرار سی مسکراہٹ سے سودا چکانا چاہتا ہے۔

"مطلب یہ کہ یہ بچہ مجھے دے دو ـــــ" آصف نے بھی خالص کاروباری لہجے میں کہا۔

"قیمت ـــــ ؟" جنگلی نے اپنی میلی سی آستین سے نسوار والے ہونٹ صاف کرتے ہوئے ایک دم پوچھا۔۔۔۔

آصف کی آنکھیں حیرانی سے پھیل گئیں۔ کہ یہ باپ ہے یا کوئی بیوپاری ـــــ؟ کیا آج سے پہلے بھی یہ اس قسم کے سودے طے کرتا آیا ہے۔۔۔۔ کہ اتنی بے باکی سے یہ قیمت کی وضاحت چاہ رہا ہے۔

جنگلی نے اپنی بھرپور پھیلی ہوئی آنکھوں کے گوشے سے سیٹھ کو محوِ حیرت دیکھ کر کہا۔۔

"سیٹھ بات چکانی ہے ـــــ تو جلدی کرو۔۔۔ ہم کو اور کام بھی ہے!"

"تم باپ ہو ـــــ تم کہو ـــــ کہ تم اپنے لختِ جگر کی کیا قیمت لگاتے ہو ـــــ ؟" آصف نے ہر جملے کو طنز دل کے تیروں سے چھلنی کرتے ہوئے کہا۔۔

ایک دم فضا میں ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز اُبھرنے لگی۔۔۔ سیٹھ آصف نے دیکھا کہ ابھی جو باپ بڑھ چڑھ کر بیٹے کا سودا کر رہا تھا۔ وہ تصویرِ غم بنا بیٹھا نگاہیں نیچی کیے۔۔۔ سسکیاں لے رہا ہے۔۔۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اپنی کھلی آستینوں سے آنکھیں صاف کر رہا ہے۔ وہ ایک لحیم شحیم قسم کا انسان تھا۔۔۔ بڑھاپے کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔۔۔۔ میلی سی ملیشیا کی کھلی کھلی اور جابجا پیوند لگے قمیض پہنی ہوئی تھی۔ کھلے کھلے گھیروں والی شلوار پہنے پرانی موٹی موٹی سی چپلی

جس میں موٹے موٹے بھدّے سے بڑھے ہوئے ناخن صاف دکھائی دے رہے تھے۔ گلے میں دو دو تین موٹے موٹے تعویز پہنے ہوئے تھا۔ کندھے پر ایک میلی سے چارخانہ چادر پڑی ہوئی تھی۔ ۔ ۔ ۔ چہرہ گردشِ حالات کی صاف گواہی دے رہا تھا "کیا ہوا آپ کو ـــــــ ؟" سیٹھ کے لہجے میں ایک دم ہمدردی اُبھر آئی۔

"بابو صاحب۔ ۔ ۔ اولاد تو نظر کا نور ـــــــ اور دل کا سُرور ہوتی ہے۔ لیکن جہاں غربت ـــــــ بے کسی بے بسی ـــــــ وہیں یہ نور اندھیرا بن جاتا ہے۔ اور یہ دل کا سرور، دل کا بوجھ بن جاتا ہے۔ ۔ ۔ جس اولاد کو ہم پال نہ سکیں۔ دردر کے دھکّے دلوائیں ـــــــ یہ گلی کوچوں میں آوارہ کتّوں کی طرح پھرتے نظر آئیں ـــــــ اس سے کہیں بہتر ہے ـــــــ کہ انہیں بیچ دیا جائے۔ ۔ ۔ ۔ کم از کم رُوح کو اتنا سکون تو ہو گا ـــــــ کہ ہمارا بچّہ پیٹ بھر کے کھانا تو کھا رہا ہو گا اور گرمی سردی سے محفوظ تو ہو گا۔ ۔ ۔ اس غمزدہ انسان نے کندھے پر رکھی ہوئی میلی سی چادر سے ناک صاف کرتے ہوئے کہا۔ ۔ ۔ ۔

سیٹھ آصف کا دل پسیج گیا ـــــــ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے جو تاثر اپنا چھوڑا تھا وہ بالکل زائل ہو چکا تھا۔ انسان بحالتِ مجبوری سب کچھ کر گزرتا ہے۔ ۔ ۔ پھر غربت تو ایک لعنت ہے۔ ۔ ۔ جس میں انسان خود دھرتی کا بوجھ بن جاتا ہے۔ ایسے میں اولاد کا بوجھ تو ایک لعنت بن جاتی ہے۔ والدین امیر ہوں ـــــــ یا غریب ہر حال میں اپنی اولاد کی بہتری کے لئے سوچتے ہیں۔

"بابو صاحب ـــــــ گل خان میرا بہت اچھا نیک فرمانبردار بچّہ ہے۔

ہمارا پیشہ خانہ بدوشی ——— اور خیرات مانگ کر زندگی کے دن پورے کرنا ہے ویسے تو یہ ہر بات میں کھرا ہے ——— مگر خیرات مانگنے کے معاملے میں بالکل کورا ہے صبح سے شام تک بمشکل ایک روپیہ بھی نہیں لاتا.... جس دن سے یہ آپ کے گھر آرہا ہے۔ وہ روپیہ بھی جاتا رہا.... گھر آکر روتا ہے، ضد کرتا ہے.... میں غریب آدمی کہاں اس کی ضدیں پوری کر سکتا ہوں....“ جنگلی انسان نے ٹھہر ٹھہر کر پوری بات کہہ دی۔

”آپ کا نام کیا ہے ———؟“ آصف نے پوچھا۔

”نیاز خان ———!“

”نیاز خان ——— میں گل خان کو اپنی اولاد کی طرح پالوں گا۔ اس کی تعلیم و تربیت اپنے بچوں کی طرح کروں گا.... تم جو چاہتے ہو ——— کہہ دو ——— پھر میں اپنی ایک شرط پیش کروں گا....“

”سیٹھ صاحب آپ تو غریب نواز ہیں۔ آپ کی غربا پروری کا شہرہ سارے شہر میں ہے۔ میں خوش ہوں کہ میرا بچہ ایک اچھے گھر میں رہے گا....“

”نیاز خان ——— قیمت بتلاؤ ———؟“ آصف نے اُسے ٹٹولتے ہوئے کہا۔

”سیٹھ صاحب.... یہ گل خان کی قیمت نہیں ——— اپنے پیٹ کے دوزخ کی قیمت ہے....“

”بولو تو سہی ———!“

”صرف دس ہزار....“

"دس ہزار۔۔۔" آصف نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں سیٹھ صاحب ایک انسان کی قیمت ——" جنگلی نے موقع تاک نشانہ لگاتے ہوئے کہا۔

"ایک شرط پر ——" سیٹھ آصف نے بارعب لہجے میں کہا۔

"مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔۔۔" جنگلی نے بھی اسی طرح آواز کڑاک کر جواب دیا۔

"تمہیں یہ شہر چھوڑنا پڑے گا —— اور ہمیشہ کے لئے گل خان سے دستبردار ہونا پڑے گا۔"

"سیٹھ —— اتنا ظلم ——" جنگلی کے منہ سے بے تحاشہ نکلا

"یہ ظلم نہیں —— گل کے لئے روشن مستقبل ہو گا۔۔۔ نیاز خان یہ مت بھولو —— کہ تم پرورش تو سیٹھ آصف کے گھر کروانا چاہتے ہو —— اور تعلق خانہ بدوشوں اور خیرات مانگنے والوں کے ساتھ اس کا قائم رکھنا چاہتے ہو۔۔۔؟ زندگی کا ہر روشن موڑ —— اگر تم اس کا مستقبل تاریک کرنا چاہتے ہو —— تو یہ تعلق روزِ قیامت تک قائم رکھو —— نیاز خان! دنیا والے اسے اس تعلق کو جان کر ہر موڑ پر دھتکاریں گے۔۔۔ اس وقت تم اس کے جسم پر روؤ گے۔۔۔ اور ہیں اس کے کرم پہ —— !! تیر کمان سے نکل چکا ہو گا —— نہ تم کچھ کر سکو گے —— نہ میں —— !! ابھی یہ معصوم ہے۔۔۔ وقت کی انجانی راہیں اس کے دماغ کی ہر یاد کو دھندلا کر رکھ دیں گی۔۔۔

سوچ لو ——— خوب اچھی طرح سے سوچ لو ——— اور کل شام آکر مجھے اپنا آخری فیصلہ سُنا جانا ———!" آصف نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔۔۔۔

"مجھے واقعی آج رات کی مہلت دو ——— میں کل شام تک تمہیں اپنا فیصلہ سنا دوں گا ———!" بوڑھے باپ لرزیدہ آواز کی لڑکھڑاہٹ آصف سے بھی پوشیدہ نہ رہی۔۔۔۔ اور اس طرح اگلے روز نیاز خان ——— گل خان کو لے کر "آصف ولا" پہنچا ——— سودا طے پا گیا ——— نوٹوں کی گڈیاں سنبھالتے ہوئے جنگلی کی آنکھوں میں انجانی سی چمک پیدا ہو گئی۔۔۔۔ نوٹ سنبھالتے ہوئے آصف نے آہستہ سے کہا۔

"نیاز خان ——— اپنا وعدہ یاد رکھنا ———!"

"میں قرآن کو اپنا ضامن بنا کر وعدہ کر چکا ہوں!" جنگلی نے پُر اعتماد لہجے میں برجستہ جواب دیا۔

"یہ دو جہاں کا مالک تمہیں صبر دے اور مجھے میرے ارادوں میں کامیاب کرے" آصف نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

گل خان علی کے ساتھ کھیل رہا تھا۔۔۔۔ کہ اتنے میں فضلو بابا اس کے کمرے میں آیا ——— اور گل کو لے کر آصف کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ گل ——— میرے لعل۔۔۔۔ میرا بچہ ——— آج سے تم سیٹھ صاحب کے بچے بن کر رہو گے ———! میں نے خدا کے بعد تمہیں ان کے سپرد کیا ———

یہ کہہ کر ایک دم اسے سینے سے لگایا ——— اُس کے سر کو چُوما ——— اور اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے سیٹھ آصف کے ہاتھ میں تھما دیا ——— !

"سیٹھ اپنے بچے کو سنبھالو ———" ایک لحیم و شحیم انسان رو رہا تھا...

"نیاز خان ——— نیاز خاں ———" آصف پکارتے رہ گئے.....

نیاز خان تیزی سے ڈرائنگ روم کا پردہ ہٹا کر جا چکا تھا... آصف جلدی سے باہر نکلے... مگر وہ تیزی سے سلیٹی بجری کو اپنے پاؤں سے روندتا ہوا گیٹ سے باہر جا چکا تھا...

"بابا کو آپ نے کیا کہا ہے ——— ؟ جو وہ اتنی تیزی سے چلے گئے"

گل خان نے معصومیت سے سیٹھ سے پوچھا...

اُن کا دل بھر آیا... کہنے لگے....

"نہیں بیٹے ہم نے تو انہیں کچھ نہیں کہا ——— "؟

آصف نے فضلو بابا کو اشارہ کیا ——— کہ اسے بچوں کے پاس لے جائے تاکہ اس کا دل بہلا رہے.... وہ رات گل خان پر بڑی بھاری رہی ——— "بچہ" امیر کا ہو ——— یا غریب کا.... والدین کی محبت اور اپنے ماحول سے ہی مانوس ہوتا ہے ——— وہ ساری رات تڑپ تڑپ کر روتا رہا ——— عظمی اور کامران، سعدیہ، فرحت اسے پیار کرتے رہے، بہلاتے رہے۔ رات کو وہ بالکل سونے کے لئے تیار نہ تھا ——— ایک ہی اس کی رٹ... کہ میں نے اپنے

گھر جانا ہے ——— مجھے گھر جانے دو ——— !" عظمی اپنے کمرے کا ایک ایک کھلونا دکھا دکھا کر ہاری . . . سحر یہ اُسے پیار کرتی رہی ——— فرحت اور کامران کبھی ہنس کر، تو کبھی ماتھے پر تیوریاں چڑھا کر اسے چپ کرواتے رہے . . . آخر کار آصف اسے اپنی کار میں مع عاطقہ کے لے کر نکلے ——— خوب شہر میں گھومے پھرے اسے مٹھائیاں اور کھلونے لے کر دیئے ——— اور یہ کہہ کر تسلی دے دی کہ کل تمہارے گھر لے جائیں گے تمہیں ——— بچّہ تھا . . . التفات و محبّت کو خوب سمجھتا تھا . . . بہل گیا ——— اور وہ رات کٹ گئی ——— !

اگلے دن اسے نہلایا دھلایا . . . بازار سے تیار شدہ نئے کپڑے لا کر پہنائے گئے۔ اپنا مخصوص ٹیلر ماسٹر بلوایا گیا ——— اور اس کے اکٹھے چھ سوٹ سلنے کو دے دیئے . . . اس کے لئے الگ ایک خوبصورت سا کمرہ سجایا گیا، جس میں بچے کی ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ گھر پر ایک ماسٹر کا بندوبست کیا گیا ——— کہ وہ اسے ابتدائی تعلیم سے روشناس کروائے . . . جب آصف ہر طرف سے مطمئن ہو گئے ——— تو ایک دن وہ نیاز خاں کا وعدہ آزمانے کے لئے اس کے بتلائے ہوئے پتے پر اس کی جھونپڑیوں کی طرف گئے . . . قریب پہنچ کر ——— جانوروں کی لید ——— راکھ سیاہ پتھر جن سے کھانا پکانے کا کام لیا جاتا تھا . . . ان اُجڑی ہوئی جھونپڑیوں کی نشاندہی کر رہے تھے ——— کہ یہاں بھی کوئی آیا تھا . . . حدِّ نظر تک پھیلے ہوئے وسیع میدان پر ایک عجب طرح کا سناٹا چھایا ہوا تھا . . . آصف کے چہرے پر اُداسی کے سائے رینگ گئے . . . معمّر ڈرائیور اکبر خان اپنے مالک کی ہر حرکت کا بغور

جائزہ لے رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ آہستہ سے کہنے لگا ۔ ۔ ۔ ۔

"سیٹھ صاحب یہاں خانہ بدوش گرمیوں میں آکر ڈیرے ڈال لیتے ہیں۔ اور موسم سرما شروع ہوتے ہی کہیں اور نشیبی علاقوں کی طرف چلے جاتے ہیں"

"اکبر خان ان کی بھی کیا زندگی ـــــــ ؟" سیٹھ نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا

"مالک میرا تو خیال ہے کہ یہ ہم سے لاکھ درجے بہتر ہیں۔ ہر فکر ہر غم سے بے نیاز ۔ ۔ ۔ ۔ مختصر سی جھونپڑیاں ان کا اثاثہ ـــــــ اور ایک دو بار برداری کے جانور ان کی کل کائنات ۔ ۔ ۔ ۔!! جب دل چاہا ان کو ہانکا ـــــــ اور کسی دوسری جگہ جا کر پڑاؤ ڈالا ـــــــ اکبر خان نے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"اکبر خان تمہارا نظریہ غلط ہے ۔ ۔ ۔ ۔ انسان جھونپڑی میں رہے یا محل میں غم اور فکر پیچھا نہیں چھوڑ سکتے ـــــــ جو پلتے ہی انسانوں کے خون سے ہیں۔ وہ اس خون سے جدا کیسے رہ سکتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔!" آصف نے ٹھوس دلیل دیتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔ ۔"

"مالک یہ تو آپ نے ٹھیک ہی کہا ۔ ۔ ۔ ۔ جیتے جی انسان غموں سے فرار حاصل نہیں کر سکتا"

"چلو اکبر خان گھر چلو ۔ ۔ ۔ ۔!"

آصف نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

عاطقہ

کار دھیرے سے سٹارٹ ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آصف کسی گہری سوچ میں مستغرق رہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!

آصف ولا آجانے پر اکبر خان نے آہستگی سے کہا ۔ ۔ ۔ ۔

"سیٹھ صاحب کوٹھی آگئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

"اچھا ۔ ۔ ۔ ۔ او ۔ ۔ ۔ ۔!" کہہ کر وہ نیچے اُترے ـــــ اور حویلی کے برآمدے سے ہوتے ہوئے کمروں کی طرف چلے گئے ۔

آج "آصف ولا" کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ چاروں طرف رنگ برنگی جھنڈیاں خوبصورت درختوں میں سرخ سبز رنگ کے ننھے منے بلب جلتے بجھتے بہت پیارے اور نظر فریب لگ رہے تھے۔ گیٹ کے باہر بڑے بڑے جلی حروف میں خوش آمدید لکھا ہوا تھا۔۔۔ کھلے صحن میں خوبصورت شامیانے لگے ہوئے تھے۔ جن میں شاندار آرام دہ کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔۔۔ درمیان میں میزیں اور میزوں کو خوبصورت گلدانوں اور پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ شہر کے تمام معززین جوق در جوق آرہے تھے۔ کاروں کے ہارنوں کی آوازیں پے در پے آرہی تھیں۔ سب کاریں بڑی ترتیب سے ایک طرف آآ کر کھڑی ہورہی تھیں۔ سمارٹ جوڑے بڑے مخرونانہ سے اٹھلاتے زندہ دلی سے قہقہے لگاتے نشست گاہ کی طرف بڑھے چلے آرہے تھے۔ آج سیٹھ سب لوگوں کے سامنے اپنے "لے پالک" کی خوشی میں ایک جشن منانا چاہتے تھے اور اسے ایک خاص مقام دے کر اپنی دلی تسکین کرنا چاہتے

عاطفہ

تھے . . . . تاکہ شہر والے جان سکیں کہ اس بچے اور ان کے درمیان کیا تعلق ہے،
گھر والوں کی متفقہ رائے سے اس بچے کا نام شہاب ثاقب رکھا گیا اور اس کا سابقہ
نام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھلا دینے کی تاکید کی گئی . . . . آج ننھا شہاب سنہرے رنگ
کی بروکیٹ کی شیروانی سفید چوڑی دار پاجامے اور سلیم شاہی جوتی پہنے، سر پر آڑی
سی بروکیٹ کی ٹوپی رکھے وہ سچ مچ کا ایک ننھا شہزادہ لگ رہا تھا . . . اس کا سرخ
وسپید چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا . . . بچہ بہت ہی خوبصورت
تھا . . . چند ہی دنوں میں اس کی خوبصورتی اور نکھر آئی تھی . . . عاطقہ بھی سرخ رنگ
کے لہنگے سیٹ میں اس کے پاس کھڑی خوابوں کی ایک حسین ننھی شہزادی لگ رہی
تھی۔ وہ کبھی اس کے ہاتھ میں اپنا ریشمی رومال دیتی۔ اور کبھی اس کے بالوں کو سنوارتی
اور ٹوپی آڑی ترچھی رکھتی . . . ننھا شہاب اسے پسندیدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا . .

"عطی تم بہت اچھی ہو۔ یہ کپڑے تمہیں بہت ہی اچھے لگ رہے ہیں!"

"اور شہاب تم۔ تم تو بالکل خالو جان کی طرح لگ رہے ہو۔!"

"وہ کیوں۔؟" شہاب نے حیرانی سے عاطقہ سے پوچھا۔

"ارے بگلے! تم نہیں سمجھتے۔ جب میرے خالو جان کی شادی ہوئی تھی نا۔
تو وہ بالکل تمہاری طرح لگ رہے تھے . . ." عاطقہ نے معصومیت سے ہنس کر کہا۔

"عطی کامران نظر نہیں آ رہا۔؟" شہاب نے پوچھا۔

وہ بڑا ڈرپوک لڑکا ہے۔ وہ دیکھو۔ بالکل میری انگلی کے سامنے . . . . . وہ
. . . وہ . . . . نظر آیا . . . جس لڑکے نے کالا کوٹ پینٹ پہن رکھا ہے۔ اور

اپنے ابو کے ساتھ روتی ٹروتی صورت لئے کھڑا ہے نا۔ وہ کامران ہے۔"

"کیا وہ رو رہا تھا۔" شہاب نے پوچھا۔

"ارے بھئی رو یا تو نہیں۔ مگر شکل ایسی ہی لگتی ہے۔ جیسے ہر وقت روتا ہو۔" عاطقہ نے اس کے کان میں کہا۔

سیٹھ آصف آج بہت خوش تھے۔ وہ ان کے پاس سے گذرے.....

اور پھر ایک لمحے کے لئے ٹھٹھک کر رہ گئے..... یہ حسین و جمیل بچہ۔ وہی گل ہے جسے دیکھ کر ہمدردی کا دریا امنڈ آیا کرتا تھا۔ اور آج اس کے چہرے پر شاہانہ وقار دیکھ کر انسان خود ہی حیرت کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ سعدیہ کے انتخاب پر حیران سے رہ گئے..... اور پیار سے اس کا سر چومتے ہوئے بولے

"بیٹے جلدی جلدی اس سامنے والے شامیانے میں آجانا۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔"

"ابو وہاں کیا ہو گا۔" شہاب نے بے صبری سے پوچھا۔

"وہاں بہت کچھ ہو گا.. جلدی جلدی پہنچ جانا.." سامنے سے آتے ہوئے جج صاحب کو دیکھ کر آصف جلدی سے اس طرف مڑے"

کامران اپنے ابو کے ساتھ بیٹھا ہوا... دور سے عاطقہ اور شہاب کو دیکھ رہا تھا۔ جی تو اس کا بھی چاہتا تھا۔ کہ وہ بھی ان کے پاس کھڑا ہو جائے۔ مگر شہاب کے شاندار کپڑے دیکھ کر وہ شام کو بہت رویا تھا۔ ماموں جان نے اس کے لئے شاندار گرم سوٹ سلوا کر دیا تھا... مگر اس کی ایک ہی ضد کہ وہ بھی شہاب کی طرح کے کپڑے پہنے گا۔ اتنے میں شور مچا کہ مولوی صاحب

آ گئے... مولوی صاحب آ گئے..." انہیں ایک سجی ہوئی اونچی مسند پر بٹھایا گیا... شہاب کو لایا گیا۔ رسمِ بسم اللہ کے بعد آصف آگے بڑھے اپنے بزرگوں کی ایک نشانی جو تعویز میں لپٹی ہوئی تھی... ایک خوبصورت سونے کے تعویز میں منڈھا کر اس کے دائیں بازو میں باندھا گیا... چاروں طرف سے مبارک سلامت کا شور اٹھا... آصف نے پیار سے شہاب کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

"بیٹا۔ اس تعویز کی لاج رکھنا۔ یہ ہمارے خاندان میں پشت در پشت چلتا آیا ہے....!"

جواباً شہاب نے اس تعویز کو آنکھوں سے لگایا۔ اور ایک بار پھر مجمع میں مبارک سلامت کا شور اٹھا۔ شہاب کو زنانہ میں بلوایا گیا۔ اور مردانہ میں کھانا کھل گیا۔ شاندار ضیافت کھا کر مدتوں بعد شہریوں کو سیٹھ آصف کی یہ ضیافت یاد رکھے گی۔ جسے پکانے کے لئے دہلی کے خاص ماہر بلوائے گئے تھے۔

سعدیہ شہاب کی یہ سج دھج دیکھ کر آہستہ آہستہ اٹھی اور سرمے سے اپنی چھنگلی انگلی بھر کر اس کی کنپٹی پر لگا دی۔

"میرے لال خدا تمہیں ہر نظرِ بد سے بچائے۔ تم اس گھر کی روشنی ہو۔ میرے بھیا کا سہارا بن کر ابھرو...." اور وہ بے تحاشا اسے سینے سے لگا کر چومنے لگی۔

فرحت کچھ بجھی بجھی سی رہی... وہ اسے جلد بازی۔ اور ربٹ میں

بیج بونے کے مترادف سمجھ رہی تھی... کئی بار اس کی بہن نے اپنے لڑکے کو دینے کی پیش کش بھی کی... مگر آصف نے صاف جواب دے کر "کہ پرائے لڑکے سے اپنی لڑکی بری نہیں" سب کے منہ توڑ دیئے۔ اور اب خدا جانے کس کا خون کس کا تخم اپنا لے پالک بنا بیٹھے اور خواہ مخواہ ہزاروں روپے کی بربادی... پال پوس کر اس کے وارث اس کے مالک بن جائیں گے... آج اپنوں سے امیدیں ٹوٹ گئیں تو بھلا غیروں نے کیا جھولیاں بھر دینی ہیں.... بڑھاپے کا وقت آرہا ہے۔ اس لئے آصف کا تو دماغ ہی سٹھیا گیا ہے۔ فرحت دنیا داری تو کر رہی تھی مگر چہرے پر صاف ناگواری کے اثرات عیاں تھے... سعدیہ جب شہاب کو بے تابانہ۔ پیار کر رہی تھی... تو فرحت کی بہن راحت نے اسے آنکھوں کے اشارے سے متوجہ کیا...

"فرحت ناگواری سے بہن کے پاس اٹھ آئی... "

"فری... تم تو بڑی بدھو نکلیں... " راحت نے بھویں چڑھا کر کہا......

"آپا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آصف کا دل ایک دم بدل جائے گا"

فرحت نے اپنی مجبوری بیان کرتے ہوئے کہا...

"فری! اتنا بھی انسان کیا اندھا ہو جائے..."

آپا۔ بہن نے کچھ ایسا جادو کیا ہے کہ اندر ہی اندر سب کچھ ہو گیا اور مجھے خبر ہوئی!"

عاطفہ

"خدا جانے کس کا تخم، کس کا خون ہے..... اور آگے چل کر یہی لڑکا تمہیں کیا نا رہے دکھاتا ہے۔ میرا کاشف کسی سے کم تھا.... پھر اپنا خون تو تھا نا..."

"بس آپا میری قسمت پھوٹ گئی.... اور کیا کہوں ۔؟"

"پگلی ۔! ایسی باتیں نہیں کرتے..... ابھی بھی تم بہت کچھ کر سکتی ہو ۔؟"

راحت نے رازداری کرتے ہوئے ذرا جھک کر کہا ۔

"وہ کیسے ۔؟ اس لڑکے کو اس کی اوقات پر رکھنا۔ زیادہ سر پرست چڑھانا عاطفہ کا زیادہ میل جول مجھے تو پسند نہیں۔ تم تو اس کی ماں ہو خوب سمجھتی ہو گی۔ اسے جوتی کی نوک پر رکھو گی۔ تو پھر ٹھیک رہ سکے گا...."

"ہاں آپا کہتی تو تم ٹھیک ہو ۔؟ یہ سعدیہ یہاں سے چلی جائے تو پھر ہی کچھ عملی جامہ پہنا سکوں گی۔ ابھی تو اس کے لاڈ ناز نے بھی اسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ پھر آصف کو کہہ سن کر ٹھیک کر لوں گی ۔!"

"بس ذرا ہوشیاری سے یہ سب کام کرنا....." راحت نے گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے کہا...

زنانے میں بھی کھانا کھل چکا تھا۔ مجبوراً فرحت کو اٹھنا پڑا.... سب مہمان خوشی و مسرت سے کھانا کھا کر جا چکے تھے۔ رضوان کچھ بجھا بجھا سا تھا.... مہمانوں کے جانے کے بعد اندر آیا۔ اور سعدی کو ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

"سعدی بہت دن ہو گئے ہیں۔ تمہارا گھر تمہیں یاد کر رہا ہے ۔!"

"اور تم ___ تو مجھے یاد نہیں کرتے ہو گے۔ بلکہ میری تو تم کمی محسوس

نہ کی ہوگی۔ سعدیہ نے نیم وا آنکھوں سے رضوان پر طنز کرتے ہوئے کہا۔۔

"سعدی دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔۔۔۔ آج تم ڈیڑھ مہینے سے یہاں رہ رہی ہو۔ تمہیں اتنا احساس بھی نہ رہا۔۔۔ کہ رضوان تمہارے بغیر کتنا اداس رہتا ہے۔۔"

رضوان نے طنز محسوس کر کے بھی دل کے چور کو حسین لفظوں میں چھپایا۔۔

"میں تو یہاں ڈیڑھ مہینے سے رہ رہی ہوں۔ تم کتنی بار اپنی اداسی کو دور کرنے کے لئے میرے پاس آئے ہو۔" سعدیہ نے بھی دل کے زخم کریدتے ہوئے کہا۔

"تیسری بار تو آیا ہوں۔ مگر اب تمہیں میری کیا پرواہ۔"

"تم تو میری پرواہ کرتے کرتے کمزور ہو چلے ہو۔"

"سعدی معلوم ہوتا ہے۔ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں رہا۔"!

"رضوان مجھے اپنی صحت کے بارے میں اچھی طرح علم ہے۔ اب نہ وہ حسن رہا نہ وہ کشش۔۔۔۔ نہ صحت رہی نہ طاقت۔ میں تمہاری خدمت کے قابل نہیں رہی۔۔۔ تو تم نے مجھے اپنے دل سے دور کر دیا۔۔۔ سعدیہ نے چھپے ہوئے لاوے کو چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ مگر آنسوؤں کے طوفان نے سب کچھ عیاں کر دیا۔

"سعدی۔۔ جانِ رضوان۔۔۔۔ تم ایسی باتیں سوچ سکو گی۔۔ میں نے کبھی بھول کر بھی نہیں سوچا تھا۔۔۔ (اس کے سر کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے) کچھ بھی ہو۔ تم میری سعدی ہو۔ اور ہمیشہ رہو گی۔۔۔ خدمت تو دوسروں سے بھی لی جا سکتی ہے۔ جب تک تم صحت یاب نہ ہو جاؤ۔"!

"ہاں اب تو انجم مستقل طور پر تمہاری خدمت گار بن چکی ہے۔۔۔۔" سعدیہ

عاطقہ

نے بھیگی پلکوں کو بمشکل تمام اٹھاتے ہوئے کہا.....

"وہ میری خدمت گار نہیں ... میری رشتہ دار ہے ..." رضوان کے منہ سے بیساختہ نکل گیا..

"اور یہ رشتے ناطے بھی کہیں سے نکل آئے۔" سعدیہ کے لہجے میں صاف بے اعتمادی جھلک رہی تھی....

"ہاں سعدی رشتہ دار ... رشتے دار ہی ہوتا ہے۔ امیر ہو یا غریب لیکن رشتہ ناطہ نہیں ٹوٹ سکتا..."

"مجھے بھی تو معلوم ہو۔ کہ یہ کون سے رشتے میں تمہاری بہن لگتی ہے...؟" سعدیہ نے جلے کٹے لہجے میں پوچھا..

"امی کے دور کے رشتے کی ماموں زاد بہنوں کی اولاد ہے..." رضوان نے خون کا گھونٹ پیتے ہوئے کہا..

"او اب تو تمہیں دور کے رشتوں سے بھی آگہی ہونے لگی.... مجھے تو ڈر ہے کہ کل کو اپنے دادا کے نانا کی بھانجیوں بھتیجیوں کی تلاش نہ شروع ہو جائے" سعدیہ کے لہجے میں زہر بھرا ہوا تھا...

"سعدی ان باتوں کا کیا فائدہ ۔ باہمی تلخی بڑھ جائے گی۔ جو میں کسی صورت بھی برداشت نہیں کر سکتا.."

"اچھا ہے راستہ اپنے آپ کھل جائے گا.... اور اب دل کھول کر اپنے رشتے داروں (اس لفظ پر زور دیتے ہوئے) کی حمایت کر سکیں گے....."

سعدیہ کا رنگ ایک دم بدل گیا۔۔۔

"سعدیہ انجم تمہاری اطلاع کے لئے دو ماہ سے اپنی ماں کے پاس گاؤں چلی گئی ہے۔ میں گھر پر تنہا ہوں۔ ہر قسم کی غم پریشانیوں سے خود کو دوچار کر رکھا ہے۔ میں خوش رہوں یا ناخوش۔ تمہیں تو بھائی کے پاس خوش رکھا ہے۔۔" رضوان نے دانستہ جھوٹ بولا۔۔۔۔۔ جبکہ انجم کو گئے صرف ایک ہفتہ گذرا تھا۔۔۔"

"انجم گھر پر نہیں۔" سعدیہ کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔

"جی نہیں۔ اپنی تسلی کے لئے میرے ساتھ گھر چلئے۔۔۔ اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے۔ اب تو رضوان پر شک و شبے بھی ہونے لگے۔۔"

"نہیں رضوان۔۔۔۔۔ ایسی بات نہیں۔ یہ تمہاری بھول ہے۔۔۔۔ میں تو تمہاری کسی بھی خدمت کے لائق نہیں رہی۔۔۔ انجم کے آجانے سے گھر کا کچھ انتظام بہتر ہو گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ہر چیز پر چھاتی گئی۔ اور مجھے بالکل بے فکر کر دیا۔۔۔۔۔ عورت ہوں۔ نا۔۔۔ کبھی کبھی اس کی یہی خدمت مجھے شک و شکوک میں مبتلا کر دیتی ہے۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔!"

"کل چلو گی نا۔" رضوان نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ ابھی بھیا سے ذکر کروں گی۔ ویسے تو وہ آج بہت تھکے ہوئے ہیں۔ صبح بات کر لوں گی۔۔۔"

رضوان اٹھ کر جانے لگا۔۔۔ تو سعدیہ نے اس سے پوچھا۔

"اب کہاں جا رہے ہیں۔"

عاطقہ

دو سگریٹ ختم ہو گئے ہیں۔ وہ لینے جا رہا ہوں ۔۔

"گڈو کہاں ہے۔؟"

"عاطفہ اور اس بھیک منگے کے ساتھ ۔۔ ۔۔ میں تو اس ماحول سے اپنے بچے کو جتنی جلدی ہو سکے دور کرنا چاہتا ہوں ۔!"

"رضوان ۔! میں نے آج تک تم سے کبھی سختی سے بات نہیں کی ۔۔۔ وہ کیا ہے ۔؟ کون ہے ؟ اس کے لئے تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ۔ کچھ بھی ہو ۔ اس وقت وہ میرے بھائی کا بچہ ہی کہلائے گا۔" سعدیہ نے ہنکارتے ہوئے کہا ۔۔۔

"اوفوہ ! یہ شان ہے ۔۔۔۔۔ کہہ کر رضوان غصّے سے پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا ۔

رات کو وہ کس وقت آیا ۔ سعدیہ کو معلوم نہیں ۔ سارے دن کی تھکان سے چور چور تھی ۔۔۔۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو رضوان کہیں باہر گئے ہوئے تھے سہ پہر کے قریب یہ لوگ تیار ہوئے ۔ اور ایک ٹیکسی کے ذریعے چاند نگر روانہ ہو گئے ۔ سعدیہ نے دل کھول کر شہاب کو پیار کیا ۔ اور بھابی سے تاکید کی کہ وہ اس گرمیاں ضرور اس کے پاس شہاب کو لے کر آئیں ۔۔۔ رضوان ٹیکسی میں بے پرواہ سا بیٹھا رہا ۔۔۔ کامران بھاگ کر باپ کے پاس آ بیٹھا ۔۔۔

سعدیہ کی آنکھیں دھندلانے لگیں ۔۔۔ فرحت اور آصف بھی اس کے ساتھ ساتھ ٹیکسی کی طرف بڑھے ۔ آصف تسلیاں دے رہے تھے ۔ فرحت دل

ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔ "کہ چلو مصیبت تو ٹلی جو ہر وقت سر پہ سوار رہتی تھی۔!"
شہاب اور عاطقہ انگلی پکڑے پنجوں کو اونچا کئے کامران کو جھانک رہے تھے۔۔۔۔ جو
کبھی ان کی طرف حسرت سے دیکھتا اور کبھی لاپرواہ ہو کر بیٹھ جاتا۔۔۔۔ سامان سب
رکھا جا چکا تھا۔ سعدیہ کامران کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ رضوان کو مجبوراً میسون
کے ساتھ سلام دعا کرنی پڑی۔۔۔۔ ورنہ وہ تو کل سے اپنی آگ میں جل رہا تھا۔
ٹیکسی روانہ ہوئی۔ دور تک آصف عاطقہ اور شہاب کے ہاتھ ہلتے دکھائی دیئے
سعدیہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ڈرائیور کا سوچ کر کھڑکی سے منہ باہر نکال لیا۔۔۔
نیم وا آنکھوں سے رضوان سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ لاپرواہی سے سگریٹ سلگا
کر پینے لگا۔

گھر پہنچ کر کافی دنوں تک سعدیہ بجھی بجھی سی رہی۔۔۔۔ رضوان کا رویہ بھی
بدل نہ سکا۔ اگرچہ گھر میں انجم موجود نہ تھی۔ مگر پھر بھی سعدیہ پرسکون نہ تھی۔۔۔ رضوان
کا بدلا ہوا رویہ اس کے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔۔۔۔ گھر کے کام کاج کی ذمہ داری
وہ بالکل نہیں سنبھال سکتی تھی۔ کئی بار رضوان بغیر ناشتے کے جاتا رہا۔۔۔۔ گھر آتا۔ تو
گھر کھانے کو دوڑتا۔۔۔۔ ہر چیز پہ بے سروسامانی کے آثار ہویدا تھے۔ وہ انتظار کرتا
رہا۔۔۔ کہ کب سعدیہ خوشی سے کہے کہ انجم کو بلوالو۔!" مگر اس طرف تو جیسے سعدیہ نے
اسے نہ بلانے کی قسم کھا رکھی تھی۔۔۔۔ گھر کا تھوڑا بہت کام اس کے چپڑاسی کی بیوی آ
کر کر جایا کرتی تھی۔ گڈو کو سجاتا بناتا۔ ضرور سعدیہ اپنے ہاتھوں سے کیا کرتی تھی۔۔۔
الصبح اٹھ کر اس کے ناشتے کی اسے فکر ہو جاتی۔۔۔ جب تک گڈو اسکول پہنچ نہیں

جاتا۔ سعدیہ دیوانوں کی طرح ادھر سے ادھر پھرتی رہتی۔

زندگی کے دن بڑے ہی بے کیف گذر رہے تھے۔ زندگی ایک المیے سے کم نہیں۔ جس ہستی کو ٹوٹ کر چاہا۔۔۔۔ جس کا وجود ہی اس کی زندگی کا محوّر بن چکا تھا اب وہ ہستی اس کے لئے کوئی اضطراب کوئی ہلچل نہیں مچا سکتی ۔۔۔۔۔ سعدیہ کی بے نیازی نے رضوان کی زندگی میں بے پناہ اداسیوں کا زہر بھر دیا۔۔۔۔

اتوار کا دن تھا۔۔۔ رضوان لاپرواہی سے تپائی پر پاؤں رکھے کرسی پر سر ٹکائے بے تحاشا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ سگریٹ پی پی کر اس کا حلق جلنے لگا۔۔۔۔ وہ ماضی کے دریچوں کی شفاف روشنی میں انجم کا ابھرتا ہوا پیکر کبھی سفید۔۔۔ کبھی گلابی اور کبھی فیروزی کپڑوں میں دیکھ رہا تھا۔۔۔۔ اس کی جھکی جھکی گھنیری پلکوں کے لرزتے ہوئے سائے۔۔۔۔ اس کی لڑکھڑاتی ہوئی چال۔۔۔۔ اس کے ہونٹوں کے کونوں پر مخمور سا تبسم۔ رضوان کے چہرے پر قوس وقزح کا رنگ بکھرنے لگا۔۔۔۔ وہ خود بخود مسکرانے لگا۔ نیم وا آنکھوں سے اس نے ماحول کو جھانکا کہ کوئی اس کے چہرے کا رنگ پڑھ کر دل کی کیفیت نہ جان لے۔۔۔ مگر دور سعدیہ گڈو کو نہلا رہی تھی۔ اس نے مسکرا کر ادھ جلے سگریٹ کے ٹکڑوں سے میز پر "ا، ن، ج، م" بنانا شروع کیا۔۔۔۔ نام مکمل ہو چکا تھا۔۔۔ دل کی خلش نے تڑپا کر رکھ دیا۔۔۔۔ انجم انہی بے پناہ یادوں کے ساتھ اس کے تصوّر کے پردوں سے جھانک رہی تھی۔ سعدیہ کے قدموں کی چاپ نے اس کے جذبات کی کرچیاں کر دیں۔۔۔۔ اس نے جلدی سے سب ٹکڑوں کو سمیٹا۔۔۔۔ اور ایش ٹرے میں پھینکا۔۔

ایک تڑپتا سوز سے بھرا ہوا شعر اس کے ہونٹوں پر مچلنے لگا ؎

کب تک ہر ایک چیز پہ لکھ لکھ کے تیرا نام
رسوائیوں کے ڈر سے مٹایا کرے کوئی ؟

سعدیہ تولیہ لینے آئی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ رضوان کو اپنے خیالوں میں کھویا دیکھ کر وہ جھنجھلا اٹھی ۔ وہ تیزی سے باہر نکل جانا چاہتی تھی کہ اس کا پاؤں تپائی سے پھنسا اور ایک دھماکے کے ساتھ وہ فرش پر آ رہی ۔ ۔ ۔ ۔ رضوان بھاگ کر اس کے قریب پہنچا ۔ ۔ ۔ اس کا منہ دہلیز کی لکڑی پر لگنے سے لہو لہان ہو رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ سعدیہ بیہوش ہو چکی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ناک سے فواروں کی طرح خون جاری تھا ۔ ۔ ۔ اس نے اسے جلدی سے اٹھا کر مسہری پر لٹایا ۔ ۔ ۔ ۔ اسی تولیے سے اس کا منہ پونچھا ۔ ۔ ۔ ۔ جلدی سے پانی کے چھینٹے وغیرہ مارے ۔ ۔ ۔ ۔ مگر زرد ہوتی ہوئی سعدیہ ہوش میں نہیں آ رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ باہر گڈو ننگا کھڑا رو رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ اسی لمحے چپڑاسی سودا سلف کے لئے آیا ۔ رضوان نے بے تابی سے اسے آواز دے کر اندر بلایا ۔ کہ وہ گڈو کو کپڑے جلدی سے پہنا دے ۔ وہ ڈاکٹر کو لینے جا رہا ہے ۔ ۔ ۔ اتنا کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکلا ۔ اور چند لمحوں کے بعد ڈاکٹر کے ساتھ اندر داخل ہوا ۔ ۔ ۔ ڈاکٹر نے مریضہ کی خوفناک حالت دیکھ کر فوراً ہسپتال داخل کرنے کا مشورہ دیا ۔ ۔ ۔ خون کسی بھی صورت سے بند نہیں ہو رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ رضوان کا دل شدتِ غم سے پھٹنے لگا ۔ سعدیہ کی مسلسل بے ہوشی نے اس کے ہوش و حواس پر بجلی گرا دی ۔ وہ کب ؟ کیسے ؟ ہسپتال پہنچا ۔ سعدی کو داخل کروایا اسے

کچھ معلوم نہ تھا۔۔۔۔ گڈو کی بے پناہ رونے کی آوازیں اسے صدائے باز گشت بن کر سنائی دے رہی تھیں۔

ہائے میری امی۔ !! کہاں لئے جا رہے ہو میری امی کو۔؟"

ہسپتال کے پورے ڈاکٹروں نے اپنی بھرپور کوششیں آزما دیکھیں۔۔۔۔ مگر دماغ کی رگ پھٹ جانے کا تو کوئی علاج نہیں تھا۔۔۔۔ شام کے سائے بڑھ رہے تھے۔۔۔۔ فضا میں عجیب سی سوگواری رچی ہوئی تھی۔۔۔۔ سعدیہ کا چہرہ خوفناک حد تک زرد ہو رہا تھا۔۔۔۔ رضوان آنکھوں میں ویرانی و بے بسی لئے اس پر جھکا ہوا ایک ٹک سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ ایک نرس غمگین چہرہ لئے سعدیہ کی نبضیں دیکھ رہی تھی۔ کہ اچانک اس کے چہرے پر خوف و ہراس کے سائے لہرا گئے۔ اور وہ بھاگتی ہوئی باہر نکلی۔۔۔۔

"سسٹر۔!" ایک درد میں ڈوبی ہوئی آواز در و دیوار سے ٹکرا کر واپس آ گئی سسٹر کے قدموں کی آواز مدہم ہوتی گئی۔۔۔۔ رضوان تڑپ تڑپ کر سعدیہ کے تکیئے پر سر ٹیکتے رہے۔۔۔۔ ڈاکٹرز تیز تیز قدموں سے کمرے میں داخل ہوئے۔۔۔۔ اور سعدیہ کے گرد گھیرا بنا کر کھڑے ہو گئے۔۔۔۔ چند لمحوں کے بعد۔ سسٹر نے سفید چادر سے سعدیہ کو ڈھانپ دیا۔ ڈاکٹروں کے چہرے اتر گئے اور وہ تھکے ہوئے قدموں سے باہر نکل گئے۔ ہسپتال کے در و دیوار رضوان کی دلدوز چیخوں سے کانپ اٹھے۔ وہ یک بارگی سعدیہ پر گر پڑا۔ اور اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اپنے پیار کا واسطہ دینے لگا۔ سسٹر نے اپنا چھوٹا سا رومال آنکھوں پر رکھ لیا۔۔۔۔ اور جذبات سے

رندھی ہوئی آواز میں بولی ....

"صبر کیجئے۔ اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ۔"

"سسٹر میں لٹ گیا۔ میں برباد ہو گیا۔ میری محبت آج روٹھ گئی ......

کہ اتنے میں نگاہ دروازے پر اٹھی ..... چپڑاسی کامران کو لئے دروازے پر کھڑا تھا ..... کامران ...... میرے بدنصیب بچے ... تمہاری ماں تم سے روٹھ گئی ...... آگے بڑھتے ہوئے ...... میرے لال ... آؤ تم ہی اپنی امی کو منالو۔ مجھ سے تو وہ روٹھ گئی ہے ...... تم ہی انہیں منالو۔ آؤ گڈو آؤ۔ بہتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان رضوان کامران کو اٹھائے ہوئے آگے بڑھے۔ اور سعدیہ کے منہ پر سے چادر کھسکادی ..... کامران نے بے قراری اور تڑپ سے ماں کی طرف دیکھا ... اور ایک جھٹکے سے باپ کی گود سے اتر کر ماں کے سینے سے چمٹ گیا .... اور بے تحاشا سسک پڑا .... اس کی ہلکی ہلکی چیخوں کی صدائیں در و دیوار کو رلاتی رہیں .... کبھی وہ اپنی ماں کے منہ کو چومتا۔ تو کبھی اس کے سینے میں منہ چھپاتا ... رضوان دیواروں سے سر ٹکرانے لگا ... ہسپتال کی ایمبولنس میں لاش رضوان اپنے آبائی شہر لایا۔ شام ہوتے ہوتے سعدیہ کو اس کی آخری منزل تک پہنچا دیا گیا۔ کامران تڑپ تڑپ کر سو چکا تھا ... رضوان اپنی کائنات کی بربادی پر ساری رات سسکتا رہا۔ بدنصیب ماں اس کا سر اپنی پرشفقت گود میں لئے بیٹھی رہی ... چھوٹا بھائی اگرچہ دور دور رہا۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا، کہ بڑے بھائی کا گھر برباد ہو جائے اور خون نہ تڑپے ...... وہ بھی سر نیہوڑائے کسی گہری سوچ میں

مستغرق تھا۔۔۔ اگر بتیوں کی پر اسرار سی خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔۔۔

"ماں میں برباد ہوگیا۔" رضوان ایک بار پھر سسک پڑے۔۔۔ ماں کی پلکوں پر ٹھہرے ہوئے مجبور آنسو ایک دم ٹپک پڑے۔۔۔ اس کی سسکیوں نے ایک بار پھر گھر میں کہرام مچا دیا۔۔۔ فردوس۔ فوزیہ بھی دوسرے کمرے سے نکل کر یہاں پہنچ گئیں۔ رضوان کی چیخوں نے ہر آنکھ کو پر نم کر دیا۔ شہر کا ہر فرد تعزیت کے لئے آتا رہا۔ رضوان سر جھکائے سارا دن بیٹھا رہتا۔۔۔ ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتا رہتا۔۔۔ پندرہ برس کی رفاقت نے ایک دم تنہائی۔ ویرانی کی گردشوں کے حساب سے اس پر پھیلا دی۔۔۔ اپنی بے کیف زندگی کے بارے میں وہ کیا سوچتا۔؟ سعدیہ نے اس کے سوچنے کے لئے چھوڑا ہی کیا۔ ہاں رہ رہ کر کامران کا خیال اسے تڑپائے جا رہا تھا جو بچہ ماں کے بغیر ایک منٹ بھی نہیں رہتا تھا۔ اب وہ اس زندگی کے کٹھن لمحات کیسے گذارے گا۔؟ کون اس کے لئے بیقرار رہے گا۔؟ کون نیم شب کو اٹھ اٹھ کر اس کے لئے دعائیں مانگا کرے گا۔؟ کس کو اس کی تربیت، کھانے پینے کی فکر لاحق ہوگی۔۔۔۔ کون اس کی سکول کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کیا کرے گا۔۔۔۔؟ اس کی اپنی زندگی تو عمران کی گمشدگی کے بعد بالکل ہی ویران ہو چکی تھی۔۔۔ نہ وہ محبت کے دن رہے اور نہ وہ کشش نہ وہ چاہت ہی رہی۔۔۔ سعدیہ تو روحانی موت بہت پہلے کی مر چکی تھی یہ تو قدرت نے اسے سہارا دینے کے لئے کامران کی پیدائش کا بہانہ بنا دیا۔۔۔ ورنہ وہ تو ایک سلگتی لکڑی کی طرح دھیرے دھیرے سلگ رہی تھی۔۔۔۔ اور پھر ایک دھماکے کے ساتھ بھڑک اٹھی۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بجھ گئی۔۔۔

عاطقہ

آج مرے کل دوسرا دن . . . سعدیہ کے قُل کی تیاری ہو رہی تھی . . .
ایک کمرہ مردوں کے لیئے خالی کر دیا گیا . . . جس میں اگربتی، لوبان کی خوشبو نے
عجیب سی اداسی اور پُراسراریت کو جنم دے رکھا تھا ۔ تلاوت کی پرسوز آوازیں چاروں
طرف سے سنائی دے رہی تھیں . . . . . مردانہ اور زنانہ دونوں طرفوں کا انتظام تھا ۔
زنانہ حصہ فوزیہ اور فردوس نے سنبھال رکھا تھا . . . ان تین دنوں میں کامران بالکل مرجھا
کر رہ گیا تھا . . . اس وقت بھی وہ ایک ایک کے پاس بیٹھتا اور سوچتا ۔!
"یہ قرآن شریف ختم کر کے میری امی آجائیں گی نا ۔؟" آج امی کو ملوا دیجئے نا ۔؟؟
امی ہسپتال میں کیوں گئی تھیں ۔!! پھوپھی وہ کب جائیں گی ۔؟؟ بتایئے نا . . . . . "
فردوس ننھے بدنصیب بھتیجے کی دردناک باتیں سن کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی . . . . .
مردانے سے رونے کی آواز سن کر رضوان بھی گھٹتے دل سے آ رہا تھا . . . کہ ایک دم
ڈیوڑھی . . . . پر اس کی نگاہیں بیقراری سے رک گئیں ۔ انجم غمزدہ صورت لئے داخل
ہو رہی تھی . . . پل بھر میں دونوں کی نگاہیں ملیں . . . اور جھکیں . . . رضوان تصویر غم بنے
الٹے قدموں واپس کمرے میں چلے گئے . . . کامران کو تڑپتا پا کر انجم نے اسے اپنے
سینے سے لگا لیا . . .
میرا گڈو ۔ میرا لال . . . . . وہ بے تحاشا اس کے بالوں کو
چوم رہی تھی . . . . .
"باجی ۔ میری امی کہاں ہیں ۔؟"
انجم کی آنکھیں بھی ساون بھادوں برسانے لگیں ۔
عاطف

"کاش میں تمہاری امی کو کہیں سے ڈھونڈ کر لا سکتی..... گڈو..... مجھے تو تم نے کوئی اطلاع نہ دی.....!" وہ سسکتی رہی..... بہت دنوں کے بعد اپنے مخلص کو دیکھ کر گڈو بہل گیا جس کا سارا بچپن اس کی گود میں گذرا تھا..... اس سے بہل جانا لازمی بات تھی..... قرآن شریف کے ختم کے بعد غریبوں مسکینوں و کھانا کھلایا جانے لگا..... انجم گڈو کو سینے سے لگائے چھوٹے سے باغ کی طرف نکل گئی..... دور چمبیلی کی بیلوں کے پاس چمبیلی کے زرد زرد پھولوں کی طرح کوئی بے حد اداس و غمگین کھڑا تھا..... شیو بڑھی ہوئی۔ آنکھوں میں بے پناہ اداسی کے امنڈتے ہوئے ریلے..... بال بکھرے ہوئے جس نے اس کی مردانہ وجاہت کو اور دلکش بنا دیا۔ شلوار قمیض میں اس کا سراپا اور ہی پر وقار نظر آرہا تھا..... انجم کے قدم رک گئے..... دل درد و غم سے بھر گیا..... رضوان کو اتنا شدید غمگین اس نے زندگی کے کسی بھی موڑ پر نہیں دیکھا تھا۔ سعدیہ سے اسے واقعی محبت تھی..... اب یہ خلا کیسے پُر ہوگا۔؟ اب مالک اس شدید صدمے کو کیسے برداشت کریں گے..... کامران کی پرورش ان کے لئے سب سے اہم مسئلہ بن جائے گی۔ اس کی کسے خبر تھی۔؟ وہ کھڑی سوچتی رہی۔ کہ کیسے اور کن الفاظ میں مالک سے اظہار تعزیت کرے۔

"باجی ابو کے پاس لے چلیئے۔!" گڈو نے مشکل آسان کر دی..... اور وہ سہمے سہمے قدموں سے آگے بڑھنے لگی.....

"ابو..... ابو..... باجی آگئیں۔!" گڈو نے بہت دنوں کے بعد

عاطفہ

خوشی سے چلاتے ہوئے کہا......

رضوان نے غم سے بھری ہوئی نگاہوں کو پل بھر کے لیے اٹھایا۔ اور پھر جلد ہی جھکا دیا.... چہرے پر شدید روذعم کے سائے سے لہرا گئے۔ انجم کا دل کٹنے لگا.... آنکھیں جھلملانے لگیں.. اور رندھی ہوئی آواز میں صرف اتنا ہی کہہ پائی...

"مالک صبر کیجئے۔ یہ صدمہ ہمارے لئے ایک حادثے سے کم نہیں۔"

"انجم میں لٹ گیا.." ذرا سی ہمدردی پاکر رضوان سسک اٹھے..... ٹوٹی موتیوں کی مالا کی طرح انجم کے آنسو بھی بے تحاشا اس کے دامن پر گرنے لگے....

"مالک ہم سب لٹ گئے۔ اس جانکاہ صدمے میں آپ تنہا نہیں...."

"میرا گڈو ماں سے بچھڑ گیا...... میری سعدی مجھ سے چھین لی گئی.... انجم....!"

"آپ کے گھر کی رونق ہی چلی گئی.... مجھ سے قدرت نے ایک ہمدرد بہن چھین لی...."

"بس انجم کارساز قدرت نے مجھے ہر طرح سے برباد کر چھوڑا..." رضوان نے بیدردی سے چمبیلی کے پتے توڑتے ہوئے کہا۔

"ایسا نہ کہیئے مالک.... دل کو چوٹ پہنچتی ہے۔ اتنا گلہ ضرور ہے۔ کہ باجی آگئی تھیں تو مجھے بلوالیا ہوتا.... آخری وقت کچھ خدمت کرنے کا موقع مجھے بھی مل جاتا.." کہتے کہتے آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک گئے....

رضوان نے یکبارگی بھیگی بھیگی پلکوں سے اُسے دیکھا۔ اور اسے محسوس ہوا..

کہ یہی واحد وہ ہستی ہوگی، جو اُس کے غم کو خود پینے کی کوشش کرے گی دل و دماغ پر چھائے ہوئے محیط گہرے سناٹوں اور روح کے زخموں کو یہی ہستی اپنے خلوص کے پھایوں سے اچھا کر دے گی.... چند لمحوں کے لئے اداس آنکھوں میں مدہم سی امید کی کرن چمکی......

"انجم۔ میرے گڈو کو بے چین نہ ہونے دینا۔ میری آخری التجا یہی ہے۔"

"مالک۔ گڈو میرے دل کا ٹکڑا بن کر رہے گا۔ اس کے لئے آپ قطعی پریشان نہ ہوں۔"

"باجی بھوک لگی ہے" گڈو نے بیچارگی سے کہا....

"چلو میرے لال تمہیں کھانا کھلاؤں" کہہ کر انجم تیز تیز قدموں سے صحن کی طرف بڑھ گئی اور رضوان اس کے قدموں کے نشان دیکھتا رہ گیا۔"

مرنے والا.... آرام وسکون سے اپنی منزل پر جا پہنچا.... رسم ورواج کے ریلوں میں چہلم بھی گذر گیا۔ انجم کے ساتھ ویسے بھی کامران مانوس تھا۔ اس حادثے کے بعد تو وہ بالکل اس سے چپک کر رہ گیا۔ رضوان اپنی نوکری کی وجہ سے چاند نگر جا چکا تھا.... انجم معہ کامران کے کامران کی دادی کے پاس ہی تھی.... زندگی بڑے دکھ سے گذر رہی تھی.... اور اک بوجھ بن کر دھیرے دھیرے سرک رہی تھی.... رضوان کی صحت دن بدن گرنے لگی۔ سعدیہ اس کی زندگی میں ایسا خلا پیدا کر گئی جسے کوئی پر نہیں کر سکتا تھا.... سچا ہمدم.... سچا ہمدرد، رفیق اور ساتھی منجدھار میں ہی چھوڑ گیا۔ اب وہ کھوئی کھوئی اداس آنکھوں سے خلاؤں میں کھو جانے کا عادی بن چکا تھا.... ٹھنڈی آہیں اس کا مقدر.... خوش لباسی کے لئے رضوان خاصہ مشہور تھا.... میچنگ میں کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا.... مگر تب کے رضوان۔ اور اب کے رضوان میں بہت فرق آچکا تھا... بدنصیب

ماں مزید دکھوں کو سہنے کے لئے زندہ تھی۔۔۔۔۔ کامران ویسے تو کھیلتا رہتا۔۔ انجم کے ساتھ ساتھ رہتا۔ مگر جب وہ ضد پر اتر آتا۔ تو ہائے امّی۔ ہائے ابّو کی دلدوز پکاروں سے آسمان کا سینہ بھی شق کر دیتا۔ اس سمے انجم اپنی ہر ممکن کوشش کر دیکھتی۔۔۔۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ لئے پھرتی۔ مگر ماں کی محرومی سے ترسا ہوا بچہ ۔۔۔۔ کسی پہلو بھی قرار نہ پاتا۔ تو دادی اور پھوپھو اپنی بدنصیبی پر پھوٹ پھوٹ کر رو دیتیں۔ انجم کے دل پر بھی شدید چوٹ پڑتی۔ اور آنسوؤں کا سمندر بہہ نکلتا۔۔۔۔ سبھوں کو روتا دیکھ کر بدنصیب بچہ۔۔۔۔ قدرے سہم جاتا۔۔۔۔ اپنی بڑی بڑی بھیگی آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتا۔ اور پھر چپکے سے اپنی باجی کی پیٹھ کے ساتھ دبک کر بیٹھ جاتا۔۔۔۔۔

رضوان نے جب کامران کی یہ حالت دیکھی۔ تو وہ تڑپ اٹھا۔۔۔ اور ماں سے سسک کر التجا کی۔۔۔۔ کہ وہ کامران کو اپنے ساتھ ہی رکھے گا۔۔۔ بن ماں کا بچہ ہے۔۔۔۔ باپ کی شفقت بھی نہ پائے تو بے موت مر جائے گا۔۔۔۔۔ ماں حیران۔ کہ اکیلے ہیں کیسے کامران کو بھیجے۔۔۔۔ انجم جوان جہان۔ غیر تو بعد میں باتیں بنائیں گے۔۔۔۔ پہلے اپنے زبان کھولیں گے۔۔۔۔ اور وہ کس کس زبان پر ہاتھ رکھتی پھرے گی۔ پہلے تو گھر میں سعدیہ موجود تھی۔ اس لئے باہر نکلنے والی زبانوں کو کچھ قفل لگا ہوا تھا۔۔۔۔ اب سعدیہ کی غیر موجودگی اس قفل کے ایک ایک پیچ کو کھلوا کر رکھ دے گی۔۔۔۔ بال انہوں نے دھوپ میں سفید نہیں کئے تھے۔ رضوان ماں کے اندیشوں کو سمجھ چکا تھا۔۔۔۔ ایک دم ماں کی پریشانی دور کرتے ہوئے بولا۔

"امی۔ میں صرف تنہا کامران کو لے کر جاؤں گا۔۔۔ مجھے معلوم ہے۔ کہ اب انجم کا جانا وہاں معیوب ہوگا۔"!

"مگر تم نوکری کرو گے۔ یا بچے کی دیکھ بھال کرو گے۔۔۔۔"؟

امی اس کی آپ فکر نہ کیجئے۔ غریب لوگ بہت ہی خدا ترس ہوتے ہیں۔ میرے چپڑاسی کی بیوی نے پہلے بھی سعدیہ کی بیماری پر کامران کو سنبھالا ہوا تھا۔ رضوان نے کن انکھیوں سے انجم کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"بیٹے تم جو کچھ کہتے ہو۔ درست ہے۔ مگر میری مامتا نہیں مانتی۔۔۔۔۔" ماں نے بے چارگی سے کہا۔

"خالہ جان کیا ایسا ممکن نہیں۔ کہ یہ اپنی ٹرانسفر یہاں کروالیں۔" انجم نے آہستگی سے کہا۔۔۔۔

"کاش ایسا ہوسکتا۔۔۔۔ ابھی تو مجھے چاند نگر گئے تھوڑا ہی عرصہ گذرا ہے۔"

"تو پھر ایسا کرو۔۔۔۔ چند دن انجم وہاں رہیں۔۔۔۔ میں نعیم کی ماں سے بات کروں گی۔ اگر وہ بھی وہاں رہنے کے لئے رضامند ہو جائے۔۔۔۔ تو پھر مجھے کسی بات کا ڈر نہیں۔۔۔۔ میں بھی انشاءاللہ مہینے میں ایک دو بار چکر لگاتی رہا کروں گی،" ماں نے سوچ بچار کے بعد اپنا آخری فیصلہ سنا دیا۔۔۔ انجم کے منہ پر خون کی اک شرمیلی لہر دوڑ گئی۔۔۔۔ خالہ کے فیصلے پر دل دھڑکنے لگا۔۔۔۔ مدتوں کی آرزو ارمان بن کر مچلنے لگی۔۔۔ مگر ضبط کر گئی۔۔۔۔ اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ کہ کہیں مبادا آنکھیں ہی راز فاش نہ کر دیں۔۔۔ رضوان بھی دل ہی دل میں اس فیصلے کو سن کر بہت

خوش ہوئے ۔ مگر خاموشی سے سگریٹیں پھونکتے رہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آہستگی سے کہنے لگے ۔ ۔ ۔ ۔"

"امی ۔ سعدیہ بے وفائی نہ کرتیں ۔ تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"نہیں میرے لال ایسی باتیں نہیں سوچتے ۔ کوئی اس راہ پر خوشی سے نہیں جاتا ۔ ۔ ۔ ۔ معلوم نہیں اس بدنصیب کے دل میں کون کون سی حسرتیں ہوں گی ۔ جو آج منوں مٹی تلے دب چکی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

فضا ایک بار پھر بوجھل ہو گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فردوس کی سسکیوں نے ماحول کو اور المناک بنا دیا ۔ ۔ ۔ ۔ انجم کے آنسو ٹوٹتے ستاروں کی طرح اس کے دامن میں گرنے لگے ۔ ۔ ۔ ۔ رضوان نے بے تحاشا سگریٹ پھونکنے شروع کر دیئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ اچانک اماں کی آواز پھر سنائی دی ۔ ۔ ۔ ۔

"آج کل کیسا خون سفید ہو گیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ بہن زندہ تھی ۔ تو کیا کیا چاؤ چونچلے بھائی کرتا تھا ۔ ۔ ۔ مرنے پر اس کا دل ذرا نہیں پسیجا ۔"

"اماں وہ سب یورپ گئے ہوئے ہیں ۔ آصف بھائی اپنے دل کے علاج کے لئے باہر جانا چاہتے تھے ۔ بہن فرحت کا اصرار تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ تنہا نہیں جانے دوں گی ۔ ۔ ۔ ۔ اس پر سب تیار ہو گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !"

"تم نے انہیں کوئی اطلاع نہیں بھجوائی ۔"

"نہیں امی ۔ اب انہیں وہاں کیا پریشان کرنا ۔ ۔"

"بدنصیب بہن تھی جو بھائی کا کندھا بھی نہ لے سکی ۔ !"

"بس امی تقدیر کے پھیر ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ابھی انہیں گئے ہوئے دو مہینے بھی نہیں ہوئے ۔"

اگلے روز نعیم کی ماں کو بلوا کر رضوان کی ماں نے بات چیت کی.... تو وہ حیران رہ گئی.... جب نعیم کی ماں نے صاف صاف کہہ دیا.... کہ انجم بیوہ ہے نوکرانی کی حیثیت سے اس گھر میں آئی ہے اور اسی حیثیت سے رہے گی. کوئی کنواری بالی لڑکی تو ہے نہیں کہ زمانے کی باتوں کا ڈر ہو.... شریف اچھا اور اپنا گھرانا ہے. اس لئے وہ سب بھی بے فکر ہیں. اگر کہیں اور ملازمت کرتی، تو اس کے بھائی کبھی بھی رضامند نہ ہوتے. اب اس نے زندگی تو اپنی آپ ہی گذارنی ہے..... دو چار جگہ سے اچھے اچھے رشتے بھی آئے ہیں.... وہ اپنے خاندان کا قدیر ہی بڑا پیچھا کر رہا ہے.....

"کونسا قدیر۔؟" رضوان کی ماں نے حیرت سے پوچھا"

"اسے ہے! بوا..... قدیر کو بھول گئیں.... وہیں نصیبن کا شوہر" نعیم کی ماں نے رازداری سے کہا۔

"بہن سٹھیا تو نہیں گئی ہو۔ وہ اس وقت ہماری عمروں کا ہو گا.... اس کے تو آگے پوتوں کے بچوں کی شادیاں ہو چکی ہیں.....!"

"اسے! تو کیا آپ کا خیال ہے۔ کہ اسے اب کوئی کنوارہ بر ملے گا.... بیوہ کو کون خوشی سے لیتا ہے..... رنڈوے یا بوڑھے ہی مجبوری سے انہیں سہارا دیتے ہیں..... روٹی کپڑا عزت سے مل جائے..... اب اور کیا چاہیئے۔!"

"نہیں نہیں نعیم کی ماں۔ یہ سراسر زیادتی ہے..... کتنی خوبصورت گم گو متین و سنجیدہ اور کم عمر بچی ہے..... اس بدنصیب نے دنیا کا دیکھا ہی کیا ہے..

کتنا عرصہ رہی تھی جلال کے ہاں۔ رضوان کی ماں نے پوچھا۔"

"یہی کوئی چھ ماہ۔"!

"اوہو۔ اسی لئے کہتے ہیں..... کہ خدا کسی دشمن کو بھی بیٹی نہ دے"۔ رضوان کی ماں نے افسردگی سے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے کہا۔

آخر کار بہت منانے سمجھانے پر نعیم کی ماں رضامند ہو گئی۔ کہ وہ انجم کے ساتھ چلی جائے گی۔ اگر دل لگا تو وہیں رہ جائے گی۔ ورنہ پھر آجائے گی۔

اس طرح یہ دل برداشتہ قافلہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا..... شب و روز کا چکر چلنے لگا...... رضوان یکسر بدل چکا تھا...... نہ وہ ولولے رہے...... نہ وہ حوصلے رہے۔ زیادہ سے زیادہ وقت دفتر میں گذارتا۔ دورے کرتا..... گھر میں آتا تو بالکل ایک اجنبی کی طرح..... روٹی کھائی...... نماز پڑھی۔ اب تو وہ باقاعدگی سے نماز بھی پڑھنے لگا تھا...... اور پھر کچھ دیر کامران سے باتیں کرتا...... اور بجلی بجھا کر سو جاتا...... نعیم کی ماں اس ہولناک سناٹے سے گھبرا گئی تھی۔ اور وہ بہت جلد واپس اپنے بیٹے کے پاس چلی گئی...... انجم کا بھی سارا وقت گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں گذر جاتا...... اسی محویت اسی پیار کے ساتھ وہ کامران کی پرورش کر رہی تھی...... جس طرح سعدیہ کرتی تھی...... کامران ماں کے پیار کی دوبارہ خدمت پا کر پنپنے لگا۔ اس کی صحت کی بحالی نے رضوان کی بہت بڑی مشکل حل کر دی اور وہ زیادہ وقت باہر گذارنے لگا...... انجم کو شکایت ضرور تھی۔ مگر شکوہ کیسے کرتی؟ کیا حق دیا تھا۔؟ جس حق کے برتے پر وہ اس کی موجودہ روش پر اسے ڈانٹتی......

ڈانٹنا تو خیر بہت دور کی بات تھی۔ پوچھنا چاہتی بھی تو نہیں پوچھ سکتی تھی۔ رضوان کی صحت دن بدن گر رہی تھی۔۔۔ اسے کمزور ہوتا دیکھ کر اس کا دل تو جلتا۔۔۔۔۔ مگر مجبور تھی۔۔۔۔۔

ایک شام۔۔۔۔۔ خنکی زیادہ بڑھ گئی۔۔۔۔ تو انجم رضوان کے کمرے میں آگ جلانے لگی۔ تاکہ اس کے آنے تک کمرہ گرم ہو جائے۔۔۔ اور پھر وہیں بیٹھ کر کامران کو قرآن پاک پڑھانے لگی۔۔۔ گھنٹی کی آواز سنائی دی۔۔۔۔۔ انجم جلدی سے اٹھی۔ اور جا کر دروازہ کھولا۔۔۔۔ تو وہ رضوان ہی تھا۔۔۔ بغیر کسی بات چیت کے وہ اپنے کمرے میں آگیا۔۔۔ انجم کا دل کٹ کر رہ گیا۔۔۔۔ ماضی کی ایک ایک شوخی بے چینی، بے قراری اسے یاد آگئی۔ اب کی بے اعتنائی اور سرد مہری نے اسے دل برداشتہ کر دیا۔ شاید اس کا وجود بھی وہ یہاں پر کسی مجبوری کی بنا پر برداشت کر رہا ہو۔ کاش کامران اپنے پیار کی زنجیروں سے اسے نہ باندھتا۔ تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی خوشی پوری کرنے کے لئے اس کی نظروں سے غائب ہو جاتی۔۔۔۔ جب انجم نے دھیرے سے اس کے کمرے کا دبیز پردہ سرکایا۔۔۔ تو اس نے دیکھا کہ رضوان رضائی اوڑھ کر اپنے بستر میں لیٹ چکا ہے۔۔۔

"اپنے بچے سے بھی اتنی سرد مہری۔۔۔ ظالم باپ ہے" وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔

"گڈو یہاں شور مت مچاؤ۔۔۔ جاؤ اپنے کمرے میں" رضوان نے رضائی کے اندر سے ہی ڈانٹا۔

انجم نے آہستہ سے کہا "آؤ گڈو یہاں سے چلیں۔۔۔۔ صاف کیوں

نہیں کہہ دیتے کہ تمہاری صورت دیکھنی بھی گوارا نہیں۔۔۔۔"

اور وہ دونوں خاموشی سے اٹھ کر جانے لگے۔۔۔ تو ایک ندامت سے بھری آواز سنائی دی۔۔۔۔۔

"انجم اگر بار خاطر نہ ہو تو ایک پیالی چائے بنا دو، اور دو گولیاں اسپرو بھی دے دینا۔۔۔۔"

انجم ایک لمحے کے لئے رکی۔۔۔۔ اور پھر باہر نکل گئی۔۔۔۔ گڈو کو اپنے کمرے میں اپنے بستر میں بٹھا کر جلدی سے چائے بنائی۔۔۔ ٹرے میں سب کچھ رکھ کر کمرے میں آئی۔ دراز سے اسپرو کی ڈبیا نکالی۔ وہ بھی ٹرے میں رکھی تپائی کھینچی۔۔۔۔۔ اور ٹرے رکھ دی۔۔۔۔۔

"مالک چائے بنا دوں۔۔۔؟"

"خاموشی۔"

"مالک چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔ بنا دوں۔؟"

"اگر تکلیف نہ ہو تو بنا دو۔"

انجم کا دل کٹ سا گیا۔۔۔۔ کس قدر ان کے لہجے میں تکلف آگیا ہے۔ ہر کام کرواتے ہوئے۔۔۔۔۔ تکلیف اور بار گراں کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔۔۔۔ اس کی آنکھوں میں شبنمی قطرے سے چمکنے لگے۔ اس نے چائے بنائی۔۔۔۔۔ اور پیالی بڑھاتے ہوئے کہا۔۔۔ لیجئے مالک۔"

رضوان نے رضائی سرکائی اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔۔۔ بال بکھرے ہوئے۔۔۔۔۔

آنکھیں سرخ انگارہ۔ رنگ سرخ ہو رہا تھا . . . . انجم ان کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ اور آہستہ سے پوچھا۔

" مالک! کیا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔؟"

" یونہی سر میں درد ہے۔!"

پیالی پکڑاتے ہوئے اس کا ہاتھ مالک کے ہاتھ سے ٹکرا گیا . . . . . اس نے محسوس کیا کہ وہ بخار میں پھک رہے ہیں۔

" آپ کو تو بہت سخت . رہے۔"

" یہ تو ہوتا رہتا ہے . . . ." رضوان نے لاپرواہی سے کہا۔

" خدا کے لئے کسی ڈاکٹر کو دکھائیے۔"

" ڈاکٹر کیا کرے گا۔"

" مرض پہچان کر دوا تو دے گا۔"

" اس مرض کو تم نہ پہچان سکیں تو وہ کیا پہچانے گا۔" رضوان نے کہا۔

" مالک میں ڈاکٹر کو بلا لاؤں۔!" انجم نے بات ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

" نہیں نہیں انجم ایسی کوئی بات تردد کی نہیں . . یہ تو روز ہوتا ہے۔ اور اتر جاتا ہے۔" رضوان نے اسپرو کھا کر پیالی واپس کرتے ہوئے کہا۔

انجم پیالی ٹرے میں رکھ کر کسی گہری سوچ میں غرق ہو گئی . . . . . رضوان رضائی لے کر دوبارہ لیٹ گئے وہ کن انکھیوں سے انجم کو دیکھ رہے تھے مدتوں کی سوئی ہوئی حسرت پھر سے بیدار ہو گئی۔ . . . . دل میں عجیب و غریب سا درد اٹھنے لگا . .

عاطف

وہ ایک شدت سے اسے دیکھے جا رہے تھے... کہ اتنے میں کامران کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ انجم کو بلائے جا رہا تھا..... وہ جلدی سے اٹھی۔ ٹرے اٹھائی..... اس نے غمگین آنکھوں سے رضوان کی طرف دیکھا۔ تو اس نے جلدی سے آنکھیں موند لیں۔ وہ تھکے قدموں سے باہر نکلنا چاہتی تھی... کہ درد میں ڈوبی ہوئی آواز فضا میں ابھری

"انجم کامران کو سلا کر آنا... سر میں بہت درد ہے۔"!

"آؤ گی نا۔"!

آواز میں التجا اتنی تھی..... کہ انجم کا دل بھر آیا۔

"آؤ گی نا۔"! ایک التجا پھر تڑپی۔

جانے وہ کتنے دن سے بیمار ہیں.... صحت دن بدن گرتی جا رہی ہے.... سعدیہ باجی کا غم کھا کر یہ حالت کر رکھی ہے۔ ہمدردی سے دل یک دم بھر گیا..... اور منہ موڑے موڑے آہستہ سے کہا....

"آؤں گی۔"! یہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئی...

کامران کو کھانا کھلا کر سلا دیا... کامران آج کل انجم کے پاس سو رہا تھا.. جب وہ گہری نیند سو گیا..... تو وہ دھڑکتے دل سے اٹھی۔ مگر حیا نے پھر قدم روک لئے.... "جانا چاہیئے یا نہیں۔"؟ وہ اپنے دل سے سوال کر رہی تھی...... "مالک بیمار ہیں...... ان کے دکھ سکھ میں تمہیں حصہ لینا چاہیئے۔" وہ آہستہ آہستہ قدموں سے دروازہ بند کر کے مالک کے کمرے میں آئی.... شاید وہ سو رہے ہیں۔ اس نے دل میں سوچا..... وہ کچھ دیر خاموشی سے کھڑی رہی..... رضوان

اسے رضائی کے ایک کونے سے دیکھ رہے تھے... اسے پریشان دیکھ کر آہستہ سے بولے.....

"انجم بس تھوڑی دیر کے لئے سر دبا دو۔ سارا دن کی تھکی ہاری ہو....!"

انجم لرزتے قدموں سے آگے بڑھی..... تپائی کو سرہانے کی طرف رکھا۔ اور چاہتی تھی کہ اس پر بیٹھ جائے..... رضوان بولے..

"انجم نہیں میرے سرہانے بیٹھو...."

وہ شدید کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو گئی۔ پھر دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے آہستہ سے تکیئے کے ایک کونے کے پاس بیٹھ گئی اور آہستہ آہستہ سر دبانے لگی..... ماتھا آگ کی طرح جل رہا تھا..... رضوان ایک انوکھے سرور میں کھو گیا۔ نرم نرم نازک ہاتھوں کا لمس اسے دور کہیں تصوّرات کی دنیا میں لے گیا۔ وہ سوچتا رہا۔ کہ کاش یہ ہاتھ ہمیشہ اس کے ماتھے پر رہیں۔ وقت کی نبضیں رک جائیں اور یہ حسین لمحات جاوداں بن جائیں.... اس کا جی چاہا کہ وہ اس سے باتیں کرے۔ مگر انجم نے انتہائی پیار سے اسے ڈانٹتے ہوئے خاموش رہنے کو کہا.... وہ بالکل اچھے بچوں کی طرح کہنا مان گیا۔ انجم کی مخصوص مہکتی ہوئی خوشبو نے اسے انوکھا سرور بخشا۔ سارا دن کا تھکا پریشان دماغ سکون پاتے ہی..... نیند کی وادی میں کھو گیا.... اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی.... انجم مطمئن سی ہو گئی اور اس نے اپنی بھرپور نظروں سے رضوان کا جائزہ لیا.... سویا ہوا رضوان بالکل ایک معصوم انسان نظر آیا.... ماتھے پر بکھرے ہوئے بالوں کو اس نے آہستہ آہستہ پرے

ہٹایا۔ شفاف چمکدار پیشانی بخار کی شدت سے سرخ ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ کافی دیر تک وہ سر دباتی رہی۔ یہاں تک کہ گھڑیال سے ایک بجنے کا سن کر وہ چونک اٹھی۔۔۔۔۔۔ اس نے آہستہ سے اپنے کو علیحدہ کیا۔۔۔۔۔ ان پر اچھی طرح رضائی اوڑھائی۔ ایک خواہش شدت سے ابھری۔۔۔۔۔ اس خواہش کو جتنا دبانے کی کوشش کی۔۔۔۔۔ اتنی ہی وہ شدید تر ہوتی گئی۔۔۔۔۔ وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر دھیرے دھیرے آگے بڑھی۔۔۔۔ رضوان گہری نیند سو رہے تھے۔ اس کا دل کانپنے لگا۔۔۔۔۔ معصوم ہونٹ تڑپنے لگے۔۔۔۔ اور وہ جھکی۔۔۔ اور ان کے ماتھے پر ایک ہلکا سا پیار دیا۔۔۔۔ اور جلدی سے اچھی طرح دروازہ بند کر کے باہر نکل گئی۔ اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔۔۔۔ کہ کہیں یہ حرکت رضوان نے دیکھ نہ لی ہو۔ اور اسے گستاخی سے محمول نہ کرے۔۔۔۔۔ وہ اپنے کمرے میں آئی۔ جلدی سے کنڈی لگائی۔ اور کتنی رات گئے تک کروٹیں لیتی رہی۔۔۔۔۔ یہی ڈر کہ مالک غصے میں ابھی آ کر اس کا دروازہ پیٹے گا۔ اور اس گستاخی کی وجہ پوچھے گا۔۔۔۔ گھڑیال نے چار بجائے۔ تو کہیں جا کر اس کی آنکھ لگ گئی۔ اور جب اس کی آنکھ کھلی تو شرقی دریچوں سے سنہری کرنیں ساری کمرے کو منور کر رہی تھیں۔۔۔۔۔ کہ اتنے میں آہ و بکا کے نالے سنائی دیئے۔ معلوم ہوا کہ آصف، فرحت، عاطفہ اور شہاب، سعدیہ کی تعزیت کے لئے آئے تھے۔ کامران کو آصف سینے سے لگا کر روتے رہے۔ حالات پوچھتے رہے۔ اور پھر یہ سب سعدیہ کی آرام گاہ دیکھنے کے لئے اپنی کار میں شام نگر روانہ ہو گئے۔ آصف کے بہت اصرار کے باوجود بھی رضوان کامران کو ان کے ہمراہ بھیجنے پر رضامند نہ ہوئے۔

دن ہفتوں میں۔ ہفتے مہینوں میں، اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے گئے...
زمانے میں کئی انقلابات آئے۔ بڑے بوڑھوں نے رخت سفر باندھا۔ اور نئے آنے
والوں نے ان کی جگہ سنبھالی۔ کامران کی دادی فوت ہو چکی تھیں۔ فردوس دو ننھے منے
بچوں کی ماں بن کر اسی اپنے آبائی مکان میں رہ رہی تھی۔ ڈاکٹر عرفان کی دو بڑی لڑکیوں
نزہت اور راحت کی شادیاں بھی ہو چکی تھیں۔ عفت ابھی ڈاکٹری کے پہلے سال میں
تھی...... دو چھوٹے بیٹے ایک سنیئر کیمبرج کر رہا تھا اور دوسرا فسٹ ایر کا طالب علم تھا۔
کامران انجنیئرنگ کے آخری سال میں تھا۔ عاطفہ بی اے کر رہی تھی.... اور شہاب اپنی
خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر بی اے کر چکا تھا... اور آج کل سیٹھ آصف کا دستِ
راست اور ان کے سارے کاروبار کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھا.... رضوان
کے بالوں میں چاندی جھلک آئی تھی۔ انجم نے جس جانفشانی اور عزم سے اس گھر کو سنبھالا
ہوا تھا۔ اگرچہ وہ بھی اپنی عمر کی طوفانی لہروں کو پار کر چکی تھی.... بھائیوں کے اصرار پر

بھی وہ نکاح ثانی پر تیار نہ ہوئی۔ لوگوں نے حسبِ عادت باتیں بنائیں۔ مگر جہاں خلوص کی ٹھوس بنیادیں ہوں...... وہاں لوگوں کی باتیں صدائے بازگشت بن جاتی ہیں....... انجم اس گھر کا ایک مستقل فرد بن چکی تھی۔ اس نے اپنے سایۂ عاطفت میں کامران کو پروان چڑھایا۔ جس میں کوئی غرض، کوئی لالچ پوشیدہ نہ تھا۔ وہ بے لوث خدمت سے رضوان کی محبت کا جواب محبت سے دیتی رہی۔ رضوان اس کی ہر ضرورت کو اس طرح محسوس کرتے رہے۔ جیسے یہ ان کا اولین فرض ہے۔ وہ دل کی اس تڑپتی خواہش کو کئی بار لے کر انجم کے کمرے میں گئے..... مگر اس کی معصومیت اور ٹھوس کردار کے آگے کچھ بھی تو نہ کہہ سکے... کئی مرتبہ زبان کچھ کہتے کہتے جھجک جاتی.... اور اس طرح دل کی بات دل میں رہ جاتی..... سعدیہ کی وفات کے بعد انجم نے ویسے تو اس گھر کو ہر لحاظ سے سنبھالا دیا تھا اور دے رہی تھی۔ وہ اپنا مقام پیدا کر چکی تھی..... مگر وہ یہ جرأت کبھی بھی اپنے دل میں پیدا نہ کر سکی...... کہ وہ خدانخواستہ زندگی کے کسی موڑ پر سعدیہ کی گدی سنبھالے گی۔!! وہ رضوان کی آنکھوں میں کئی بار خفیہ پیغام پڑھ چکی تھی..... کئی مرتبہ ان کے لرزتے ہونٹوں پر دل کی بات آ آ کر مچلتی رہی۔ ہر موقع پر انجم کوئی نہ کوئی کام ایسا سوچ لیتی۔ کہ بات وہیں کی وہیں دب جاتی۔ رضوان نے بھی دنیا دیکھی ہوئی تھی۔ وہ انجم کی اس دانستہ حرکت کو خوب سمجھ رہے تھے۔ بھلا ایسے مقدس رشتے کے بندھن کو وہ کس طرح بحالت جبر باندھتے۔ لہٰذا خود کو کئی کئی روز کوستے۔ اور دل پر صبر کا بند باندھ دیتے.... انجم کے کردار کی مضبوطی سے رضوان کو کیا ساری دنیا انگشت بدنداں رہ گئی.... رضوان اگر اس کے چھپے ہوئے پیار کی طرف دیکھتا۔ تو دل پانی ہو جاتا

اگر اس کی سختی یا کردار کی مضبوطی کی طرف دیکھتا۔ تو حیران رہ جاتا کہ آگ اور پٹرول کی نزدیکی بھی اس شعلے کو بھڑکا نہ سکی۔ جو ان دونوں کے مابین موجود تھا۔ دونوں خوب جانتے تھے۔ کہ وہ ایک دوسرے کے لئے نیک خواہشات رکھتے ہیں۔ اس باہمی خلوص کے برتنے پر دونوں نے اپنی زندگی کا ایک قیمتی دور گذار دیا۔ ..... اب بھی وہ ایک دوسرے کے لئے مخلص دوست تھے۔ اپنے دل کی ہر بات کو بلا جھجک ایک دوسرے تک پہنچا دیتے۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی.... گھنٹوں دنیاوی مسائل پر باتیں کرتے۔ کامران کے مستقبل کے متعلق مل کر سوچتے.... دنیا والوں کے سامنے وہ کامران کی خالہ بن کر ملتی رہی... جہاں لین دین ہوتا۔ وہاں وہ کامران کی خالہ بن کر پہنچتی اور اس طرح حقِ دنیاداری ادا کرتی رہی۔ کامران نے بھی اپنے ہوش میں اسے خالہ کے رشتے سے پہچانا۔ اور اس طرح عظیم و مقدّس رشتے کی لاج انجم نبھاتی آئی.... رضوان گھر میں داخل ہوئے تو ان کے ہاتھ میں ایک تار کا لفافہ تھا۔

"تار آیا ہے"

"کس کا الٰہی خیر۔؟" بے ساختہ آٹا گوندھتے ہوئے اس کے منہ سے نکلا.... جھٹ ہاتھ دھو کر کھڑی ہو گئی.....

"تم بتاؤ۔؟ تمہارا کیا خیال ہے کس کا تار آیا ہوگا" بہت دنوں کے بعد رضوان نے پھر شوخی سے کہا...

"دیکھئے! ابھی آپ نہ چھوڑئیے۔ خدا کے لئے مجھے پریشان نہ کیجئے۔ فردوس تو بخیریت ہے نا۔؟"

"ارے.... ارے.... اتنا چھوٹا دل.... بھئی کہیں رو نہ پڑنا.....

بھابی صاحبہ معہ عاطفہ اور شہاب کے تشریف لا رہی ہیں۔" رضوان نے سگریٹ کا بھرپور کش لیتے ہوئے کہا۔

"آپ بڑے وہ ہیں۔" میرا تو دل ہی خوف سے ڈوبا جا رہا تھا.....!"

"اچھا بھئی اب تو خوش ہو' نا۔" جلدی سے دو کمرے ٹھیک کر دو۔ مہمانوں کے لئے.... بھابی اپنے کافی لمبے پروگرام کے تحت زندگی میں پہلی بار تشریف لا رہی ہیں۔!"

"ایک کمرہ اپنا۔ اور ایک اس کے ساتھ والا تیار کر دوں گی۔ اس کی تو تم فکر نہ کرو.....!" دونوں میں اتنی بے تکلفی ضرور پیدا ہو چکی تھی کہ اب مالک کی بجائے تم ضرور وہ کہہ دیتی۔

"اور تم کہاں جاؤ گی۔؟"

"میری فکر نہ کیجئے۔!"

"ہاں ویسے فکر کی تو ضرورت نہیں۔ میرا کمرہ جو حاضر ہے.....!" رضوان نے زندہ دلی سے مذاق کرتے کہا.....

"اے ہے! کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کوئی سنے تو کیا کہے۔؟ بڑھاپے میں دماغ سٹھیا گیا ہے۔!"

"دماغ تو ساری زندگی ہی سٹھیاتا رہا..... مگر تم پاگل خانے لئے دکھتی رہیں۔" رضوان نے ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

عاطفہ

"میں ذرا کامران کو خوشخبری سنا دوں۔ اپنے کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا ہے"۔ انجم نے رضوان کی بے قرار نظروں سے بچتے ہوئے کہا۔ اور تیز تیز قدموں سے کامران کے کمرے کی طرف بڑھ گئی...... رضوان آج بھی وہی خلش دل میں محسوس کر رہے تھے۔ جو اسے دیکھ کر جوانی کے عالم میں محسوس کر رہے تھے۔ شاید کسی نے سچ کہا ہے۔ "کہ محبت سدا جوان رہتی ہے۔ بشرطیکہ اس میں خلوص و سچائی موجود ہو"۔ بناوٹ غرض، اس خلوص کی جڑیں کاٹ دیتی ہے۔ اس محبت میں تو دو دن کے بعد اندھیری راتیں شروع ہو جاتی ہیں..... رضوان وہیں کرسی پر دھوپ میں بیٹھ گئے.... ذہن تیزی سے ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔ انجم کی محبت کو اس نے ہمیشہ آسمان کی بلندی پر پایا۔ اگرچہ وہ کئی بار بہکا..... مگر انجم ایک مخلص ساتھی کی طرح آہستہ سے اس کا ہاتھ پکڑ کر سیدھی راہ پر لے آتی رہی۔ اور کئی بار اسے اس کے سامنے ندامت بھی آتی رہی۔ مگر ایک ہمدرد ساتھی کی طرح وہ کبھی بھی اس کی کسی لغزش کو دوہرا کر اسے شرمندہ نہیں کرتی رہی...... بلکہ اپنا دامن اتنا پاک رکھا... اور ایسا ماحول قائم کیا۔ جہاں تنہائی نہ ہو۔ جہاں شیطان کا بسیرا نہ ہو۔ جب بھی وہ کچھ کہنے لگتا...... وہ فوراً سعدیہ کا ذکر چھیڑ دیتی۔ یا پھر موقع سے فائدہ اٹھا کر کسی مصروف کام میں محو ہو جاتی.... اور اس طرح وہ طوفانی ریلہ بخیر و خوبی گذر جاتا۔ بعد میں وہ اس کی دانائی و فراست پر دنگ رہ جاتا۔ حقیقت ہے تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ جب تک جذبات جذبات کی پذیرائی نہ کریں، کسی کو آگے بڑھنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ گناہ کا ماحول انسان خود ساز گار کرتا ہے۔ جذبات کو انسان خود ہوا دیتا ہے.. اور پھر بعد میں ایک

دوسرے کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے...... اگر انسان خود کو کنٹرول کرنا جانتا ہو۔ انجم جیسی معصوم سیرت لڑکی کی موجودگی میں بھی بہک نہیں سکتا.... جو دن رات اس گھر میں رہتی رہی..... انجم کامران کو خوشخبری سنا کر خوش لوٹی۔ تو رضوان کو اپنے خیالوں میں گم پا کر ٹھٹھک گئی...... دل میں اک درد کی لہر اٹھی... مگر خود پہ فوراً قابو پالیا...... اور ہنستے ہوئے بولیں....

"کامران پوچھ رہا ہے کہ کب مہمان آرہے ہیں۔" یہ تو میں تم سے پوچھنا بھول گئی تھی۔!"

"کل۔" رضوان نے خیالوں کے سراب سے چھٹکارا پاتے ہوئے کہا۔

"ابو جانی۔ کون کون آرہے ہیں۔" کامران خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے دوبارہ پوچھ بیٹھا....

"کیا تمہاری ماں...... تمہاری خالہ نے تمہیں نہیں بتایا...." رضوان لفظ ماں پہ رک گئے اور مجوب ہوتے ہوئے سر جھکا لیا....

"تمہاری حماقی.... عاطفہ اور شہاب سبھی آرہے ہیں۔" انجم نے جھٹ بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"ماموں آصف۔!"

"انہیں ابھی کام ہے۔ ٹھہر کر آئیں گے۔" انجم نے دل سے بات بناتے ہوئے کہا۔

کامران نے اندازِ بے خودی سے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا... ایک مسحور کن

تصوّر نے اس کے رگ و پے میں بجلی سی دوڑا دی۔ خوابیدہ سی نظروں نے عاطقہ کا تصو
اور اجاگر کر دیا۔۔۔ اس کی بچپن کی منگیتر۔ اس کی تمناؤں کا مرکز۔ اور اس گھر کی رونق۔۔
آرہی ہے۔ خدا کرے آج کا دن وقت کی پابندی ختم کر کے کل کا اعلان کر دے۔۔۔۔
اس نے چور تبسم ہونٹوں میں دبائے انجم خالہ کی طرف دیکھا۔۔۔۔ جو بڑی تیزی سے
سبزی بنانے میں مصروف تھیں۔۔۔۔ اپنی اس وارفتگی پر وہ دل ہی دل میں ہنسا۔۔۔
اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وارڈروب کھول کر مختلف سوٹوں
کا معائنہ کرنے لگا۔۔۔ کوئی بھی سوٹ اس کی نگاہ میں نہیں جچ رہا تھا۔۔۔ کہ وہ کل
عاطقہ کی آمد پر پہنتا۔۔۔ ایک سرمئی سوٹ پر اس کی نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ خوب شاندار
کلف شدہ قمیض نکالی۔۔۔۔ اور سرخ کالی دھاریوں والی ٹائی سے اس کی میچنگ
کی۔۔۔ اپنے اس شاندار انتخاب پر خود ہی مسکرایا۔۔۔۔ اور یہ سوچ کر، کہ ابھی تو دن
کے بارہ بجے ہیں۔۔۔ دل ہی دل میں شرمندہ ہو گیا۔ کہ ایسی بھی کیا بیقراری۔؟

خدا خدا کر کے کل کا دن چڑھا۔ ہارن کی آواز سن کر رضوان اور کامران باہر نکلے۔۔
عاطقہ نے جھک کر سلام کیا۔۔۔۔ اور شہاب نے بڑی عقیدت سے رضوان کے
ہاتھوں کو چوما۔۔۔ عاطقہ نے چاکلیٹی رنگ کی ساڑھی پر کالی سوئیٹر پہن رکھی تھی۔۔۔۔
چاکلیٹی رنگ کے پتھروں کا بڑا خوبصورت زیور پہنا ہوا تھا۔۔۔ لمبے لمبے دراز بالوں
کو بڑی خوبصورتی سے چوٹی کی شکل میں گوندھا ہوا تھا۔ بائیں ہاتھ میں پلاٹینم کی بیضوی ننھی سی
رسٹ واچ بندھی تھی۔۔۔۔ پاؤں میں کالے سانچر کی اونچی ہیل نے اس کی شخصیت
کو اور پرکشش بنا رکھا تھا۔۔۔ کنواری ادھ کھلی کلیوں کی مسکراہٹ اس کے یاقوتی

لبوں پر رقصاں تھی.... شہابی رنگت پر مخمور و سحر آگیں آنکھوں نے روئے تاباں کو شعلہ رو بنا رکھا تھا..... کامران کا آئیڈیل۔ اپنی بھرپور رعنائیوں کے ساتھ اس کے سامنے جلوہ فگن تھا۔ جب اس نے اپنے ننھے ننھے مرمریں ہاتھوں کو ماتھے پہ لے جاکر آداب کیا... تو اس کے صبر و ضبط کی بنیادیں لرز گئیں..... مگر اخلاق و حدود کو پھلانگنا اس کی ہمت سے باہر تھا.... اس نے آہستگی سے کہا.....

"عاطفہ اچھی تو ہو"

"جی۔" ایک لرزیدہ سی آواز سنائی دی۔

شہاب دزدیدہ نگاہوں سے کامران کی بے قراریاں نوٹ کر رہا تھا اس کی آنکھوں میں مچلتی ہوئی بجلیاں وہ دیکھ چکا تھا.... اس نے خندہ پیشانی سے کامران کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"دوست تم تو ٹھیک ہو۔"

"تمہاری دعاؤں سے" کامران نے ہلکا سا طنز کرتے ہوئے کہا۔ اس نے دیکھا شہاب فاختی سوٹ میں مردانہ وجاہت کا جیتا جاگتا مجسمہ لگ رہا تھا۔ سفید شہابی رنگت کالے گھنگھریالے بال.. کشادہ پیشانی.... ستواں ناک.... سرخ انگارہ سے ہونٹ.... دراز قامت.... گداز جسم.... سفید سفید موٹے موٹے ہاتھ جن کی پشت پہ ہلکے ہلکے سنہری بال اس کی مردانہ وجاہت کو اور شاندار بنا رہے تھے۔ ایک ہاتھ میں قیمتی پتھر کی موٹی سی انگوٹھی.... اور دوسرے ہاتھ میں ایک شاہانہ سی قیمتی گھڑی اسے بالکل خوابوں کا شہزادہ ظاہر کر رہی تھی.... چند لمحوں کے لئے اس کے دل

تصوّر نے اس کے رگ و پے میں بجلی سی دوڑا دی۔ خوابیدہ سی نظروں نے عاطفہ کا تصو اور اجاگر کر دیا۔۔۔ اس کی بچپن کی منگیتر۔ اس کی تمناؤں کا مرکز۔ اور اس گھر کی رونق۔۔ آرہی ہے۔ خدا کرے آج کا دن وقت کی پابندی ختم کر کے کل کا اعلان کر دے۔۔۔۔ اس نے چور تبسم ہونٹوں میں دبائے انجم خالہ کی طرف دیکھا۔۔۔۔ جو بڑی تیزی سے سبزی بنانے میں مصروف تھیں۔۔۔۔ اپنی اس وارفتگی پر وہ دل ہی دل میں ہنسا۔۔۔ اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وارڈروب کھول کر مختلف سوٹوں کا معائنہ کرنے لگا۔۔۔۔ کوئی بھی سوٹ اس کی نگاہ میں نہیں جچ رہا تھا۔۔۔ کہ وہ کل عاطفہ کی آمد پر پہنتا۔۔۔۔ ایک سرمئی سوٹ پر اس کی نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ خوب شاندار کلف شدہ قمیض نکالی۔۔۔۔ اور سرخ کالی دھاریوں والی ٹائی سے اس کی میچنگ کی۔۔۔ اپنے اس شاندار انتخاب پر خود ہی مسکرایا۔۔۔۔ اور یہ سوچ کر کہ ابھی تو دن کے بارہ بجے ہیں۔۔۔ دل ہی دل میں شرمندہ ہو گیا۔ کہ ایسی بھی کیا بیقراری۔؟

خدا خدا کر کے کل کا دن چڑھا۔ ہارن کی آواز سن کر رضوان اور کامران باہر نکلے۔۔ عاطفہ نے جھک کر سلام کیا۔۔۔۔ اور شہاب نے بڑی عقیدت سے رضوان کے ہاتھوں کو چوما۔۔۔ عاطفہ نے چاکلیٹی رنگ کی ساڑھی پر کالی سوئیٹر پہن رکھی تھی۔۔۔۔ چاکلیٹی رنگ کے پتھروں کا بڑا خوبصورت زیور پہنا ہوا تھا۔۔۔ لمبے لمبے دراز بالوں کو بڑی خوبصورتی سے چوٹی کی شکل میں گوندھا ہوا تھا۔ بائیں ہاتھ میں پلاٹینم کی بیضوی ننھی سی رسٹ واچ بندھی تھی۔۔۔۔ پاؤں میں کالے سانبھر کی اونچی ہیل نے اس کی شخصیت کو اور پرکشش بنا رکھا تھا۔۔۔ کنواری ادھ کھلی کلیوں کی مسکراہٹ اس کے یاقوتی

لبوں پر رقصاں تھی.... شہابی رنگت پر مخمور و سحر آگیں آنکھوں نے روئے تاباں کو شعلہ رو بنا رکھا تھا.... کامران کا آئیڈیل۔ اپنی بھرپور رعنائیوں کے ساتھ اس کے سامنے جلوہ فگن تھا۔ جب اس نے اپنے ننھے ننھے مرمریں ہاتھوں کو ماتھے پہ لے جا کر آداب کیا.... تو اس کے صبر و ضبط کی بنیادیں لرز گئیں.... مگر اخلاق و حدود کو پھلانگنا اس کی ہمت سے باہر تھا.... اس نے آہستگی سے کہا....

"عاطفہ اچھی تو ہو۔"

"جی۔" ایک لرزیدہ سی آواز سنائی دی۔

شہاب دزدیدہ نگاہوں سے کامران کی بے قراریاں نوٹ کر رہا تھا اس کی آنکھوں میں مچلتی ہوئی بجلیاں وہ دیکھ چکا تھا.... اس نے خندہ پیشانی سے کامران کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"دوست تم تو ٹھیک ہو۔؟"

"تمہاری دعاؤں سے"! کامران نے ہلکا سا طنز کرتے ہوئے کہا۔ اس نے دیکھا شہاب فاختئی سوٹ میں مردانہ وجاہت کا جیتا جاگتا مجسمہ لگ رہا تھا۔ سفید شہابی رنگت کالے گھنگھریالے بال.. کشادہ پیشانی.... ستواں ناک.... سرخ انگارہ سے ہونٹ.... دراز قامت.... گداز جسم.... سفید سفید موٹے موٹے سے ہاتھ جن کی پشت پر ہلکے ہلکے سنہری بال اس کی مردانہ وجاہت کو اور شاندار بنا رہے تھے۔ ایک ہاتھ میں قیمتی پتھر کی موٹی سی انگوٹھی.... اور دوسرے ہاتھ میں ایک شاہانہ سی قیمتی گھڑی اسے بالکل خوابوں کا شہزادہ ظاہر کر رہی تھی.... چند لمحوں کے لئے اس کے دل

میں احساسِ کمتری پیدا ہوا . . . . مگر فوراً اپنے اس جذبے کو عاطفہ کے ساتھ کھڑے ہو کر دبا لیا . . . . ہمائی سرمئی رنگ کے گرم سوٹ اور سفید شال کندھوں پر ڈالے ایک معزز خاتون نظر آ رہی تھیں ۔ ان کے چہرے پہ ایک طمانیت سی چھائی ہوئی تھی . . . .
عاطفہ نے اپنی دراز پلکوں کو اٹھا کر ایک بار پھر کامران کی طرف دیکھا . . . . اُسے اپنی جانب دیکھتا پا کر وہ ٹپٹا کر رہ گئی . . . . اسی لمحے کامران نے دیکھا . . . . کہ شہاب کے یاقوتی لبوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ کھیل گئی . . . . اس نے جھلائے انداز میں کہا . . .

"چلیے اندر ۔ !"

اور یہ کامران یہ قافلہ گھر میں داخل ہوا . . . . انجم نے گرم جوشی سے سبھوں کا استقبال کیا ۔ عاطفہ کو اپنے سینے سے لگا کر ایک عجیب سی ٹھنڈک محسوس ہوئی کہ یہ اس کی ہونے والی بہو ہے . . . . اور شہاب کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے بڑے پیار سے پوچھا ۔

"بیٹے سفر کیسے گذرا ۔ ؟"

"بہت اچھا ۔ ایک شاندار یادگار سفر بن گیا . . . ." سب ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے ۔ آتشدان میں آگ جل رہی تھی ۔ کمرہ خاصا گرم تھا . . . . انجم اور فرحت کھل کر باتیں کر رہی تھیں . . . . رضوان شہاب سے باتیں کر رہے تھے ۔ اور کامران عاطفہ سے . . . . شہاب کبھی کبھار دزدیدہ نگاہوں سے کامران کی طرف دیکھ کر ایک جلتی مسکراہٹ لبوں پر لے آتے . . . . جو عاطفہ کو دیکھ کر بجھے جا رہے تھے ۔ عاطفہ شہاب کی فسوں کار نظروں کا مفہوم خوب سمجھتی تھی . . . . وہ بے تکلف کامران سے

باتیں کرنے لگی.... اور کامران پر ہیجانی کیفیت کا دورہ پڑنے لگا.... کبھی ایک دم سرخ ہو جاتے۔ اور کبھی مسلسل خاموشی۔!! انجم چائے بنا کر لائی.... تو فرحت نے عاطقہ کو اشارہ کرتے ہوئے کہا....

"عطی اٹھ کر چائے بناؤ۔!"

عاطقہ ماں کے حکم پر ایک دم اٹھی.... ساڑھی کا پلو بار بار سر سے کھسکا جا رہا تھا۔ اسے بالوں کی پن سے پھنساتے ہوئے بڑے ادب و احترام سے اٹھی... اور چائے بنانے لگی...... اس نے جان بوجھ کر کامران کی پیالی میں چینی نہیں ملائی... سب چائے پی رہے تھے۔ عاطقہ نے ایک نشیلی مسکراہٹ سے شہاب کی طرف دیکھ کر کامران سے پوچھا۔

"چینی کم تو نہیں۔؟"

"نہیں نہیں... تمہارے ہاتھوں کی بنی ہوئی چائے۔ اور اس میں چینی کم ہو.... تم چینی نہ بھی ڈالو۔ تو چائے یقیناً میٹھی ہو گی" کامران نے کمال ڈھٹائی سے کہا۔ شہاب نے نیم وا نگاہوں سے عاطقہ کی طرف دیکھا.... اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔

"در بے وقوف بناؤ۔!"

چائے پینے کے بعد رضوان اور فرحت دھوپ میں کرسیاں بچھا کر بیٹھ گئے... انجم باورچی خانے میں ان کے لئے کھانا پکانے کے لئے چلی گئی۔ کامران شہاب اور عاطقہ آزادی ملتے ہی کھل کر ہنسنے لگے.... شہاب نے محسوس کیا کہ

عاطقہ

اس کی ہر بات کو کامران ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور اس کی ہر بات کو رد کرنا بڑا فخر سمجھتا ہے۔ کامران پروگرام سٹ کرنے لگا.... شہاب خموشی سے سنتا رہا.... جب وہ کسی معاملے میں نہیں بولا۔ تو عاطفہ نے اس کی رائے لینا ضروری سمجھا۔

"کیوں شہاب پھر آج پکچر کا پروگرام رہا نا۔؟"

"ٹھیک ہے۔" اس نے بے دلی سے کہا۔

کھانا کھاتے ہوئے بھی شہاب نے محسوس کیا... کہ کامران عجیب و غریب نظروں سے عاطفہ کو دیکھتا ہے.... پوری میز پر اسے سوائے عاطفہ کے کوئی نظر نہیں آتا۔ کبھی ایک ڈش بڑھاتا ہے تو کبھی دوسری.... انجم اور رضوان بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے..... اس نے شرارت آمیز لہجے میں کہا...

"بھئی پلاؤ کی ڈش ذرا یہاں بھی بڑھا دو۔ کوئی یہاں بھی بیٹھا ہے..."

عاطفہ نے ہنستے ہوئے ڈس بڑھا دی اور کامران جھینپ سا گیا... بڑے ہنسنے لگے۔ کھانا کھا کر کچھ دیر رسٹ کیا.... شام کی چائے بند کمرے میں ہی پی گئی۔ کیونکہ موسم ابر آلود ہو رہا تھا... سارا آسمان کالی گھٹاؤں سے بھر رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی..... شہاب چغہ پہن کر عاطفہ کے کمرے میں آئے۔ دیکھا تو وہ زرد ساڑھی پر کالا کوٹ پہنے بہت ہی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی..

کہاں کی تیاری ہو رہی ہے عطی۔؟"

"پکچر نہیں چلنا۔؟"

"موسم خراب ہے ..." شہاب نے گلہ آمیز لہجے میں کہا۔

"نہیں نہیں بُری بات ہے۔ ہم نے اپنی گاڑی میں چلنا ہے ... پھر پروگرام طے کر کے کینسل کرنا بری بات ہے۔" عاطفہ نے سفید موتیوں کی مالا پہنتے ہوئے شہاب کی طرف منہ کر کے کہا ...

"کیا وہ کامران کا کہا ٹالا نہیں جا سکتا۔؟" شہاب نے سوگوار لہجے میں کہا ...

"بس شک و شکوک شروع ہو گئے ..." عاطفہ نے معصومیت سے چھیڑا ...

"بھئی وہ تو تمہارا کزن ہے ... شک و شکوک کی کیا بات ہے۔؟"

"نگہت اڑی جا رہی ہے .... شاہی ... خدا کے لئے مجھے زندگی بھر غلط نہ سمجھنا ..." عاطفہ کا ایک لہجہ ایک شرمیلا ہو گیا ...

"عطی۔ کل رات ابّو اور امّی جس موضوع پر بات کر رہے تھے ..... یہ کامران بھی اسی رشتے پر اترائے جا رہے ہیں۔ میرا تو دل بے قابو ہو رہا ہے ....." شہاب نے اس کی موتیوں کی لڑی کو پیچھے سے بند کرتے ہوئے کہا ... جو عطی سے سے بند نہیں ہو رہی تھی ... یک بارگی اس کی مخصوص خوشبو نے اس کی مہکتی سانسوں نے شہاب کو اور زیادہ سوگوار کر دیا ...؟"

"عطی۔ کہیں میری محبت کے تاج محل کو مسمار نہ کر دینا۔!"

"شاہی اللہ۔ ایسی باتیں سوچنا چھوڑ دو۔ عطی تمہاری ہے اور سدا تمہاری رہے گی!" وہ بلا وجہ انگوٹھی کو انگلی میں گھمانے لگی ... پلکیں حیا کے بوجھ سے زمین بوس ہونے لگیں۔

"اور وہ بچپن کے منگیتر صاحب کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔؟"

"شاہی والدین اتنے سنگدل نہیں ہوتے..... وہ اپنی اولاد کی خوشیوں کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ ابّو جانی میرے احساسات کو بخوبی سمجھتے ہیں۔" عطی نے حوصلہ دلاتے ہوئے کہا۔

"خدا جانے عطی۔ جب یہ بیسویں صدی کے عاشق تمہارے آگے پیچھے پھرتے ہیں تو اتنا غصہ آتا ہے۔ کہ جی چاہتا ہے کہ اس کے سب بل کس نکال دوں۔ آج ہی کھانے کی میز پر اس حضرت کی حرکات نوٹ کیں تم نے۔؟"

"پگلے۔ ابھی آئے چھ گھنٹے بھی نہیں گذرے۔ اور رقابت میں جلنے لگے۔ ہم تو سیر و تفریح کے لئے آئے ہیں۔ چند دن اچھے گذار کر چلے جائیں گے"۔ عاطفہ نے سمجھاتے ہوئے کہا.....

"عطی۔ خدا کے لئے اُسے لفٹ نہ دینا۔"

"شاہی پاگل نہ بنو۔ تم تو اپنے آپ کو بہت باحوصلہ سمجھتے ہو..... ذرا دیکھو تو۔ وہ کتنے پانی میں ہے۔"

"یعنی میں آنکھیں بند کئے۔ ہونٹوں پر قفل لگائے خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہوں۔"

"دیکھو تو سہی بنتا کیا ہے۔؟"

"ہمتوا۔ میں بھی کوئی گل ہوں کہ خموش رہوں..... عطی یہ میرے اختیار میں نہیں۔" شہاب نے بے بسی سے کہا.....

"تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں - اپنی عطی پر اعتبار نہیں کہہ دو۔۔۔ کہہ دو۔۔۔!"
عاطفہ کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔۔

"تم پہ تو اعتبار ہے اپنے دل پہ نہیں۔ شہاب نے جلدی سے کہا!"

"بس ذرا حضرت کو دیکھتے جاؤ۔۔۔ کہ کتنی مسکین صورت بنائے میرے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ شابی ایک چلنا پھرتا ڈرامہ ہی سہی۔ تم بالکل لاپرواہ ہو جاؤ۔۔ جب یہ تمہیں اپنی راہ سے الگ پائیں گے تو ان کی نوازشیں بھی بیہم بڑھ جائیں گی۔ پھر ہم انہیں مل کر خوب بے وقوف بنائیں گے۔۔۔۔۔!" عاطفہ نے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔۔

"عطی دوسروں کا مذاق اڑاتے اڑاتے کہیں ہم خود بے وقوف نہ بن جائیں" شہاب نے آہستگی سے کہا۔

"آج تم کیسی باتیں کر رہے ہو شابی۔۔۔ چلو کار نکالو۔۔۔ میں ذرا امی سے مل لوں۔" اتنے میں ہلکی ہلکی پھوار شروع ہو گئی۔ عطی شابی کا ہاتھ پکڑے برآمدے میں لے آئی۔۔۔ گھنگھور گھٹائیں امنڈ امنڈ کر آ رہی تھیں۔۔۔۔ مگر شہاب کھوئے کھوئے سے رہے۔۔۔ اتنے میں کامران اپنے کمرے سے خوب بن ٹھن کر نکلے۔۔۔۔ فرانسیسی سینٹ کی شاندار خوشبو سارے برآمدے میں پھیل گئی۔۔۔ وہ شہاب کی موجودگی کو قطعی نظر انداز کر کے عاطفہ کے کمرے کی طرف بڑھا۔ تو مجبوراً شہاب کو اخلاقی حدود کا خیال رکھنا پڑ ہی گیا۔۔۔۔

"عطی امی کے پاس گئی ہیں۔!" وہ لاپرواہی سے سگریٹ کے کش

لیتے ہوئے بولے۔۔۔

"او، شکریہ"! کامران نے بھی اخلاق سے کام لیتے ہوئے کہا۔۔۔ مگر اسے شہاب کی یہ بے تکلفی ذرا بھی نہ بھائی۔ کہ وہ عاطفہ کو کس مزے سے عطی کہتا ہے کہ اتنے میں عاطفہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ سامنے سے آتی دکھائی دی اپنے نازک ہاتھ سے ساڑھی کا پلو تھامے وہ سامنے آگئی۔ کامران یہ قیامت خیز منظر دیکھ کر سکتے میں آگئے۔۔۔۔۔

"عطی۔ یہ کس کے قتل کا سامان کیا جا رہا ہے۔؟ ایک گھٹا آسمان پر۔ اور دوسری تمہارے شانوں پر لہرا رہی ہے۔۔۔۔۔"! کامران نے اس کی دراز ادھ کھلی چوٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"عاطفہ نے اپنے سیاہ بکھرے بالوں کو شانوں سے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا کامران۔۔۔۔ مجھے عطی نہ کہا کرو۔۔۔"!

"کیوں کیا اس پر شہاب کا حق ہے"؟

"نہیں نہیں ایسی بات تمہیں زیب نہیں دیتی۔۔۔۔ تمہارے منہ سے عاطفہ ہی اچھا لگتا ہے۔۔۔"! عاطفہ نے دیکھا۔۔۔۔ شہاب کی آنکھوں میں گہرے غم کے سائے سے لہرا گئے۔

"سینما کا پروگرام ہے یا انہوں نے کینسل کر دیا۔"! کامران نے شہاب کی طرف بے رخی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔۔۔

"کامران بھیا میں تو اس حسین موسم سے پورا پورا انصاف کرنا چاہتا ہوں"!

شہاب نے عاطقہ کے اشارے پر ایک دم اپنا موڑ بدلتے ہوئے کہا۔۔۔

"تو پھر کار نکالیئے۔ وقت جا رہا ہے۔۔۔!" عاطقہ نے کہا۔

جب بیٹھنے کا وقت آیا۔ تو عاطقہ شہاب کے ساتھ بیٹھنا چاہتی تھی۔۔۔

شہاب نے کمال دریادلی سے کام لیتے ہوئے کہا۔۔۔

"بھئی! تم پیچھے بیٹھو۔!"

عاطقہ پیچ و تاب کھا کر پیچھے بیٹھ گئی۔۔۔

کامران آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہا تھا۔ مگر عاطقہ نے ایک چپ اختیار کر رکھی تھی کہ اچانک اس نے عاطقہ کا ہاتھ تھامنا چاہا۔۔۔ شہاب سے اسٹیرنگ چھوٹتے چھوٹتے بچا۔۔۔ وہ شیشے سے ان کی سب حرکات نوٹ کر رہا تھا۔ کہ اچانک عاطقہ ذرا فاصلے پر بیٹھتی ہوئی بولی۔۔۔۔

"کامران بھائی! مجھے ایسی باتیں بالکل پسند نہیں۔!"

"اوہ۔ معاف کر دیجئے گا۔۔۔!" کہہ کر وہ کھڑکی کے شیشوں سے بارش کا منظر دیکھنے لگا۔۔۔ شہاب کے ہونٹوں پر ایک پراسرار سی مسکراہٹ آ گئی۔۔۔ پکچر کے دوران بھی عاطقہ چپ چپ سی رہی۔۔۔۔ فلم کا اختتام خاصہ دردناک نظر تب بھی وہ خاموش ہی رہی۔۔۔ فلم کا اختتام خاصہ دردناک نظر آ رہا تھا۔۔۔۔ ہیرو مر جاتا ہے۔۔۔۔ اپنی محبت کی شان رکھتے ہوئے۔۔۔۔ اور ساری عمر۔۔ سسکنے کے لئے ہیروئن رہ جاتی ہے۔۔۔۔ عاطقہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلک اٹھے۔۔۔۔ دراصل فلم سے زیادہ اس اندھیرے میں شہاب کی دوا داس

نگاہیں اس کا طواف کر رہی تھیں۔ اسے روتا دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا۔۔۔۔ آہستہ سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"عطی پگلی یہ تو ایک کھیل ہے۔۔۔۔۔ اپنے قیمتی آنسو ایسے کھیلوں پر مت بہاؤ!"

"کھیل کھیل میں ایسا دردناک انجام دیکھ کر میرا تو دل پھٹنے لگا ہے۔۔۔"! اس نے شہاب کی طرف منہ کر کے آہستہ سے کہا۔۔۔۔ ان دونوں کو آہستہ آہستہ باتیں کرتا دیکھ کر کامران کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔۔۔۔

"کیا بات ہے عاطقہ۔؟"

"شہاب نے دھیرے سے اپنا ہاتھ کھسکا لیا۔۔۔ اور بات بناتے ہوئے کہا۔ مجھے پیاس لگی ہے۔ میں شہاب سے پانی لانے کو کہہ رہی تھی۔"!

او! عاطقہ مجھے بھی کبھی اپنی خدمت کے لائق سمجھ لیا کرو۔۔۔ میں لاتا ہوں پانی۔ یہ کہہ کر وہ اندھیرے میں کرسیاں ٹٹول کر باہر نکلنا چاہتا تھا۔۔۔ کہ ایک حضرت کے پھیلے ہوئے پاؤں کی ٹھوکر سے گرنے لگے۔۔۔۔ شہاب کی آواز اندھیرے میں ابھری۔۔۔۔۔

"کامران اندھیرے میں چلو گے تو ٹھوکر کھا ہی جاؤ گے۔۔۔۔۔ یہ لو بیٹری اب راستہ صاف ہے۔۔۔ باہر کا۔۔۔"!!

"شکریہ۔ میں آپ کی بیٹری کے بغیر بھی اپنی منزل ڈھونڈ سکتا ہوں۔" کامران نے اپنی شکست قبول نہ کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔

جب وہ چلا گیا۔۔۔ تو شہاب نے پھر عاطقہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"علی۔ بڑا خود سر، ضدی، اور حاسد قسم کا انسان ہے۔ مجھے اپنی تقدیر سے جانے کیوں ڈر لگنے لگا ہے۔۔۔!"

"شابی تمہاری تقدیر تو میں ہوں۔ بھلا مجھ سے بھی ڈرنے لگے ہو۔۔!" عاطقہ نے اس کا ہاتھ آہستہ سے چھڑاتے ہوئے کہا۔

"عطی تمہارا ساتھ رہا۔ تو میں ہر طاقت کا مقابلہ کروں گا۔ مجھے صرف تمہاری اور صرف تمہاری محبت کی ضرورت ہے۔!"

دروازہ کھلنے سے تھوڑی سی تیز روشنی سبھوں کے چہروں پر پڑی۔ یہ دونوں بھی سنبھل کر بیٹھ گئے۔۔۔۔ عاطقہ نے اندھیرے میں ایک گھونٹ بھرا۔۔۔ اور فوراً ہی کلی کر دی۔۔۔

"کیوں عاطقہ۔ کیا بات ہے؟"

"اتنے تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے تو صرف سادا پانی چاہیئے تھا۔۔"

"بالکل تازہ شیزان ہے۔!"

"میں نہیں پیوں گی۔"

"سادا پانی لاؤں۔"

"چھوڑیئے بس پکچر ختم ہوا چاہتی ہے۔"

ہیروئن پاگل ہو کر ویرانوں میں اپنے پیار کو ڈھونڈتی ہے۔۔۔ اور پھر فلم ختم ہو جاتی ہے۔ ایک دم ہال میں روشنی پھیل گئی۔ سبز جھنڈا اسکرین پر لہرا رہا تھا۔ عاطقہ اپنی بھیگی بھیگی پلکوں کو جھکائے چل رہی تھی۔ جب وہ کار کے پاس

پہنچی۔ تو اسٹیرنگ پر کامران کو بیٹھا دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئی...

"آ جاؤ عاطفہ۔" اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا...

عاطفہ کا دل چاہا کہ سارے اخلاقی بندھن توڑ کر پچھلی سیٹ پر چلی جائے۔ مگر شہاب کے اشارے کو پا کر سمٹی سمٹی اگلی سیٹ پر جا بیٹھی اور بڑی بے پروائی سے شیشوں سے باہر جھانکنے لگی۔ کامران نے کار کی اسپیڈ بہت تیز رکھی۔ چند ہی لمحوں کے بعد وہ اپنے گھر کے سامنے موجود تھے...... عاطفہ سب سے پہلے اتری.... اور تیز تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔!!

انجم نے دل کھول کر اپنے مہمانوں کی خاطر مدارت کی … سارا سارا دن باورچی خانے میں رہ رہ کر طرح طرح کے کھانے پکائے۔ فرحت اس کے خلوص سے بہت ہی متاثر نظر آرہی تھی … ایک دن انجم باورچی خانے میں تھی … تو وہ رضوان کے ساتھ باہر دھوپ میں بیٹھی ہوئی تھی … باتیں انجم سے متعلق ہی ہو رہی تھیں …

"بڑی نیک اور پر خلوص عورت ہے بھیا!"

"ہاں بھابی میں خود اس کے بلند اخلاق اور عالی ظرفی سے متاثر ہوں" رضوان نے دھیرے دھیرے سگریٹ کے کش لیتے ہوئے کہا …

"کتنی بڑی ٹریجڈی سے بے چاری دوچار ہے … کیا جوانی کے عالم سے بیوگی کا دور گزار رہی ہے۔" فرحت نے سلائیاں بنتے ہوئے کہا۔

"واقعی بہت بڑی ٹریجڈی ہے … قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا

ہے۔" رضوان نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"اس گھر سے تو میں اس کی بے پایاں محبت ہی دیکھ کر حیران رہ گئی.....
ورنہ سعدیہ کی موت کے بعد تو اس گھر کا شیرازہ منتشر ہو جاتا...!"

"ہاں بھابی۔ اس نے واقعی اس گھر کو گھر سمجھا... کامران کو اتنی محبت دی
کہ میں دل کے زخموں کو چھپانے میں کامیاب رہا... ورنہ ایک رنڈوے کی زندگی
کیا ہوتی ہے۔؟ اور وہ بچے جو ماں کی محبت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان کا کیا حشر ہوتا ہے
میں تو انجم کا احسان مرتے دم تک ادا نہیں کر سکتا۔" رضوان نے اُداس لہجے میں کہا۔

"بھیّا کیا آپ اسے نکاح ثانی پر آمادہ نہیں کر سکتے۔" فرحت نے دل کی
بات کو ہیر پھیر کرتے ہوئے کہا۔

"میرا کیا زور۔" رضوان نے نیم وا آنکھوں سے فرحت کی طرف دیکھتے
ہوئے کہا...

"آپ کا تو وہ بہت احترام کرتی ہے۔ میرے خیال میں آپ کی بات کو
وہ کبھی ردّ نہ کر سکے...!"

"بھابی اس کے اور میرے درمیان جو اعتماد و خلوص کا رشتہ قائم ہے.....
اس کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم نے کبھی ایک دوسرے کے نجی
معاملات میں دخل نہیں دیا..." رضوان کے لہجے میں ایک دم بہت سا اعتماد
ابھر آیا....

بھیا جہاں پر یگانگت نہ ہو۔ باہمی خلوص ایک خاص حد تک تکلّف کے لبادے

میں نظر آئے ․ ․ ․ ․ وہاں تو یہ گھر کامیاب ہو سکتا ہے کہ ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہ دیا جائے ․ مگر جہاں اعتماد اتنا پائیدار ہو کہ ایک کمزور ہستی دنیا کا مقابلہ کر کے کر کے تن تنہا کسی اور کے گھر کو اپنا گھر سمجھ کر رہے ․ ․ ․ وہاں ایسی بات نہیں ہونی چاہیئے"

فرحت نے لمحے بھر کے لئے رضوان کو دیکھا ․ ․ ․ اور پھر اپنی سلائیوں کی طرف متوجہ ہو گئی ․ ․ ․ ․

"بھابی سچ پوچھئے تو میں نے کبھی ایسی بات کا حوصلہ ہی دل میں نہیں پایا"

"خواہ مخواہ اس کے دل میں شکوک پیدا کر دیئے جائیں ․ جبکہ میرے اپنے حالات ایسے ہوں ․" رضوان نے صاف دلی سے دل کی بات کہہ دی ․

"بھیا یہی بات تو میں کہنا چاہتی تھی ․ کہ اس کا مستقبل بھی سنور جائے گا ․ اس کی ذات کو بھی ایک ایسے مضبوط سہارے کی ضرورت ہے جو بڑھاپے میں کم از کم اس کے دکھ سکھ کا ساتھی تو بن سکے ․ ․ ․ ․ ․ خدا آپ کو خضر کی عمر دے ․ ․ ․ ․ ․ سوچیئے آپ کے دم سے تو اسے ایک گھر مل چکا ہے ․ مگر جب کامران کا دور ہو گا ․ ہو سکتا ہے ․ اس کی بیوی ہی اس کے وجود کو ایک خطرہ سمجھے ․ اور بے چاری انجم کا بڑھاپا خوار ہو جائے ․ ․ ․ ․ ․ ․ فرحت نے ایک بہت بڑی بات رضوان کے سامنے کھل کر کہہ دی ․ ․ ․

"بھابی آپ نے تو ایک بہت گہری بات کہہ کے مجھے چونکا دیا ․ میں اس بارے میں سوچ کر آپ کو کچھ جواب دوں گا ․ ․ ․ ․" رضوان نے دیکھا کہ انجم باورچی خانے سے ٹرے میں چائے کا سامان رکھے آ رہی ہے ․ تو اس نے جلدی میں

بات ختم کردی . . . .

"انجم زندہ باد —" بھابی نے چائے دیکھ کر خوشدلی سے نعرہ لگایا۔

"انجم تمہیں کیسے معلوم ہو گیا۔ ؟ کہ ہمیں چائے کی طلب ہے . . . ." رضوان نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے کہا۔

"میں اور آپ کو نہ سمجھ سکوں . . . . ." انجم کے منہ سے جلدی میں یہ فقرہ نکل تو گیا۔ ایک دم محجوب سی ہو گئی۔ مگر ایک دم بات رکھتے ہوئے بولی۔

"آپ عموماً چھٹی کے روز دس گیارہ بجے کے قریب چائے پینے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔" یہ کہہ کر جلدی جلدی اس نے چائے بنا کر پیالیاں ان کے آگے بڑھا دیں۔

"انجم تم بھی بناؤ۔"

"بھابی پیاز سرخ کر رہی ہوں جل جائے گی۔ آپ پیجئے۔ میں پھر پی لوں گی"

اتنا کہہ کر تیزی سے باورچی خانے کی طرف گھوم گئیں۔

"بے لوث ہستی ہے۔" رضوان کے منہ سے بے ساختہ نکلا . . .

"انجم یہ تینوں شیطان کے چیلے کہاں گئے ہوئے ہیں . . ." فرحت نے قدرے زور سے پوچھا۔

"بھابی ذرا بازار تک گئے ہیں . . . ." انجم نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے جواب دے دیا . . .

"بھابی میں نے کامران کے بارے میں بھی آپ سے بھیک مانگنی تھی"

رضوان نے ایک دم بات کا رخ پلٹتے ہوئے کہا۔

"بھیا عاطفہ بی اے کرے.... تو میں خود اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی ہوں۔" فرحت نے پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھابی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ سعدیہ تو دل میں حسرت لئے چلی گئی.... میں چاہتا ہوں۔ کہ اپنی زندگی میں کامران کا سہرا دیکھ لوں۔.... بدقسمت ہوں، بڑے بیٹے سے تو جیتے جی محروم ہو گیا.... پتہ نہیں زندہ ہے یا مر گیا.... مگر دل میں آج تک خلش ہوتی ہے بھابی۔!!"

"واقعی۔ اس بدنصیب بچے کا غم ہی سعدیہ کو کھا گیا.... قدرت نے اسے زندہ رکھنے کے لئے کامران تو دے دیا۔ مگر وہ اسے بھول نہ سکی...... آپ کے بھیا ہمیں لینے کے لئے آنے والے ہیں۔ آپ ان سے بات کر لیجئے گا...... اور عید کے بعد ان کو رشتۂ ازدواج میں باندھ دیں گے.... میں خود بہت فکر مند رہتی ہوں۔ آصف تو آپ کو معلوم ہے۔ اکثر بیمار رہتے ہیں.... شہاب کو اتنا سر چڑھا رکھا ہے کہ بعض اوقات مجھے اس سے بڑا خوف محسوس ہوتا ہے" فرحت نے پلاسٹک کی تھیلی سے پھر سلائیاں نکالتے ہوئے کہا....

"شہاب ویسے بڑا ذمہ دار بچہ ہے۔ خدا نظر بد سے بچائے...... آصف بھائی کا بازو بنا ہوا ہے۔۔!" رضوان نے اس کے گھٹتے لہجے کو محسوس کر کے بات نرمی سے کی۔

"آصف بھی اس پر اپنی جان دیتے ہیں۔ کیا تھا۔ اور کیا ہو گیا۔ میں سوچتی ہوں تو حیران رہ جاتی ہوں۔ کہتے تھے کہ فطرت نہیں بدل سکتی۔ مگر اس چھوکرے نے

اپنی فطرت کیسے بدلی۔؟" فرحت کے لہجے کی تلخی رضوان نے بھی محسوس کی۔

"بھابی انسان فطرتاً بدخو نہیں ہوتا۔۔۔۔ جس ماحول میں اس کی آنکھ کھلتی ہے۔اس ماحول سے وہ اپنی عادتیں بناتا ہے۔ لیکن میرا اپنا خیال ہے کہ ایک بگڑے ہوئے ماحول کے بچے کو اگر صحت مندانہ ماحول میں رکھا جائے۔ تو وہ بھی ایک باعزت شہری کی طرح اپنی زندگی گذار سکتا ہے۔۔۔۔ فطرت اس کی بُری نہیں۔۔۔۔۔ عادت بھلائی جا سکتی ہے۔۔۔" رضوان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بھیا میں تو یہی کہوں گی۔۔۔۔۔ کہ انسان اپنی عادت اور ماحول کبھی نہیں بدل سکتا شہاب کے بارے میں آپکا کیا خیال ہے۔ کیا اس کا ماحول بدلنے سے اس کی عادات پر اس کا اثر نہیں پڑا۔؟ کیا اس وقت وہ ایک سلجھا ہوا جوان نہیں۔۔۔۔؟ جس طرح آصف بھائی نے اس پر اعتماد کر رکھا ہے۔ اگر بقول آپ کے وہ ویسا ہی جوان ہوتا۔ تو آج ہر طرح فسق و فجور میں رنگا ہوتا اور خوب ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلتا۔ مگر اسے تو صحت مند ماحول بخش کر اسے ہیرے کی طرح نکھار بخشا گیا۔ جو منوں مٹی تلے اپنی اصلیت چھپائے تھا۔" رضوان نے دوسرا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو یہی خطرہ ہر دم لگا رہتا ہے۔ کہ کہیں یہ ہماری لاکھوں کروڑوں کی جائیداد اندر ہی اندر ہضم نہ کر جائے۔ آصف کی طبیعت ویسے بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ سارے کاروبار پر یہ چھایا ہوا ہے۔ میں تو کئی بار دبے لفظوں میں آصف سے کہہ چکی ہوں۔ کہ وہ وصیت نامہ لکھ دیں، تاکہ میرے ذہن کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔" فرحت نے دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا۔ رضوان کو فرحت کی اس ذہنیت سے دلی رنج پہنچا کہ جس بچے کو

چھ سات سال کی عمر میں پالا ...... اسی بچے پر اتنی نا اعتباری - اگر دلوں میں یہی نفرت رہی یہی ذہنیت رہی ...... تو اس بچے کا کوئی مستقبل نہیں ...... بلکہ اس طرح تو اس بچے کے لئے ذہنی خودکشی کا سامان تیار کیا جا رہا ہے ...... بالکل اسی طرح کہ ایک پستیوں میں گرے ہوئے بچے کو اٹھا کر آہستہ آہستہ کھڑا کرنا۔ پھر اسے بلندیوں کی طرف لے جانا - اور عین چوٹی پر پہنچ کر - اسے ان پستیوں کی طرف جھانکنے پر مجبور کرنا ... جہاں سے اسے اٹھایا گیا تھا ... یہ حقیقت ہو، یا اصلیت ..... دیکھ کر اس بچے پر کیا گذرے گی ..... یقیناً وہ وہیں سے چھلانگ لگا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے کو پستیوں میں گم کر دے گا۔ رضوان کو گہری سوچ میں ڈوبا دیکھ کر فرحت نے مسکراتے ہوئے پوچھا ...

"بھیا تم کونسی سوچ میں ڈوب گئے - ؟"

"آیئے اس کا ایک امتحان ہی لے لیں - اگر وہ ہارا - تو اس کی اصلیت ظاہر ہو جائے گی کہ وہ کس چیز سے محبت کر رہا ہے - ؟ اور اگر آپ ہاریں - تو آپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے خیالات بدلنے ہوں گے - تاکہ دنیا میں آیا ہوا یہ انسان بھی جینے کا حق مانگ سکے ....."

"کونسا امتحان ہے ؟" میں بھی سنوں - ؟ فرحت نے بصد اشتیاق پوچھا -

بھیا سے مل کر ایک اعلان کر دیجیے کہ اپنی تمام منقولہ جائیداد وہ آپ کے نام کر چکے ہیں - پھر دیکھئے شہاب پر اس کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے ؟ اگر اس کا سلوک بدل گیا - تو آپ جیت گئیں - اور اگر وہ نہ بدلا ..... تو آپ کی ہار - ؟" رضوان نے فیصلہ کن لہجے

میں کہا۔ . . .

"مجھے منظور ہے۔" فرحت نے بھی اسی فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔

اتنے میں کار کے رکنے کی آواز آئی . . . . سب سے پہلے شہاب سرمئی سوٹ میں ملبوس باوقار سراپا لئے مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا . . . . پیچھے پیچھے عاطفہ اور کامران بھی ہنستے ہوئے آرہے تھے . . . . دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھ کر ایک بار . . . . دونوں نے ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھا . . . . اور دونوں کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی . . . .

"کہاں کی سیر ہی کر کے آرہے ہو بھئی۔" رضوان نے شہاب سے پوچھا۔

"ماموں جان۔ آج خوب گھومے . . . . چاندنگر کا چپہ چپہ دیکھا . . . بہتی گنگناتی ندیاں دیکھیں . . . . آبشاروں کی روانی دیکھی . . . . سر بفلک پہاڑوں کا غرور دیکھا . . . . ٹھنڈا ٹھنڈا اسٹیما پانی پیا۔ لذیذ ترین پھلوں کے باغ دیکھے"

"صرف دیکھے ہی۔" کامران نے دخل در معقولات دیتے ہوئے کہا . .

"نہیں بھئی خوب کھائے بھی تھے . . . ." شہاب نے زندہ دلی سے جواب دیا . . . .

"ماموں جان اتنے لذیذ سیب و انار تھے . . کہ ایک ایک کھا کر ہی دل بھر گیا . . ." عاطفہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا۔ اس معاملے میں ہم لوگ قدرے خوش نصیب ہیں۔"

"قدرے۔" فرحت نے حیرانی سے پوچھا۔

"نہیں بھئی بہت زیادہ۔" رضوان نے ہنستے ہوئے کہا۔

انجم تولیے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی چہرے پر سکون کے ساتھ ساتھ بے پناہ مسکراہٹیں لئے ہوئے آئیں۔۔! اور کہنے لگیں۔

"چلو بھئی سیریں تو خوب کر لی ہیں۔ اب ذرا گرم گرم کھانا بھی کھاؤ۔۔۔"

"کیا کیا پکایا ہے انجم۔؟" رضوان نے محبت سے بھری نظروں سے پوچھا۔

"بریانی۔ نرگسی کوفتے۔۔۔ قیمہ مرچیں۔۔۔ شامی کباب اور شاہی ٹکڑے۔۔۔"

"ممانی جان زندہ باد۔" شہاب کے منہ سے بے ساختہ نکل پڑا۔۔۔۔ انجم ایک دم سرخ ہو گئیں۔۔۔ اور پھر اسی لمحے زرد بھی ہو گئیں۔ ماحول پر ایک دم پر اسرار سی خاموشی چھا گئی۔ فرحت اپنی جگہ شرمندہ۔۔۔۔ شہاب اپنی جگہ شرمسار۔۔۔۔ عاطقہ نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں، اور رضوان تو ایک دم بے تعلق سے ہو کر بیٹھ گئے۔ کامران نے صورت حال کا جائزہ لیا۔ آج کی سیر میں وہ شہاب کی اعلیٰ ظرفی۔ اور خلوص کا دل سے معتقد ہو گیا تھا۔ ایک دم اس نے پیار سے انجم کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔۔۔

"امی بھئی کھانا کھلائیے۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔" کامران کو جب بھی انجم پر زیادہ لاڈ آتا۔ یا کوئی بات منوانا چاہتا۔ تو اسے امی کہہ کر مخاطب کرتا۔ لفظ امی پر انجم اس طرح پگھل جاتی۔۔۔ جس طرح دھوپ میں برف۔!! شاید وہ اس بدنصیب محروم بچے کا دل رکھنا چاہتی۔ یا پھر اس ذہنی رشتے کی لاج رکھتی۔ جو اس کے اور رضوان کے درمیان قائم تھا۔۔۔۔ اس وقت اس بھری محفل میں اچانک لفظ "ممانی" سن کر وہ سن سی ہو گئی دنیا والوں کی باتیں سنتی آئی تھی۔ مگر اپنے کانوں سے سنیں نہیں تھیں۔ آج اچانک۔۔۔۔

اتنی واضح اور صاف سن کر اس کا پریشان ہو جانا حق بجانب تھا..... کامران کو اس نے ماں بن کر ہی پالا تھا... اور وہ دل کی گہرائیوں سے اسے چاہتی تھی..... کامران کو جوان ہو کر اس رشتے کے بارے میں اتنا ہی معلوم تھا کہ یہ اس کی خالہ ہے۔ اور ماں کے مرنے کے بعد اس نے اسے پالا ہے...... اس لئے وہ تو اسے ماں ہی سمجھتا تھا..

"کہہ دیجئے۔ آج کھانا نہیں ملے گا۔؟" کامران نے پھر اپنی بات منواتے ہوئے کہا

انجم ایک دم چونک گئی۔

"نہیں نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ کھانا تو بالکل تیار ہے..." یہ کہہ کر وہ باورچی خانے کی طرف مڑ گئیں۔

"چلو تم ڈرائنگ روم کی طرف ——!" فرحت نے قدرے رعب سے کہا

شہاب نے عاطقہ کی طرف دیکھا۔ کامران بھی دبے دبے قدموں سے باورچی خانے کی طرف جا رہا تھا۔ یہ دونوں خاموشی سے ڈرائنگ روم کی بڑھ گئے۔

رضوان اور فرحت خاموشی سے بیٹھے رہے.... شہاب نے ڈرائنگ روم کا پردہ ہٹاتے ہوئے کہا..

"عطی کیا بات ہوئی، جو ماحول پر اتنی افسردگی پھیل گئی۔!"

"تمہیں انہیں عمانی نہیں کہنا چاہیئے تھا۔"

"کیوں۔؟" شہاب نے بے ساختہ پوچھا....

"شابی ایک انسان ہر غرض، ہر لالچ سے پاک ہو کر کیا کسی کی خدمت نہیں کر سکتا۔؟ مگر یہ دنیا والے اس خدمت کے پیچھے کوئی نہ کوئی غرض ضرور سمجھتے ہیں۔

انجم خالہ جوانی کے عالم میں بیوہ ہوئیں۔ اور سعدیہ ممانی نے کامران کی پرورش کے لئے انہیں اپنے پاس بلالیا۔ ۔ ۔ وہ دن، اور آج کا دن۔ ۔ ۔ ۔ بے لوث خدمت کرتے کرتے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی زندگی کے قیمتی ایام گذار بیٹھیں۔ ۔ ۔ ۔" عاطقہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"انہوں نے شادی کیوں نہیں کی۔ ۔ ۔؟" شہاب نے بھی اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"سعدیہ ممانی کا خلوص۔ کامران کی محبت۔ اور باوقار گھر۔ ۔ ۔ جس نے انہیں ذہنی سکون بخشا۔ اور اپنے گھر کی تمنا بالکل ہی مٹ کر رہ گئی۔!"

"عظیم ہیں وہ لوگ۔ جو دوسروں کو اپنا خون جگر پلا کر زندہ رکھتے ہیں۔" شہاب نے گہری نظروں سے عاطقہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور خود بالکل مٹ جاتے ہیں۔!" عاطقہ نے اس کی گہری نظروں سے بچتے ہوئے ہنس کر کہا۔ ۔ ۔

"عاطقہ خود کو مٹانا۔ یا آسان الفاظ میں اپنی تمناؤں کا گلا اپنے ہاتھوں سے دبانا بہت مشکل کام ہے۔ ۔ ۔ ۔ بہت مشکل کام ہے۔ ۔ ۔ ۔!" کہتے کہتے شہاب کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔ سوچ کی گہری لکیریں اس کے چہرے پر واضح ہو گئیں عاطقہ دلچسپی سے اس کی طرف دیکھے جارہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ اس نے پلیٹ میں چمچ بجاتے ہوئے کہا۔ ۔ ۔ ۔

"مسٹر واپس لوٹ آیئے۔ ۔ ۔ یہ کھانے کا وقت ہے۔ ۔ ۔ ۔!"

شہاب نے سوچ سے بھرا ہوا سر قدرے اٹھایا۔ عاطقہ کی شوخ نگاہوں کی چمک دیکھ کر وہ قدرے مسکرایا۔۔۔۔

"لیجئے جناب واپس آ گئے۔ اب کھانا کھلاؤ۔"

"تناول فرمایئے۔" عاطقہ نے خالی ڈش بڑھاتے ہوئے کہا۔۔۔ دونوں کھلکھلا کر ہنس دیئے۔۔۔ کہ ایک دم پردہ ہلا۔ کامران اور انجم دونوں کھانا ٹرے میں لگائے لا رہے تھے۔۔۔۔ عاطقہ تیزی سے اٹھی۔ اور انجم کے ہاتھ سے ٹرے تھامتے ہوئے بولی۔۔

"لایئے مجھے دیجئے۔"

"نہیں نہیں تم بیٹھی رہو۔ ماں کھانا پکائے۔ اور بیٹی تناول فرمائے۔" شہاب نے شوخی سے کہا۔۔۔

"بیٹی تو مہمان ہے۔۔۔۔" کامران نے عاطقہ کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔

"نا بھئی ہم تو مہمان نہیں۔۔۔۔ ہمارا اپنا ہی گھر ہے۔" عاطقہ نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔۔۔

"بالکل یہ عاطقہ کا گھر ہے۔۔۔" انجم نے پیار سے اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے کہا

"ہمیں کب انکار ہے۔" کامران نے گمبھیر آواز میں کہا۔۔۔

اور شہاب بھی اس کی جذبات میں بھیگی ہوئی کانپتی آواز کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔۔۔۔ اس نے وزدیدہ نگاہوں سے عاطقہ کی طرف دیکھا۔۔۔ جو چہرے پر سرخی لئے۔۔۔ لمبی لمبی پلکوں کا سایہ کئے میز پر کھانا چن رہی تھی۔۔۔۔ اس کے سفید سفید

نازک سے بلوریں ہاتھ بڑی ترتیب سے اٹھ رہے تھے۔

"اب یہ ٹرے کب تھامیئے گا۔ بڑی دیر سے حضور کھڑا ہوں۔۔۔" کامران نے اپنی ٹرے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بڑی شوخی سے کہا۔۔۔

"اوہ ایکسکیوزمی۔۔۔۔۔" کہہ کر عاطقہ نے پل بھر کے لئے اپنی نظریں اٹھائیں۔ کامران کی آنکھوں میں بے پناہ بجلیاں دیکھ کر ایک دم اس نے اپنی کانپتی پلکوں کی جھالر بڑی خوبصورتی سے گرادی۔۔۔۔۔ کامران کے چہرے پر خوشی کی لہریں رقصاں ہونے لگیں۔۔۔۔۔۔ شہاب کے دل میں درد کی لہریں اٹھنے لگیں۔۔۔۔ اور اس نے تڑپ کر اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹکا دیا۔ آنکھیں بند کئے۔۔۔۔ وہ لیٹا۔۔۔۔۔۔ عاطقہ کو بڑا ہا یا۔۔۔۔ انجم خالہ دوسرا چھیرا کر کے پھر جا چکی تھیں۔۔۔۔۔۔ عاطقہ نے شہاب کی کمزوری شامی کباب اس کے منہ کے بالکل قریب کرتے ہوئے دھیرے سے کہا۔۔۔۔

"جناب لوٹ آیئے۔ آپ کو آپ کے شامی کباب بلاتے ہیں۔۔۔۔"

شہاب نے نیم وا نظروں سے دیکھا۔ کہ کمرے میں وہ دونوں ہیں دھیرے سے کہا۔۔۔۔

"ہمارا پیار تو ہمیں نہیں بلاتا۔ شامی کباب ہی اچھے ہیں۔ جو بلا تو لیتے ہیں۔"

"پیار دور ہو تو بلائے"! ہم تو رگ جاں سے زیادہ قریب ہیں۔۔۔ کہہ کر عاطقہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ اور شہاب مخمور نگاہوں سے جو چند منٹ پہلے دھندلاسی گئی تھیں۔ ایک دم شفاف صاف ستھری ہو گئیں۔ انسان بھی کتنا بھولا ہے۔۔۔۔۔ ذرا سی خوشی پاکر اپنے سارے دکھ بھلا دیتا ہے۔۔۔۔ حالانکہ جو دکھ اس کا مقدر بن چکے

ہوں۔ وہ ذراسی خوشی سے کیا بہلیں۔"!

کھانا بڑے خوشگوار موڈ میں کھایا گیا۔ کامران کو صرف اس میز پر عاطقہ نظر آرہی تھی۔ وہ جو بھی ڈش بڑھاتا۔ عاطقہ وہی ڈش خاموشی سے شہاب کی طرف بڑھا دیتی۔۔۔

"تم تو کچھ لو عاطقہ۔۔۔" کامران دھیرے سے کہتا۔۔۔

"شہاب کچھ نہیں کھا رہے"!

"تم اپنی فکر کرو۔۔۔"!

"نہیں کی جاتی۔۔۔"!

شہاب خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ بظاہر تو سر جھکائے کھانا کھا رہا ہے۔۔۔۔ فرحت بڑے مزے سے کھانا کھا رہی تھیں۔ اور ساتھ ساتھ تعریفیں کرتی جا رہی تھیں۔۔۔۔ "بھئی انجم تمہارے ہاتھوں میں واقعی بہت لذت ہے۔۔۔" شہاب نے نیم وا آنکھوں سے بڑوں کی طرف دیکھا۔۔۔ اس فقرے پر ایک دم ماموں نے ان کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے وہ بھی ان ہی کی طرف دیکھ رہی تھیں نظروں کا تصادم کتنا حسین حادثہ ہوتا ہے۔۔۔ انجم کے ہاتھ میں نرگسی کوفتوں کا ڈونگا کانپ کر رہ گیا۔ جو وہ شاید رضوان کی طرف بڑھا رہی تھیں۔ پل بھر کے لئے دونوں کی آنکھوں میں محبت کے دیپ جل اٹھے۔ مگر بچوں کی موجودگی کا احساس کر کے دونوں نے اپنی جلتی نظروں کو جھکا لیا۔ کہ کہیں ان کی محبت کی شمع کی روشنی کوئی نہ دیکھ لے۔۔۔۔ یہ نہیں معلوم۔ کہ ایک دل پر چوٹ کھایا ہوا انسان بڑی گہری نظروں سے ان کا مطالعہ کر رہا ہے۔۔۔۔ اسی لمحے شہاب کے دل میں ڈھیر سارے تقدس کے پھول انجم خالہ کے لئے کھل اٹھے۔

جو اپنی محبت کو امر بنائے ...... ہر غرض ۔ ہر لالچ سے پاک ہو کر اس شخص کو سنبھالے ہوئے اس کے بچے کو پال کر جوان کئے ہوئے ... اس کے گھر کو روشنی بخشے ہوئے اپنی محبت کے دیپ سے جگمگائے ہوئے کس خوشی سے جی رہی ہیں .... انہیں اپنے مقدر سے کوئی شکوہ نہیں کوئی شکایت نہیں .... محبت کا بے پناہ بپھرا ہوا طوفان تھم چکا تھا ... اب تو میٹھی میٹھی پر سکون لہریں کبھی کبھی اس دریا میں ہلچل مچا دیا کرتی تھیں ۔ اور بس ..... رضوان کی خدمت کر کے ۔ وہ دونوں جہاں کا سکون پائے ..... بڑے اطمینان سے اپنی زندگی کے دن گزار رہی تھیں ..... شہاب نے پر تقدس نگاہوں سے انجم کی طرف دیکھا ۔ جن کے مقدس چہرے پر کوثر و تسنیم کی لہریں رقصاں تھیں ۔ کتنا دلی سکون ان کے چہرے پر نظر آتا ہے .... کتنی مقدس محبت ان کے دل کے نہاں خانے میں چھپی ہوئی ہے ... جس میں کوئی جذبات کا اضطراب .... محبت کی گہرائی جڑیں پکڑ چکی ہیں ۔ انہیں اپنی حیثیت ۔ اور طہیتے کا احساس ہی ایک سکون ایک طمانیت بخشے ہوئے ہے ۔

"کہاں دیکھ رہے ہو ۔ کھانا کھاؤ نا ......" عاطفہ نے ٹوکتے ہوئے کہا .....

"بس عطی کھا چکا ہوں ۔ !"

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ۔ ؟" عاطفہ نے پلیٹ میں ویسے ہی کھانا دیکھ کر پوچھا ...

"کھانا کھانے سے پہلے تو ٹھیک نہیں تھی ۔ مگر اب بالکل ٹھیک ہے ۔"

ایک ایسا نکتہ۔ ایک ایسی مثال ...... سامنے آئی ہے۔ جسے سوچ کر۔ جسے دیکھ کر۔ خود کو بہلا لیا کروں گا۔ یا کم سے کم ان کے پاس بیٹھ کر۔ خلوص و تقدّس کا درس ضرور سنا کروں گا۔!"

عاطفہ کے پلے ابھی کی ایک بات بھی نہ پڑی.... وہ سوچنے لگی کہ آج کل شہاب کیسی باتیں کرنے لگے ہیں....

سیٹھ آصف اپنے بال بچوں کو لینے کے لئے آچکے تھے.... انجم سے جتنی خدمت ہوتی رہی ——— خلوص دل سے کرتی رہی... سیٹھ آصف اور فرحت تو ان کے خلوص سے بے حد متاثر نظر آرہے تھے.... اور شہاب تو دل ہی دل میں اس عظیم ہستی کی پرستش کر رہا تھا... جس نے محبت کو ایک نیا موڑ بخشا ——— سیٹھ آصف، فرحت، رضوان، کامران اور عاطقہ سیر و تفریح کے لئے باہر گئے ہوئے تھے.... شہاب کے سر میں درد تھا... اس لئے وہ نہ جا سکا... انجم اس کے لئے چائے اور اسپرو کی گولیاں لائیں ——— اور اپنے سامنے کھلا کر کچھ دیر اس کا سر دباتی رہیں... پھر اس پر کمبل اوڑھا کر باہر کام کاج کے لئے نکل آئیں. شہاب آنکھیں بند کئے اس عظیم سراپے کے بارے میں سوچ رہا تھا... کھڑکی کے راستے سورج کی بنفشی شعاعیں کمرے کو منور کئے ہوئے تھیں۔ دھوپ خاصی گرم تھی۔ شہاب نے کمبل سرکایا... ایک انگڑائی لی....

عاطقہ

پاؤں میں چپل پہنے۔۔۔۔ اور باہر نکل آیا۔۔۔۔ انجم باورچی خانے میں بھی نہیں تھی۔۔۔ کچھ دیر دھوپ میں کھڑا رہا۔۔۔ انجم کے کمرے سے گڑبڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ قدموں سے ان کے کمرے کی طرف بڑھا۔ ۔۔۔۔ پردہ کھسکایا تو وہ کپڑے ٹھیک کر رہی تھیں۔۔۔۔

"آ سکتا ہوں خالہ ——— !"

"آ جاؤ۔۔۔۔ ابھی اسپرو کھائی ہے اور ابھی ہوا میں نکل آئے ہو !"

انجم کے لہجے میں پیار کی ڈانٹ نمایاں تھی۔۔۔۔

"سر کا درد تو بالکل غائب ہے۔۔۔" شہاب مسہری پر بیٹھتے ہوئے بولے۔"

"کام ختم کر چکی تھی۔۔۔۔ تم سو رہے تھے۔ میں نے سوچا وارڈ روب کا کامران نے ستیاناس کر رکھا ہے۔ ایک کپڑا نکالنا ہو ——— تو سارے کپڑوں کی تہوں کو برباد کر دیتا ہے۔ لگے ہاتھوں اسے ٹھیک کر لوں۔۔۔" انجم نے ایک قمیض کو تہ کرتے ہوئے کہا۔

"لائیے میں بھی آپ کا ہاتھ بٹاؤں۔۔۔۔ !"

"جیتے رہو ——— خدا تمہیں نیک نصیب بخشے۔۔۔ تمہاری خوشیاں ہم بھی دیکھیں !"

"آمین !"

نچلی تہہ میں کچھ کپڑوں کے نیچے ایک چھوٹا سا اٹیچی رکھا ہوا تھا۔۔۔۔ میلے کپڑے سے اس جگہ کو انجم صاف کرنے لگی۔۔۔ تو اٹیچی باہر نکال دیا۔۔۔

"خالہ اس میں کیا ہے ———؟"

"کچھ نشانیاں ——— کچھ یادیں ———!"

"مطلب ———؟" شہاب نے حیرانی سے پوچھا۔ . . .

"بیٹے کامران کے ایک بڑے بھائی عمران بچپن میں کھو گئے تھے . . . کوئی ظالم انہیں اٹھا کر لے گیا . . . ماں کی ممتا مرتے دم تک تڑپتی رہی . . . مگر بچے کا کوئی نشان نہ مل سکا . . . میں نے اکثر سعدیہ کو ان کپڑوں کو چومتے دیکھا . . . سینے سے لگا لگا کر بے تحاشا روتی . . . اور ان کے مرنے کے بعد رضوان نے انہیں اٹیچی میں بند کر کے میرے حوالے کر دیا . . . کہ یہ مرحومہ کی سب سے پہلی ——— اور آخری یادگار تھی۔ جو انہیں بہت عزیز تھی اسے سنبھال کر رکھنا ہوگا . . . اور اس روز سے یہ میری حفاظت میں ہے . . ."

"کیا میں اسے کھول کر دیکھ سکتا ہوں ———؟" شہاب نے پُرنم آنکھوں سے کہا۔

"کیوں نہیں ——— ضرور ——— دیکھو . . . بھلا اس میں کیا چھپانے کی بات . . . !"

کہہ کر انجم نے ایک چھوٹی سی چابی سے اٹیچی کھول دی . . . کپڑوں کے اوپر کی تہہ پر ایک خوبصورت ملائم ننھا سا تولیہ بچھا ہوا تھا . . . شہاب نے اسے بے صبری سے کھینچا . . . مخمل و کمخواب کے ٹوپے . . . گلابی نیلے سُرخ رنگ کے فراک نیپکین دودھ کی بوتل . . . دودھ کا ڈبہ . . . نپل، چھوٹی چھوٹی جرابیں، سوئٹر، بنیانیں،

شہاب نے اسے کھولا تو ایک گلابی سویٹر ——— گلابی سویٹر سے ملتی جلتی اُن کی صرف ایک جراب . . . گلابی رنگ کا جانگیہ . . . اور بالکل اسی رنگ کا موم جامہ لپٹا ہوا تھا"

"خالہ یہ کیا ———" شہاب نے حیرت سے پوچھا . . .

"بیٹے یہ اس بدنصیب بچے کا سامان ہے ۔ جس روز وہ کھویا تھا انہی کپڑوں میں کہتے ہیں کہ ملبوس تھا ———"

"کپڑے تو یہ سب موجود ہیں ———" شہاب نے بے ساختہ کہا ۔

"او ——— میرا مطلب . . . کہ گلابی جانگیہ موجود ہے . . . یہ گیلا تھا ۔ اس لئے ظالم نے اسے اُتارا . . . اور اسی رنگ کی فراک منّے نے اس وقت پہنی ہوئی تھی . . . وہ پہنے رہنے دی ۔ اس اون کے سیٹ کی ٹوپی ——— ایک جراب جلدی میں اُتر گئی ہو گی جو اس کے جھولے سے بعد میں ملی ——— اور ایک منّے کے پاؤں میں رہ گئی ۔ موم جامہ بھی گیلا ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ جانے سے رہ گیا . . . تو وہ اس کے سرخ شنیل کے کمبل میں لپیٹ کر چلتا بنا . . . !" انجم نے بھرپور وضاحت کی . . .

"کیا آپ کے سامنے عمران کھویا تھا ———" شہاب نے پوچھا . . .

"نہیں نہیں . . . جب میں اس گھر میں آئی ۔ تو کامران پیدا ہو چکا تھا . . . سعدیہ باجی ہر وقت عمران کو یاد کر کے روتی رہتیں . . . ان کپڑوں کو چومتیں . . . اور مجھے کئی بار دیوانگی کے عالم میں ایک ایک کپڑا دکھا کر اس حسرت ناک داستان کو

دوہراتی رہتیں۔۔۔۔"

"عمران کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔۔۔۔؟"

"کوئی نہیں ——— !"

"انہوں نے کوششیں تو بہت کی ہوں گی۔۔۔۔!"

"بہت ——— کہتے ہیں چپہ چپہ چھان مارا۔۔۔ قریہ قریہ تلاش کیا۔۔ مگر منے کو تو جیسے آسمان کھا گیا ——— یا زمین نگل گئی۔۔۔۔!" انجم نے ایک ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے کہا۔۔۔

"بیچاری ——— ماں ——— !" شہاب نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔۔۔۔

ماں ——— ظالم ماں۔۔۔۔ کو یہی دکھ تو کھا گیا۔۔۔۔ ورنہ رضوان انہیں کتنا چاہتے تھے۔۔۔ یہ مجھے معلوم ہے۔۔۔۔!" کہتے کہتے انجم یکبارگی رک سے گئیں ———

"مجھے بھی کچھ کچھ سعدیہ پھوپھو یاد ہیں۔۔۔ ہلکا دھندلا سا نقشہ میرے ذہن میں ان کا اب تک موجود ہے۔ خدا انہیں جنت نصیب کرے۔۔۔۔ مجھ سے بے ساختہ محبت کرتی تھیں۔۔۔ مجھے اب تک بھی ان کی پیار بھری نظریں یاد ہیں۔"

"ہاں! یہاں آ کر بھی تمہیں اکثر یاد کرتی تھیں۔۔۔ مجھے کہا کرتی تھیں۔۔۔۔ کہ مجھے شہاب جانے کیوں عزیز ہے۔۔۔۔ اگر بھائی جان مجھے یہ بچہ بخوشی دے دیں تو میں سمجھوں گی کہ مجھے میرے دل کا سکون مل گیا۔۔۔!"

"کاش میں ان کی کوئی خدمت کر سکتا...!" شہاب نے دکھ سے کہا۔

"اپنی خدمت کا موقع تو انہوں نے کسی کو بھی نہ دیا!"

اتنا کہہ کر وہ جلدی جلدی اٹیچی کا سامان رکھنے لگیں.... ایک جراب ابھی تک شہاب کے ہاتھ میں تھی.... وہ سامان رکھ چکیں تو اٹیچی کو دوبارہ تالا لگا کر ——— اس کی جگہ پہ رکھ دیا... شہاب نے جانے کس جذبے کے تحت اس جراب کو مٹھی میں بند کر لیا... ادھر اُدھر کی باتیں کر کے وہ دوبارہ اپنے کمرے میں آیا... جراب کو کھول کر دیکھا... بے ساختہ اسے سونگھا... کچھ سوچ میں ڈوبا... انجانی سوچوں کے درمیان کوئی سرا نہ ملا... تو اپنا اٹیچی کھولا... اور ایک دُکھ بھری یاد سمجھ کر اس جراب کو سب سے نیچے کپڑوں میں چھپا دیا... دل پر ایک انجانا سا بوجھ چھایا رہا... خود کو اُداسیوں کے گہرے سمندر میں ڈوبا پایا... روح میں عجب طرح کی بیقراری محسوس ہونے لگی.... کبھی لیٹتا... کبھی سگریٹ سلگاتا... کبھی بن پیئے بجھا دیتا.... اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا... کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے... دل چاہتا تھا کہ طائر خیال اپنی اُونچی اڑان سے اُڑتا اُڑتا... اسے ان یادوں سے ہمکنار کر دے... جن کے لئے اس کی رُوح سلگتی رہی... اس کا وجود جلتا رہا... سب کچھ پا جانے کے باوجود بھی... وہ اپنے ماضی کو فراموش نہ کر سکا... اچھی خاصی عمر کا تھا ——— جب آصف نے اسے گود لیا۔ وہ اپنی ماں ہمدرد ماں کو یاد کر کے راتوں کو اکثر روتا رہا... لیکن صبح اُٹھ کر

اس طرح بے جان ہو جاتا ——— جیسے اسے کوئی دکھ ہے ہی نہیں۔ ۔ ۔
اسے اپنا ظالم بابا بھی خوب یاد تھا۔ ۔ ۔ جو ذرا ذرا سی بات پر جسم پر نیل ڈال دیا کرتا۔ ۔ ۔ اسے وہ منّی سی لڑکی خوبصورت گوری چٹی۔ ۔ ۔ سنہری بالوں والی سرخ ہونٹوں والی۔ ۔ ۔ لڑکی بھی خوب یاد تھی۔ ۔ ۔ جو اس کے بچپن کی ساتھی تھی بابا اکثر کہا کرتے تھے۔ ۔ ۔ کہ گل خان یہ تمہاری بچپن کی منگیتر ہے۔ ۔ ۔ اس کا باپ بھی بچپن میں مر گیا تھا۔ اس کو بھی انہوں نے پالا تھا۔ ۔ ۔ اور کچھ سوچ کر اس کی منگنی اس لڑکی سے کر دی تھی۔ ۔ ۔ بچپن کی یادوں نے سر اٹھانا چاہا۔ ۔ ۔ پردہ سکرین کی طرح ایک ایک سین نگاہوں کے سامنے آنے لگا۔ ۔ ۔ سارے قبیلے کو دعوت دی گئی۔ ۔ ۔ شیریں۔ ۔ ۔ ہاں شیریں نام ہی تھا۔ ۔ اسے نہلا دھلا کر ایک لمبا فراک جس پر خوب کشیدہ کاری اور شیشوں کا کام بنا ہوا تھا پہنایا گیا۔ ۔ ۔ سر پر ایک خوبصورت بڑی سی ریشمی سبز رنگ کی چنری بھی پہنائی گئی تھی۔ ۔ ۔ سارے شہر کو چھوٹی چھوٹی جھنڈیوں سے گوندھا گیا۔ ۔ رات کو پورے پورے ہاتھوں اور پاؤں پر مہندی لگائی گئی۔ ۔ ۔ صبح اس کے ننھے ننھے ہاتھ بالکل سرخ ہو رہے تھے۔ ۔ ۔ ایک عجب سی پُر اسرار سی خوشبو اس میں سے آ رہی تھی۔ وہ بار بار اسے ہاتھ دکھاتی۔ ۔ ۔

دیکھو گل ——— میرے ہاتھ کتنے سرخ ہو گئے ہیں۔ ۔ ۔"

اور اسے ایک دم یاد آیا کہ اسے بھی ہاتھ بھر بھر کے مہندی لگائی گئی تھی۔ ایک دم اس نے بھی اپنے ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیئے۔ ۔ ۔

"دیکھو شبیری...... میرے ہاتھ تم سے زیادہ سرخ ہیں۔"

"ارے"! تم نے بھی مہندی لگائی ہے؟" اس نے معصومیت سے پوچھا

"اور کیا تم نے لگائی ہے۔ تو میں کیوں پیچھے رہوں..."

"شیریں تمہارا اس کے ساتھ شادی ہوتا ہے.... اس لئے دونوں کو مہندی لگایا ہے...." اس کے چچا کے بیٹے مراد نے ہنستے ہوئے کہا...

"جاؤ جاؤ بکواس مت کرو.... شیریں ایک دم پھٹ پڑی....

"سچ آج تمہارا شادی ہے....!" مراد نے آنکھیں گھما کر کہا....

شیریں اسے مارنے کو دوڑی.... اور ایک پتھر کی ٹھوکر سے گر گئی۔ سارے ریشمی کپڑے گرد سے برباد ہو گئے۔ اور ننھی ننھی ہتھیلیوں سے خون بھی نکلنے لگا۔ وہ بھی اس روز نئے کپڑوں میں ملبوس تھا.... اپنی سبز رنگ کی نئی نائلن کی قمیض کے دامن سے اس نے اس کی ہتھیلیاں پونچھیں۔ اس کے کپڑے جھاڑے اپنی چھوٹی سی پگڑی کے دامن سے اس کے آنسو پونچھے.... اور اسے پیار سے کہا کہ وہ گھر چلی جائے۔ یہ مراد تو یونہی تنگ کرے گا۔"

وہ ایک ننھی بچی کی طرح اس سے چمٹ گئی....

گل تم بھی میرے ساتھ گھر چلو.... یہ مجھے پھر گرائے گا...،،

اور جب وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دیئے جھونپڑی میں آئے.... تو ماں دیکھ کر تڑپ اٹھی۔ اور دونوں کی بلائیں لیں.... شام کو خوب ڈھول بجتا رہا.... ڈھول کے گرد گھر کی عورتیں دائرے میں ناچتی رہیں... خوب رونق رہی

اور اس کے بعد اکثر اُسے شیریں کے نام سے چھیڑا جاتا رہا۔۔۔ پھر وہ اپنے گھر سے بچھڑ گیا۔ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا، اپنی مشفق ماں سے بچھڑ گیا۔ اور یہ ہستیاں اسے کبھی نظر نہ آنے کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی نظروں سے دور دور ہوگئیں۔۔۔ یہاں آ کر عاطقہ کی ذات نے اسے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ اسی کے خلوص پر اس نے اپنی جون بدلی۔۔۔ اور نئے سرے سے اپنی زندگی کے ورقوں کو مرتب کیا۔۔۔ اور ایک نئی زندگی کا آغاز کیا۔۔۔ جن لوگوں کو بھولنے کی اس نے اکثر کوشش کی۔۔۔ وہ فرحت امی کی تلخ باتوں سے اکثر یاد آتے رہتے۔ جتنا ابو پیار دیتے رہے۔۔۔ اتنی ہی امی کی نفرت بڑھتی رہی۔۔۔ جتنا وہ عاطقہ کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کرتی رہیں۔۔۔ اتنی ہی محبت بڑھتی رہی۔۔۔

اور اس طرح بچپن کی تلخ و شیریں یادوں کو دوہراتے دوہراتے وہ جوانی کی حدود میں داخل ہوئے۔۔۔ اب بھی جب کبھی امی کا مزاج بگڑتا وہ ماضی کا طعنہ دینے سے نہ چوکتیں۔۔۔ اور یہ زخم اس کے دل پر کئی کئی دن رہتا۔ مگر عاطقہ کے بے پایاں خلوص ——— اور ابو کی بے پناہ شفقت میں اپنے آپ مندمل ہونے لگتا۔ وہ پھر گھل مل جاتا ——— اور ایسا ہو جاتا، جیسے اس نے کبھی کوئی بات سُنی نہ ہو۔۔۔ وہ ابو کا دستِ راست بن چکا تھا۔۔۔ وہ ان کا بیٹا۔۔۔ ان کا دوست۔۔۔ اور ان کا رفیق خاص بھی تھا۔۔۔ اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے سیٹھ آصف نے اپنے تمام کاروبار سے اُسے روشناس کروا دیا تھا۔۔۔ اور اس طرح اس نے کاروبار کو بی۔ اے کرنے کے بعد سنبھالا۔۔۔ کہ سیٹھ آصف کو محسوس

بھی نہ ہونے دیا ——— کہ ان کی بیماری یا بڑھاپے نے کوئی کمی کر دی ہے
بنک میں بھی دونوں کا حساب مشترکہ تھا۔۔۔ ایک لحاظ سے شہاب ہی ہر سیاہ و سفید
کا مالک بن چکا تھا۔۔۔ فرحت نے کئی بار اس خطرے سے آصف کو آگاہ کیا۔۔
جو ان کا دل پیشین گوئی دیتا تھا یا ان کے عزیز انہیں بھڑکاتے تھے۔۔۔ مگر آصف
کئی بار اپنی آنکھوں سے شہاب کی بے پناہ مصروفیتوں کو دیکھ آئے تھے۔ جو کام
کلرکوں۔۔۔ مزدوروں کے کرنے کا تھا، وہ کام یہ خود کرتا۔۔۔ اور اس کے پیچھے
ایک ٹیم سی بھاگ پڑتی۔۔۔ اور وہ کام منٹوں میں ہو جاتا۔۔۔ ابھی۔۔۔ انہوں نے
ایک خاصی دور دراز جگہ پر ایک ڈاک بنگلہ بنانے کا ٹھیکہ لیا۔۔۔ آدھے سے زیادہ
منافع کا امکان تھا۔۔۔ بشرطیکہ اس کی سرپرستی آصف یا شہاب خود کرتے۔۔۔
کیونکہ دوسروں پر بھروسہ کرنا تجارت کے گُر کے منافی ہے۔۔۔ آصف نے ہلکے سے
شہاب کو یہ بات سمجھائی۔۔۔ تو وہ بہ نفسِ نفیس خود اس جگہ کو دیکھنے گیا۔۔۔ اور اپنی
نگرانی میں ڈاک بنگلے کا کام شروع کروا دیا۔۔۔ نوکروں، مزدوروں کے آرام کا ہر
ممکن خیال رکھنے لگا۔۔۔ جس جگہ پر جانے کے لئے کوئی تیار نہ ہوتا تھا۔۔۔ اس جگہ
پر دو سو مزدور بیک وقت کام کر رہے تھے۔۔۔ عام خیموں کی طرح شہاب نے بھی ایک خیمہ لگایا۔
دوسرے کام کرنے والوں کی طرح خود بھی اس وقت آرام کرتا جب وہ کرتے۔ اور اس
طرح اس کی عزت و محبت سبھوں کے دلوں میں گھر کر گئی۔ آصف ایک مرتبہ اچانک
راؤنڈ پر آگئے۔۔۔ شہاب کو عام کپڑوں میں ادھر سے اُدھر کام کرتے دیکھا تو
خوشی سے آنکھوں میں آنسو آگئے اور سینے سے بے ساختہ لگا لیا۔۔۔ اور کہا!

" میرے لال ! اپنی صحت کا خیال رکھو ——— انہیں ہدایات دے کر گھر آجایا کرو ۔ ۔ ۔ ۔ تمہاری بہن تمہیں بہت یاد کرتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

" ابّو جانی جب تک کام شروع نہ ہو جائے اچھے طریقے سے ان کی سرپرستی نہیں چھوڑنی چاہیئے ۔ ورنہ یہ دل برداشتہ ہو جائیں گے ۔ ۔ ۔ "

" اب تو بنیادیں پڑ چکی ہیں ۔ تم گھر چلو ۔ ۔ ۔ ۔ !"

" ابّو جانی آج تو نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ آج بنیاد ڈلنے کی خوشی میں میں نے پانچ دُنبوں کا بندوبست کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ انہیں کھانا دے رہا ہوں ۔ ۔ ۔ پہلے غریب کا حق ۔ ۔ ۔ پھر کسی اور کا ——— !"

" او ——— میرے جان جگر ——— باپ کو تو اس بات کا خیال ہی نہ رہا کہ اتنا بڑا ٹھیکہ ملنے کی خوشی میں کچھ خدا کے نام کی نذر و نیاز کرنی چاہیئے ۔ وہ فرض بھی آج تم نے اپنے سر لے کر میرا بوجھ ہلکا کر دیا ۔ ۔ ۔ یہ میری طرف سے پانچسو روپے ان مزدوروں میں بانٹ دو ۔ ۔ ۔ ۔"

سیٹھ آصف نے اپنی جیب سے ایک موٹی نوٹوں کی نئی گڈی نکال کر دیتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔

" میرے ابّو جانی زندہ باد ——— کہہ کر شہاب خوشی خوشی مزدوروں کے پاس گیا ——— اور انہیں یہ مژدہ جانفزا سنایا ۔ ۔ ۔ مزدوروں کے چہروں پر حقیقی خوشی کے تاثرات جھلک پڑے ۔ ۔ ۔ اور ایکبار فضا ۔ ۔ ۔ ۔"

" سیٹھ آصف زندہ باد ——— ہمارا شہاب زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی ۔

عاطقہ

سیٹھ آصف بھرپور تسلی کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ . . . شہاب نے رات کو انہیں خوب شاندار کھانا کھلایا ——— اور نقد پیسے بھی بطور انعام میں دیئے۔ جو سیٹھ آصف دے گئے تھے۔ . . . اس خوشی کے موقع پر ایک بار پھر انہوں نے نعرے لگائے اور اپنا مخصوص "خٹک ناچ" دکھایا . . . شہاب کو اینٹوں کی اونچی سی مسند پہ بٹھایا گیا یہ بڑے اہتمام سے شاندار قالین پہ گاؤ تکیہ لگائے بیٹھا تھا۔ . . کہ دور مدہم مدہم سی روشنیوں میں اسے کچھ نسوانی چہرے دکھائی دیئے ——— جو بڑے انہماک سے اس خٹک ناچ کو دیکھ رہے تھے . . . کہ اتنے میں شہاب کا ایک معتمد خاص اکبر آیا۔ اور شہاب کے کان میں کچھ کہا . . . .

"کھانا بچا ہے ؟"

"ہاں مالک . . . !"

"تو پھر دے دو !"

"بہتر . . . کہہ کر اکبر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا . . . . کہ تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر مسکراتا ہوا آیا۔ اور اس کے کان میں کچھ کہا . . . . شہاب آہستہ سے اُترا اور باوقار قدموں سے اکبر خان کے ساتھ چلتا چلتا اس درخت کی آڑ تک پہنچ گیا . . . جہاں تین جوان لڑکیاں دوپٹوں میں منہ چھپائے ہنس رہی تھیں . . . .

"کیا بات ہے ؟" شہاب نے مصنوعی رعب سے پوچھا . . .

"تم بولو ——— !" پہلی دوسری کو کہتی . . . .

"تم بولو ——— دوسری تیسری کو کہتی . . . .

"کیا بات ہے کہہ دو.....!"

"خان یہ مکان بنتا ہے.... کچھ کام ہو تو ہم لوگ آجایا کریں...."

ایک سنہری رنگت والی شوخ سی لڑکی نے ذرا دل کڑا کے کہا....

"تم کام کر لوگی ——— !"

"بالکل ———" اس لڑکی نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا....

"تم یہ اینٹیں سارا دن اُٹھاتی رہوگی....؟ شہاب نے غیر یقینی انداز میں پوچھا

"ہم یہ مکان اُٹھا لیں گے ——— یہ تو اینٹیں ہیں....!" اسی لڑکی نے نہایت زندہ دلی اور شوخی سے کہا....

شہاب اس کی زندہ دلی سے بہت محظوظ ہوا.... اور قدرے ہنسی دباتے ہوئے بولا....

"اچھا صبح آجانا.... ہم تمہاری پہلوانی دیکھ لیں گے....!"

فضا میں کھنکتے ہوئے قہقہے گونجے.... اور ایسا محسوس ہوا جیسے جنگل میں پُر اسرار سی گھنٹیوں کی آواز آنے لگی....

رات گئے تک ناچ و رنگ کی محفل جمی رہی.... صبح شہاب دیر تک سویا رہا.... اکبر کئی بار آکر اس کے خیمے کا پردہ اُٹھا کر جھانک کر جاتا رہا.... مالک کو سویا دیکھ کر وہ اُلٹے قدموں لوٹ جاتا رہا.... اسی طرح وہ پھر جھانکنے آیا، دیکھا کہ شہاب جاگ رہا ہے....

"کیا بات ہے اکبر خان ——— !"

"مالک ——— وہ تینوں لڑکیاں صبح سے آئی ہوئی ہیں . . . . اور بڑا تنگ کر رہی ہیں کہ انہیں کوئی کام دیا جائے . . . .!"

"وہ کہہ کر شہاب کے لبوں سے ایک مسحور سی مسکراہٹ پھسل پڑی . . . .

"اکبر خان انہیں کچھ ایسا مشکل کام دو کہ دوسرے دن نظر نہ آئیں!"

"مالک . . . . یہ بھاگنے والی بلائیں نظر نہیں آتیں . . . .!"

"اچھا . . . . تم نے ان کا مطالعہ کر لیا . . . . اتنی جلدی . . . .!" شہاب نے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا . . . .

"صبح سے ان کے عزوم سے ظاہر ہو رہا ہے . . . .!" اکبر نے جھینپتے ہوئے کہا . .

"تم ہی کوئی کام دے دو . . . . میں ذرا ٹھہر کر باہر آؤں گا . . . .!"

"بہتر ———!"

کہہ کر اکبر باہر نکل گیا . . . .

رات زیادہ دیر تک جاگنے کی وجہ سے شہاب کا جسم ٹوٹتا رہا . . . . اور کام کاج پر جانے کو دل نہ چاہا . . . . کروٹیں لے لے کر آخر وہ اٹھا . . . . سستی دور کرنے کے لئے غسل کیا . . . . شلوار قمیض . . . . اور مشہدی لنگی باندھ کر جب اس نے اپنی شکل چھوٹے سے آئینے میں دیکھی تو بے ساختہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر مچل گئی ——— "خان . . . . دل نے سرگوشی کی . . . . وہ لنگی کے شملے کو ٹھیک کرتا ہوا . . . . باہر نکلا . . . . دوپہر ہو چکی تھی . . . . دھوپ خاصی گرم تھی . . . . سورج نصف آسمان پر چمک رہا تھا . . . . مزدوروں کے چہرے تمتمائے ہوئے تھے .

ان کے قدموں میں وہ جوش بھی نہ رہا۔ ۔ ۔ ۔ مگر مالک کو سامنے دیکھتے ہی۔ ۔ ۔ ۔ ان کے قدموں میں تیزی پیدا ہو گئی۔ ۔ ۔ ۔ شہاب نے دیکھا۔ ۔ ۔ ۔ کہ یہ تینوں بڑے جوش و خروش سے ریت چھان رہی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ایک بجری میں ریت ملا رہی ہے۔ کام کی وجہ سے ان کے سنہری رنگ سرخ ہو چکے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ چھوٹی چھوٹی مینڈھیاں چوٹیوں کی شکل میں سامنے آ چکی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ دوپٹے سروں سے کھسکے ہوئے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ اور مردوں سے زیادہ شوق و دلچسپی سے کام کر رہی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ خان کو سامنے دیکھتے ہی تینوں نے ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں سے اشارہ کیا۔ ۔ ۔ ۔ اور ایک دم ڈھٹائی سے بیٹھ گئیں ——— !

"تم کام کیوں نہیں کر رہیں۔ ۔ ۔ ۔" شہاب نے اسی مصنوعی رعب سے پوچھا

"یہ اینٹیں اٹھانے کا کام ہے۔ ۔ ۔ ۔" اُسی شوخ سی چنچل لڑکی نے شکوے کے انداز میں کہا۔ ۔ ۔ ۔

"اینٹیں اٹھانے سے تو یہ کام آسان ہے!"

"ہمیں آسان کام نہیں چاہیئے۔ ۔ ۔ ۔ ہم محنت کے عادی ہیں۔"

لڑکی کے لہجے میں ایک دم عزم جھلک آیا۔ ۔ ۔ ۔

شہاب آنکھوں میں ایک دم تقدس اُبھر آیا۔ ۔ ۔ ۔ مرحبا اس قوم پر۔ ۔ ۔ ۔ جس کی بیٹیاں محنت و مشقت کی عادی ہوں۔ ۔ ۔ ۔ اس قوم کو کبھی دنیا کی کوئی طاقت جھکا نہیں سکتی۔ ۔ ۔ ۔ جس قوم کو محنت کی عادت ہو۔ ۔ ۔ ۔

"کیا سوچ رہے ہو خان ——— آزما کر دیکھ لو۔ ۔ ۔ ۔" لڑکی نے

ایک بار پھر پُر زور آواز میں کہا ۔ ۔ ۔ ۔

" تمہارا عزم بتلا رہا ہے کہ تم ہر کام کر سکتی ہو ۔ ۔ ۔ ۔ آزمائش کرنے سے فائدہ

۔ ۔ ۔ ۔ شہاب نے حیرت بھری گہری نظروں سے اس شوخ لڑکی کو گھورتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔

" ہمیں کام بتلاؤ ـــــ کام ـــــ !"

" آج اسی کام کو مکمل کرلو ۔ ۔ ۔ کل سے نیا کام دوں گا ۔ ۔ ۔ !

" ٹھیک ہے زباں ہے نا ۔ ۔ ۔ "

شہاب کو ایک بار پھر سوچ میں ڈوبنا پڑا ۔ ۔ ۔ صنفِ نازک ہیں ۔ ۔ ۔ کہ فولادی لڑکیاں ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی ضد کی پکی ۔ ۔ ۔ ۔ اور شہاب نے ایک تحسین بھری نظر سے پھر اس پُر جوش لڑکی کی طرف دیکھا ۔ ۔ ۔ جس کا دھوپ میں تمتمایا ہوا چہرہ ۔ ۔ ۔ آگ کی طرح سرخ ہو رہا تھا ۔ ۔ ۔ انگاروں کی لپک نے اس کی خوبصورتی میں آگ سی لگادی تھی ۔ ۔ ۔ شہاب نے ایک دم نگاہیں جھکا دیں ۔ ۔ ۔ پہاڑی لڑکی کا عزم ـــــ اس کی خوبصورتی ـــــ اور اس کی حاضر دماغی نے اسے پریشان کر دیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔

" اے خان ـــــ کل تم نے یہ کام نہیں کرنا ۔ ۔ ۔ !"

چلتے چلتے پھر اس لڑکی نے اپنا کام یاد دلایا ۔ ۔ ۔ ۔

" اچھا ـــــ !" شہاب نے جیسے شکست مان لی ۔ ۔ ۔ اور دھیرے سے سر جھکا کر آگے بڑھ گیا ۔ ۔ ۔ تینوں لڑکیوں کی سرگوشیوں کی آوازیں اسے سنائی دے رہی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔

عاطفہ

"بڑا اچھا خان ہے ....."

"کتنا شریف ہے ....؟"

"کتنا خوبصورت ہے .....!" تیسری سرگوشی، تیسری آواز اسی شوخ پہاڑی حسینہ کی تھی .... شہاب کا دل ایک بار مچلا .... اور اس نے ایک انداز سے پیچھے مڑ کر دیکھا .... وہ تینوں ایک دم کھڑی ہو گئیں۔ اور کام تیزی سے کرنے لگیں .... اسی شام شہاب گھر آ گیا .... عاطقہ کو وہ ان لڑکیوں کے بارے میں بتلانا چاہتا تھا .... مگر کچھ کہتے کہتے جھجک گیا .... کیونکہ محبت میں بدگمانی دو قدم آگے کھڑی ہوتی ہے .... وہ اکبر کو بتلا آیا تھا کہ ان لڑکیوں کو اینٹیں گیلی کرنے پر لگا دیا جائے .... وہ سوچتا رہ گیا کہ اگلی صبح خان کو نہ پا کر ان کے دل پر کیا گزرے گی؟ اور خود ہی اپنے خوبصورت خیال پر سر جھٹک دیا ... کہ مرد ہر واقعہ کو کتنی جلدی خود سے منسوب کر کے "مردانگی کی شان" سمجھتا ہے ... چاہے وہ لڑکیاں مجھے بیوقوف ہی بناتی ہوں ... اور پھر خود ہی سنبھل گیا۔ اس طرح وہ ڈاک بنگلے کو دیکھنے جاتا رہا ... شروع شروع میں تو کئی کئی دن رہتا رہا۔ مگر جوں جوں کام ختم ہو گیا اس نے اپنی وہاں کی رہائش میں بھی کمی کر دی وہ لڑکیاں بدستور "بلاؤں" کی طرح کام کر رہی تھیں .... اب وہ اس سے قدرے مانوس بھی ہو گئی تھیں ... وہ ان کے قریب جاتا تو تینوں اپنی زبان میں ایک دوسرے کو چھیڑتیں بھی .... اور آنکھوں ہی آنکھوں میں منع بھی کرتیں شوخ چنچل لڑکی بعض اوقات اس کی غیر موجودگی میں اس کا خیمہ بھی صاف کرتی پائی

گئی۔۔۔۔ جب شہاب نے استفسار کیا۔۔۔۔ تو وہ بات بنا جاتی" کہ اکبر خان نے کہا ہے۔۔۔ کہ جا کر پہلے خان کا خیمہ ٹھیک کر دو"!!

وہ اسے مشکوک نظروں سے دیکھتی۔۔۔۔ مگر پھر ایک دم اعتماد کی جھلک اس کے چہرے پر ابھر آتی۔۔۔۔ اور وہ بھاگ بھاگ کر اس کا کام کرتی۔۔۔۔ اور ہرنیوں کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی یہ جا ——— وہ جا ——— شہاب کو کو اس سے مانوسیت سی ہو گئی تھی۔۔۔۔ وہ بے تکلف اس سے باتیں کر لیتا۔ اور وہ بھی شوخ شوخ سی نظروں سے اسے دیکھتی رہ جاتی۔۔۔۔ بغیر پلک جھپکائے اس کا دیکھنا۔۔۔۔ شہاب کو اس کی معصومیت کی آگہی دیتا۔۔۔۔ اب تو وہ اکثر باتیں کرتا۔۔۔۔ اس کی پلکوں کی جھالر پر انگلی رکھتے ہوئے کہتا۔۔۔۔

"دلبرا نہیں جھکنا بھی تو سکھاؤ"!

"خان میرا قبیلہ جھکنے کے لئے اس دنیا میں نہیں آیا۔۔۔۔"!

اور شہاب اس کے وقار پر دم بخود ہو کر رہ جاتا۔۔۔۔ اور محتاط ہو جاتا

عاطقہ کی فرمائشوں پر آصف نے سبھوں کو تیار کر دیا۔۔۔ کہ یہ چند دنوں کے لئے تفریح کی خاطر پھوپھا کے ہاں جا کر چند دن گذار لیں۔۔۔۔ دراصل آصف کی دلی تمنا یہی تھی۔۔۔۔ کہ بچپن کی منگنی کے بعد عاطقہ اور کامران کو آپس میں مہذبانہ انداز میں ملنے کا موقع ملنا چاہیئے تاکہ آپس میں افہام و تفہیم کے ذریعے باہمی یگانگت بڑھ سکے۔۔۔۔ ایک دوسرے کو پرکھنے کا موقع ملے۔۔۔۔ ذہنی قربت انہیں انہیں ——— خوشگوار ازدواجی زنجیروں میں جکڑنے کے بعد ایک

عاطقہ

پر سکون ماحول بخش سکتی ہے.... دلی محبت کی تڑپ دے سکتی ہے....
اپنی بیماری کی وجہ سے وہ اس فرض سے جلد از جلد سبکدوش ہونا چاہتے تھے..
سعدیہ اپنی مرحومہ بہن سے کیئے گئے وعدے کو وہ نبھانا چاہتے تھے... کیونکہ
شہاب ان کے اعصاب پر پوری طرح سوار تھا.... ہر معاملے میں وہ شہاب
کو عاطفہ کا بہترین ساتھی پاتے.... مگر بہن سے کی گئی زبان کو وہ توڑنے کی
طاقت نہ پاتے ——— ایک ہی تو ان کی بہن تھی.... وہ عاطفہ اور
کامران کو آپس میں ایک کر کے.... اس رشتے کو اور زیادہ مضبوط کرنا چاہتے
تھے.... عاطفہ کی شادی کے بعد وہ شہاب کے لئے سوچتے.... کہ اتنے
ہونہار لائق خوبصورت نیک شریف لڑکے کے لئے رشتوں کی کیا کمی....؟
کسی اچھے خاندان سے اس کا تعلق بھی قائم کر کے وہ پُر سکون ہو کر فرحت کے ساتھ
خانۂ کعبہ کی زیارت کو جانا چاہتے تھے.... اس نظریئے کی تکمیل کی خاطر انہوں
نے شہاب کو وہاں سے بلوایا ——— اور عاطفہ فرحت کے ہمراہ چاندنگر
بھجوادیا.... شہاب کی آب و ہوا بھی تبدیل ہو جائے گی.... کچھ کام کی تھکان
بھی دور ہو جائے گی۔ اور عاطفہ کامران ایک دوسرے کو دیکھ بھی لیں گے....
اپنی اس تجویز کو انہوں نے عملی جامہ بھی پہنا دیا.... اگرچہ شہاب کو اس گہرے
نظریئے کا علم نہیں تھا.... مگر یہاں کامران کا آگے پیچھے پھرنا اسے ایک
آنکھ نہ بھایا۔ اور تو اور ——— جب سے ابو جانی آئے ہیں وہ کامران
کو کچھ اس لفٹ دیتے رہے کہ شہاب کا سر چکرا گیا.... مثلاً ایک روز رضوان

کے منہ سے نکل گیا۔

"کہ بیٹی عاطقہ اپنے ہاتھ کی ایک سوئٹر ہمیں بھی بُن کر دو۔ شہاب تو تمہاری سوئیٹروں کی بہت تعریف کرتے ہیں!"

"پھوپھا جان میں حاضر ہوں!"

"تو جاؤ بیٹی ابھی کامران کے ساتھ جا کر اپنی پسندیدہ اُون لے آؤ۔۔۔ اور اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے اپنے پھوپھا کو سوئیٹر بُن کر پہنا کر جانا تو جائیں۔۔ ابّو نے ایک دم بولتے ہوتے کہا۔

"چلو عاطقہ پھوپھا جان ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں۔۔۔!"

اور عاطقہ شہاب سے نظریں ملائے بغیر کھٹ کھٹ کرتی یہ جا۔۔۔۔۔ وہ جا۔۔۔۔۔ شہاب کے دل میں درد کی ایک لہر اُٹھی۔۔۔۔ اور وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔۔۔ کار ڈرائیو کرنے کی آواز سُنائی دی۔ برداشت کے باوجود بھی۔۔۔ اس سے ضبط نہ ہو سکا۔۔۔ اور وہ دھیرے دھیرے سر جھکائے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اور پھر ایک دن اسی طرح۔۔۔ عاطقہ نے کچھ شاپنگ کے لیے جانا تھا۔۔۔ وہ بالکل تیار ہو کے نکلی تو ابّو پوچھ بیٹھے۔۔۔

"عطی کہاں جا رہی ہو؟

"ابو ذرا شاپنگ کرنے جانا ہے!"

"کامران کہاں ہے؟"

"ابھی تک کالج سے نہیں آئے"؟

"انتظار کرلو بیٹیا"!

شہاب کے بڑھتے قدم ایک دم رک گئے.... آنکھیں دھندلانے لگیں.... کان سائیں سائیں کرنے لگے.... آبو کیا چاہتے ہیں ——؟ کیا ہوگا ——؟ اور وہ ایک دم واپس پلٹ گئے.... بیدردی سے کپڑے اُتارے.... دروازے کی چٹخنی چڑھا دی.... اور خود دھم سے بستر پر گر گئے.... مدتوں کے رُکے ہوئے آنسو.... آج پھر بند توڑ کر بہہ نکلے....

انجم خالہ کے کھٹکھٹانے پر اس نے دروازہ کھولا.... تو کمرے کی ہر چیز بے ترتیب.... اس کی ذہنی پریشانی کی غمازی کر رہی تھی....

"شہاب طبیعت تو ٹھیک ہے"؟ انہوں نے پریشانی سے پوچھا۔

"خالہ بالکل ٹھیک ہوں"!

"تو پھر یہ کیا حالت بنا رکھی ہے"؟

"کیا روح کی بیقراری انسانوں کو نظر آ سکتی ہے خالہ....!"

"بیٹے اس دنیا میں کوئی کسی کا ہمدرد نہیں.... کوئی کسی کا مونس نہیں۔ کوئی کسی کا غمگسار نہیں۔ کیوں اپنی ہنسی اُڑواتے ہو.... بیٹے.... غموں کو پی جاؤ...." انجم نے بہت کچھ سمجھتے ہوئے کہا....

"ہاں خالہ آپ سچ فرماتی ہیں.... کوئی کسی کا نہیں.... واقعی اپنی

ہنسی اُڑانے والی بات ہوئی ——— میں انشاء اللہ غموں کو پینے کی کوشش کروں گا
میں اپنا مذاق کسی کو نہیں اُڑانے دوں گا۔ ۔ ۔ ۔! شہاب نے بیقراری سے ہاتھ
ملتے ہوئے کہا۔ ۔ ۔ ۔

شام کو جب دونوں شاپنگ کر کے لوٹے۔ ۔ ۔ تو کامران ہر ایک کو فخریہ وہ ٹائی دکھا رہا تھا جو عاطقہ نے اسے لے کر دی تھی۔ ۔ ۔ ۔ اور اپنا تحفہ بھی دکھانے کو کہا۔ جو ایک قیمتی خوبصورت دل نما بروچ کی شکل میں تھا۔ ۔ ۔ عاطقہ شہاب کی اُڑی اُڑی رنگت کو خوب سمجھ گئی تھی۔ رات بھی اس نے سر درد کی وجہ سے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ ۔ ۔ مگر جب سب اس کے کمرے میں۔ ۔ ۔ مزاج پرسی کے لئے آئے۔ ۔ ۔ تو وہ اتنی خندہ پیشانی سے باتیں کرتا رہا۔ ۔ کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آیا ——— کہ اس نے کس وجہ سے کھانا نہیں کھایا ——— !!

اور اگلی صبح جب اس نے یہ سُنا کہ ابو کہہ رہے ہیں کہ کامران کل تم نے ڈرائیونگ کرنی ہے۔ ۔ ۔ تو وہ تڑپ اُٹھا اور سچ مچ سر درد کا رات کا بہانہ کر کے سیر کو گول کر گیا۔ ۔ ۔ عاطقہ گلابی ساڑھی پر کالا سوئیٹر پہنے۔ ۔ ۔ اپنی دراز چوٹی کو سامنے کیئے اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ اس کے سامنے آئی شہاب نے دل کو سنبھالتے ہوئے اپنے پورے ضبط کے ساتھ۔ ۔ ۔ سر درد کی معذرت کر کے اسے بھجوا دیا۔ ۔ ۔ لیٹے بھی چین نہ آیا تو خالہ کے کمرے میں چلا گیا۔ ۔ ۔ اور وہاں سے ایک ناول کھا ور دلئے۔ ۔ ۔ اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ ۔ ۔ کبھی اُٹھتا

کبھی بیٹھتا ۔ ۔ ۔ اور کبھی کھڑکی کھول کر دور خلاؤں میں کچھ ڈھونڈتا ۔ ۔ ۔

جب یادوں کے تانے بانے بھی وہ نہ سلجھا سکا ۔ ۔ ۔ تو رات کے کپڑوں پر اوورکوٹ پہنے ۔ ۔ ۔ وہ باہر نکلا ۔ ۔ ۔ ۔

"قبرستان کس طرف ہے ؟"

"اجنبی ہو !"

"ہونہہ"

"جب ہی تو ۔ ۔ ۔ ۔"

اور وہ بتلاتے ہوئے راستوں پر چلتا ہوا ۔ ۔ ۔ اس حقیقی جگہ پر پہنچ گیا ۔ ۔ ۔ جہاں سکون ہی سکون ہے ۔ ۔ ۔ جمود ۔ ۔ ۔ ہی جمود ہے ——— ! کوئی شور نہیں ۔ ۔ ۔ کوئی ہنگامہ نہیں ۔ ۔ ۔ کوئی کسی کو دکھ نہیں دیتا ۔ ۔ ۔ کوئی کسی کا دل نہیں توڑتا ۔ ۔ ۔ ہر کوئی ایک چپ سادھے ۔ ۔ ۔ اپنی دنیا میں مگن ہے ۔ ۔ ۔ شہاب اس پرسکون جگہ پہنچ کر بہل گیا ۔ فاتحہ خوانی کرتا رہا ، کتبے پڑھتا رہا ۔ ۔ ۔ دل پر سے بوجھ اتر گیا ۔ ۔ ۔ بھیگی بھیگی پلکوں کو جھکائے شام کے سرمئی اندھیرے میں گھر لوٹا ۔ ۔ ۔ !!

رات کے کھانے پر بھی وہ خاموشی اختیار کیئے رہا۔۔۔ کھانا کھا چکنے کے بعد بڑے سب ایک کمرے میں اکٹھے ہو گئے۔۔۔ اور عاطفہ، کامران اور شہاب عاطفہ کے کمرے میں کچھ دیر بیٹھے رہے۔۔۔ کامران سیر کا ذکر ہنس ہنس کر کرتا رہا۔۔۔ شہاب نیم وا آنکھوں سے عاطفہ کا جائزہ لیتا رہا۔۔۔ عاطفہ اس کے دل کی پریشانی سے غافل نہ تھی۔۔۔۔ اس سے پیشتر کہ شہاب اُٹھ کر چلا جائے عاطفہ نے ہنستے ہوئے کہا۔۔۔۔

"بھئی آج کی میٹنگ برخاست کی جائے گی کیونکہ صبح جانا ہے۔۔۔"

"صبح جانا ہے ——— تو آج رات خوب زبردست محفل جمنی چاہیئے"
کامران نے دل کی بات ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں شہاب کیا ارادے ہیں ———" عاطفہ نے پوچھا۔

"میری طبیعت تو ویسے ہی ٹھیک نہیں اس لئے میں معذرت خواہ ہوں"

شہاب کے لہجے کا درد عاطفہ سے چھپ نہ سکا....

"دوست! مجھے افسوس ہے کہ تم یہاں آکر بیمار ہو گئے"

"اپنی اپنی قسمت ہے.... میری قسمت میں سیر و تفریح سے لطف اندوز ہونا نہیں تھا....!" کہہ کر وہ سر جھکائے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا....

"کیا بات ہے، شہاب کچھ خاموش سے ہیں"

"ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ویسے تو بڑے ہنس مکھ ہیں"

"کہیں ہم دونوں کو آپس میں بیٹھا دیکھ کر بُرا تو نہیں مناتے!"

"اتنے تنگ نظر نہیں.... اور پھر ہم دونوں کے درمیان ایسی کوئی خاص بات بھی تو نہیں....!"

"کیوں کیا بچپن کے رشتے سے زیادہ بھی کوئی خاص بات ہو گی!"

"میں بچپن کے رشتوں کی قائل نہیں ——" عاطفہ نے کھل کر بات کی...

شہاب اپنے کمرے کی طرف جانے کی بجائے عاطفہ کے کمرے کے دریچے کی پچھلی جانب جا کر کھڑے ہو گئے.... نہ چاہتے ہوتے بھی... وہ یہ حرکت دل کے ہاتھوں کرنے پر مجبور ہو گئے... کھڑکی اگرچہ بند تھی... مگر ان کی باتوں کی آواز باہر سنائی دے رہی تھی....

"رشتوں کی تو تم قائل نہیں ——؟ کیا میں تمہیں پسند نہیں؟" کامران نے کمال بیباکی سے پوچھا....

"تم میرے کزن ہو —— میرے بھائی ہو —— ناپسندیدگی کی تو کوئی وجہ نہیں"

"جہاں رشتہ طے پا جاتے وہاں بھائی کا لفظ کچھ جچتا نہیں!"

"میں نے اس بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں!"

"اب سوچ لو——!"

"ایسی فضول باتوں کے سوچنے کا میرے پاس وقت ہی نہیں——! آپ خدا کے لئے اپنے کمرے میں جائیے——مجھے نیند آ رہی ہے...."

"کیا میں سمجھ لوں کہ تمہیں مجھ سے نفرت ہے——!"

"محبت نفرت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا——آپ میرے بھائی ہیں جو مجھے ہر حال میں عزیز ہیں——!"

"تمہیں شہاب پسند ہے؟" کامران نے ایک دم ناگشتے ہوئے لہجے میں کہا...

"آپ کا مطلب——؟" عاطقہ نے سٹپٹاتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب تو واضح ہے.." کامران نے ہلکے سے طنز سے کہا۔

"مجھے آپ سے ایسی چھچھوری باتوں کی امید نہیں تھی...."

"اس میں چھچھوری بات کا کیا مطلب! کہہ دیجیے کہ وہ میرا بھائی ہے؟"

کامران نے اسی کے لہجے میں بات دہراتے ہوئے کہا۔

"کامران صاحب میں آپ سے اتنی فری نہیں۔ اور آئندہ بات کرتے ہوئے محتاط رہیئے....!" یہ کہہ کر وہ تیزی سے تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی خالہ انجم کے کمرے کی طرف مڑ گئی.... شہاب کے کمرے کی بتی بجھی ہوئی تھی۔ اس کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی.... بہت کچھ سوچتے ہوئے بھی... وہ کچھ نہ کر سکی

شہاب نے عاطقہ کی باتیں سُنیں تو اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ہر سُلگتا ہوا واقعہ ایک مفروضہ بن کر اس کے ذہن سے اُڑنے لگا۔۔۔ ہونٹوں پر ایک عجوب سا تبسم چھا گیا۔ بڑے دلنواز انداز میں سگریٹ سُلگایا۔۔۔ روح ہلکی پھلکی سی محسوس ہونے لگی۔۔۔ انداز بے خودی سے ٹہلتے ٹہلتے برآمدے میں کامران سے اندھیرے میں ٹکرا گئی۔۔۔

"دیکھ کے چلیئے مسٹر!" کامران نے غصّے سے کہا۔۔۔

"ٹھوکر تو آپ نے ماری ہے!" شہاب نے آہستگی سے کہا۔

"اور چوٹ مجھے لگی ———!" کامران نے زخمی جذبات کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس کا افسوس ہے۔۔۔!"

"شکریہ!" کامران نے جلے ہوئے لہجے میں کہا۔۔۔ اور شہاب کے ہونٹوں پر اس تاریکی میں مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔۔۔

یہاں دونوں میں ٹکراؤ ہوا۔۔۔ وہاں کہیں آسمان سے ایک ستارہ ٹوٹ کر تاریکیوں میں گم ہو گیا۔۔۔ خاندان کے بزرگوں نے ان کی قسمت پر اپنے فیصلے کی آخری مہر لگا دی۔۔۔ عید کے تیسرے دن شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔۔۔ وہاں عاطقہ انجم کے کمرے میں زار و قطار رو رہی تھی۔۔۔ کتنے دنوں سے شہاب اس سے کھچا کھچا سا تھا۔۔۔ اور یہاں کامران نے اس کے زخموں کو چھیڑ دیا۔۔۔ وہ کسی قیمت پر بھی شہاب کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔۔۔ بچپن سے

لے کر جوانی تک اس کا رہا۔ ۔ ۔ ۔ اس نے شہاب کو دل کی گہرائیوں سے چاہا۔ اس کی تکلیف پر وہ تڑپا۔ ۔ ۔ ۔ اور اس کی تکلیف وہ تڑپی۔ ۔ ۔ ہر لحاظ سے وہ قدرت کا ایک شاہکار تھا۔ ۔ ۔ ۔ عاطقہ کا آئیڈیل۔ ۔ ۔ ۔ عاطقہ کی تمناؤں کا مرکز کامران سے ایک واضح رشتے کے باوجود وہ اسے ذہنی قربت نہ دے سکی۔ ۔ جو شہاب کو حاصل تھی۔ ۔ ۔ ۔ وہ دل میں فیصلہ کئے ہوئے تھی کہ جب کبھی اس معاملے پر کسی نے بات اُٹھائی وہ احتجاج کرے گی ——— اور اپنا فیصلہ منوا کر چھوڑے گی۔ ۔ ۔ وہ یہ تو بھول ہی گئی ——— کہ بیٹی بعد میں ہے۔ ۔ ۔ اور مشرقی لڑکی پہلے۔ ۔ ۔ جسے زبان کھولنے کا کوئی حق حاصل نہیں ——— وہ گائے بھینس کی طرح بے زبان آئی ہے اور بے زبان چلی جائے گی۔ اگر کبھی اس نے زبان کھولنے کی جرأت بھی کرلی۔ ۔ ۔ ۔ تو تیز دھار چاقو سے اس کی زبان اس طرح کاٹی جائے گی۔ ۔ ۔ کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش کر دی جائے گی۔ ۔ ۔ جہاں ظلم کا دور دورہ ہو ——— وہاں بے زبانوں کو کچلا ہی جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ پھر بزرگوں کی آن ——— اور عزت کا سوال آجائے۔ ۔ ۔ تو اس مظلوم ہستی کو چکی کے دو پاٹوں میں پیسا جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ !!

اگلی صبح یہ سفر کے لئے تیار ہو گئے۔ بظاہر تو شہاب خاموش تھا۔ ۔ ۔ ۔ مگر دل ہی دل میں بہت خوش تھا۔ ۔ ۔ ۔ سبھوں سے مل ملا کر یہ روانہ ہوئے۔ شہاب کے ساتھ سیٹھ آصف بیٹھے ——— اور عاطقہ تنتناتی ہوئی ماں کے ساتھ بیٹھ گئی ——— کیونکہ چلتے ہوئے کامران نے کمال بے باکی سے اس کا ہاتھ

پکڑنے کی کوشش کی۔ اور وہ ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر غصے سے باہر نکلی شہاب کار میں بیٹھا ہوا یہ سب نظارے دیکھ رہا تھا... وہ کامران کی، شکست پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا... یہ قافلہ روپ نگر کی طرف روانہ ہوا۔ کچھ دیر شہاب کار چلاتا رہا۔ کچھ دیر آصف چلاتے رہے... پھر آصف پیچھے فرحت کے ساتھ بیٹھ گئے۔ اور عاطقہ فرنٹ سیٹ پر آگئی...

"جناب کا منہ کیوں پھولا ہوا ہے ——" عاطقہ نے شرارتاً کہا۔

"تمہیں اس سے کیا ——؟"

"مجھے نہیں ہوگا تو کس کو ہوگا"!

"تم کامران کی فکر کرو... مجھے چھوڑ دو ——"!

"ان کی فکر تو کرنی ہی ہے... ظاہر ہے" عاطقہ نے سنجیدگی سے کہا..

شہاب نے سراسیمہ نظروں سے عاطقہ کی طرف دیکھا... اس کی سنجیدگی کو دیکھ کر اس کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ کچھ کہنا چاہتے تھے... مگر بزرگوں کی موجودگی میں کچھ کہہ نہ پائے... عاطقہ شیشے سے لگی بیٹھی باہر کے مناظر دیکھنے لگی... شہاب نے کئی بار گوشہ چشم سے دیکھا... اس کے چہرے پر بے بسی کے آثار دیکھ کر اس کا دل تڑپ اٹھا.. مگر مجبور تھا ——!!

سارا راستہ خاموشی سے کٹ گیا —— روپ نگر آچکا تھا...

گیٹ کے چوکیدار نے جو اپنی کار دیکھی تو ایک دم خوشی سے کھڑا ہوگیا... اور بھاگ کر کار کے پاس پہنچا۔ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا...

"چھوٹی بی بی چھوٹے سرکار آپ تو ٹھیک ہیں ——— !"

"ہاں بابا ——— ! تم سناؤ تم کیسے ہو ——— ؟" شہاب نے پوچھا...

"آپ کی دعاؤں سے بالکل ٹھیک ہوں..." کہہ کر اس نے گیٹ کھولا... سلیٹی بجری پر چرچراتی کار جا کر بیرونی برآمدے کے پاس جا کر ٹھہر گئی... نوکر جلدی جلدی بھاگے اور آنِ واحد میں سارا سامان اندر لے گئے... شہاب کے چہرے پر اپنا گھر دیکھ کر ایک انجانی سی خوشی چھا گئی۔ عاطقہ بھی اسے گوشۂ چشم سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی حقیقی خوشی محسوس کر رہی تھی کہ کم از کم اس کی نفرت تو کم ہو گی۔ کسی کے تیروں کا نشانہ تو نہیں بننا پڑے گا۔ اپنی صبحیں اپنی شامیں تو ہوں گی ———

آصف اور فرحت اندر جا چکے تھے... شہاب کار کو پورٹیکو میں کھڑا کر کے واپس پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بڑے انداز سے چلے آ رہے تھے... ستون کی آڑ میں عاطقہ کو کھڑا دیکھ کر بے نیازی سے گزرنا چاہتے تھے... کہ ایک مترنم سی آواز سماعت سے ٹکرائی...

"ناراض ہو ——— ؟"

"مجھے کیا حق پہنچتا ہے ؟"

"آپ کو نہیں پہنچتا تو کسے پہنچتا ہے ؟"

"آپ کے کا... !"

"شاہی تمہیں قسم ہے۔ اگر تم نے دوبارہ... اس کا نام لیا۔"

عاطقہ کی آنکھوں میں شبنمی قطرے نمودار ہو گئے...

"کس کا نام لوں ——— ؟" شہاب نے اس کے مہکتے سانسوں سے قریب ہو کر پوچھا۔

"شانی کا ——— !" عاطقہ نے اپنے سنہری ہاتھ منہ پر رکھتے ہوئے کہا۔۔۔۔

"سچ عطی ———!" شہاب نے اس کا نرم و گداز ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا۔

"یقین نہیں آتا۔۔۔۔!"

"کیسے یقین کر لوں۔۔۔۔؟" "آنکھوں نے تو بہت کچھ دیکھا ہے!" اس نے دل گرفتہ سی آواز میں کہا۔

"بیگانہ سی نظروں سے دیکھتے رہے ہو۔۔۔۔ اپنائیت سے دیکھتے تو کچھ بھی نہیں تھا"

"کچھ بھی نہیں تھا ——— ؟" شہاب نے حیرت سے پوچھا۔

"ہونہہ اُوں۔۔۔" عاطقہ نے سر نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

اور اس طرح دونوں لمحہ بھر میں ایک ہو گئے۔ عطی کا تمتمایا ہوا دلربا چہرہ اور اس پر بے ساختہ معصومیت شہاب کو ایسی حجاب آمیز ادائیں اکثر بیقرار رکھتیں۔ چاند نگر میں اس کا ذہنی خلفشار و انتشار اک خلش بن کر اس کے دل میں چبھتا رہا۔ روپ نگر سے آتے ہی وہ منوں بوجھ ذہن سے یک لخت اُتر گیا۔ ایک شگفتہ سی مسکراہٹ اس کے اداس سے چہرے

پر پھیل گئی۔ عاطفہ کو اس کے پاکیزہ جذبات و بلند خیالات کا پورا پورا احساس تھا.... اسی احساس کو پا کر تو اس نے کامران کے جذبات کی پذیرائی نہیں کی.... جس جاذب نظر مردانہ وجاہت نے اسے متاثر کیا۔ وہ صرف ایک انسان تھا ——— صرف ایک ——— اور وہ شہاب کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا ——— جب دل کے سنگھاسن پر وہ شہاب کو بٹھا چکی تھی ——— تو کسی دوسرے کا تصور بھی وہ گناہ سمجھتی تھی.... کامران کو اس نے اپنے پھوپھی زاد بھائی کے روپ میں عزت دی ——— اپنی مرحوم آنٹی کی خاطر ——— اس کے ساتھ گھومتی پھرتی رہی۔ چاند نگر کے پُرکیف ایام صرف شہاب کے دم سے تھے۔ اگر وہ ساتھ نہ ہوتا تو اتنا اطمینان و سکون بھی نہ ہوتا۔ شہاب کے ساتھ اس نے زندگی کی طویل رفاقت طے کی تھی۔ وہ ذہنی، روحانی اور دلی طور پر شہاب کو اپنا سب کچھ سمجھ چکی تھی۔ حالانکہ بارہا اس کی امی فرحت نے شہاب کے ماضی کے کچے چٹھے بھی کھولے۔ اس کی اصلیت بھی بتلائی۔ انسان کی برتری اونچی اونچی حویلیوں یا کوٹھیوں میں پوشیدہ نہیں۔ انسان کی فضیلت اس کے اعلیٰ کردار و بلند خیالات میں پوشیدہ ہے.... اور یہ جوہر امیروں کی نسبت غریبوں میں زیادہ ہوتے ہیں.... شہاب کا ماضی کچھ ہی کیوں نہ ہو ——— اس کی اعلیٰ ظرفی و بلند خیالی اور سیر چشم سے کسی کو مفر نہ تھا۔ اس کی عجز و انکساری، حلم و بُردباری سے اپنے تو اپنے.... غیر تک معترف تھے۔ سب سے زیادہ عزت اس کے ملازم کرتے.... اس کے ایک حکم یا ایک اشارے پر اپنی جانیں تک قربان

کرنے کو تیار ہو جاتے ۔ ۔ ۔ ۔ اس شدید محبت کا رد عمل وہ جذبہ وہ خیال تھا کہ اپنی عزت کروانے سے پہلے دوسروں کی عزت کرنی ضروری ہے ۔ ۔ ۔ ۔

چاند نگر سے آنے کے بعد ——— عاطقہ کی توجہ زیادہ ہی شہاب کی طرف مبذول ہو گئی ۔ شاید لاشعوری طور پر وہ شہاب کو اپنے گذشتہ رویے کی تلافی کرنے کے لئے یہ سب کچھ کر رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ حیرت تو یہ تھی کہ آصف یا فرحت نے ابھی تک عاطقہ اور شہاب کو نہیں بتلایا کہ وہ چاند نگر میں تو اپنا آخری فیصلہ بھی دے آئے ہیں ——— ایک رات شہاب اور عاطقہ تاش کھیل رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ کافی بھی پیتے جا رہے تھے کہ فضلو بابا نے تھوڑا سا پردہ سرکا کر کہا ۔

" چھوٹے سرکار آپ کو یاد کیا جا رہا ہے " !

" ابو بلا رہے ہیں ——— " عاطقہ نے پتے اونچے کرتے ہوئے کہا ۔

" بابا تم چلو ! میں آ رہا ہوں " شہاب نے کافی پی کر کپ رکھتے ہوئے کہا ۔

" غلطی بے ایمانی مت کرنا ——— میں ابھی آیا " ! شہاب نے یہ کہہ کر اپنے پتے کارنس پر رکھے ۔ کرسی کی پشت پر سے پلاسٹک کی تھیلی اتار کر عاطقہ کے سامنے رکھی ۔ " تم ذرا میرا سوئٹر بنو ۔ جب تک میں واپس آؤں ۔ ۔ ۔ " !

" شال اوڑھ لینا ، باہر سردی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ " ! عاطقہ نے آہستگی سے کہا ۔ ۔ ۔ شہاب پل بھر کے لئے ٹھٹکا ۔ لیکن عاطقہ کی حیا بار پلکوں کو جھکا پا کر شال اپنے گرد اوڑھی ۔ اپنی قسمت پہ خود ہی رشک آیا ۔ ۔ ۔ ۔ اور دروازہ بند کر کے راہداری سے ہوتا ہوا ابو کے کمرے کے سامنے ٹھہر گیا ۔ ۔ ۔ کسی کی باتوں کی

آواز سنائی دے رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ "امی ہیں" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ۔ ۔ شہاب پل بھر کے لئے ٹھٹھکا۔ ۔ ۔ ۔ ہلکے سے دروازہ بڑھایا۔ ۔ ۔ ابو سفید شنیل کا کمبل رضائی پر اوڑھے تکیوں کو اونچا کئے۔ ۔ ۔ ۔ بڑے وقار سے لیٹے ہوئے تھے۔ امی کروشیا انگلیوں میں تھامے کوئی لیس بُن رہی تھیں۔

"ابو آپ نے مجھے یاد کیا؟" شہاب نے تابعداری سے پوچھا۔ اور باپ کی پائینتی کی طرف بیٹھ گیا۔ ۔ ۔ ۔

"بیٹے یہاں کرسی پر بیٹھ جاؤ"! آصف نے پاس بچھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ۔ ۔ ۔

"نہیں ابو جو لطف آپ کے قدموں میں بیٹھ کر آتا ہے۔ وہ کرسی پر بیٹھ کہاں ملے گا"!

"بیٹے مجھے تمہاری سعادتمندی پہ ناز ہے۔ ۔ ۔ ۔ بڑھاپا آنے کے باوجود بھی میں خود کو بڑا طاقتور محسوس کر رہا ہوں۔ اور یہ طاقت جوان سعادتمند بیٹے کی موجودگی میں ہی آسکتی ہے"

"ابو مجھے اپنی تقدیر پہ رشک آتا ہے کہ میرے والدین مجھ سے مطمئن ہیں۔ ۔ ۔ خدا مجھے اتنی توفیق دے کہ میں اپنے والدین کی اور زیادہ خدمت کر کے سرخرو ہو سکوں"

"بیٹے خدا تمہیں خضر کی عمر دے"! آصف نے دردمندی سے کہا۔

"ابو خدا آپ کے اور امی کے سائے کو ہمارے سروں پر تادیر سلامت رکھے۔"

"سعادتمند اولاد والدین کے سائے کو برکت سمجھتی ہے" فرحت نے بھی خاموشی توڑی۔

"بیٹے میں اپنی لمبی چوڑی جائیداد کے لئے کچھ پریشان ہوں"

"میرے ہوتے ہوئے ابو آپ کو کس بات کی پریشانی ؟"

"شہاب بیٹے زندگی موت کا کوئی بھروسہ نہیں . . . میں چاہتا ہوں کہ جائیداد کا سرپرست تمہاری ماں کو بنا دوں۔ اس سلسلے میں میں تمہاری رائے لینا چاہتا ہوں" ! فرحت نے کنکھیوں سے شہاب کے تاثرات لینے کی کوشش بھی کی . . . .

"ابو خدا آپ کو عمر دراز عطا فرمائے . . . . آپ نے جو فیصلہ کیا ہے ۔ وہ یقیناً سوچ بچار کے بعد کیا ہوگا۔ امی میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو ایک اچھے منتظم میں ہونی چاہئیں . . . یقیناً ان کی خداداد صلاحیتوں سے کاروبار اور نکھرے گا . . . اس کی گارنٹی میں دیتا ہوں !"

"وہ کیسے ———" آصف نے بصد اشتیاق پوچھا . . . .

"دیکھئے نا ——— گھر کا انتظام اور اسے بہ احسن طریق پر چلانا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں۔ یہ بھی ایک خداداد صلاحیت ہوتی ہے۔ گھر چلانے کو تو ساری عورتیں یہی دعویٰ کرتی ہیں کہ وہ گھر چلا رہی ہیں . . . مگر یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ثابت ہو سکتا ہے . . . . جہاں کوئی خوشی کوئی سکون کوئی حقیقی مسرت نہیں ہوتی۔ مہینے کی پندرہ تاریخ کو خالی ہاتھ ہو جاتے ہیں۔ اچانک کوئی مہمان آجائے کوئی بیمار ہو جائے کوئی خوشی آجائے تو دعویٰ کرنے والی خواتین کے چہروں پر سے ابھتے

بھی دیکھے ہیں۔۔۔۔"

تیرہ بجنے کا سُن کر دونوں میاں بیوی مُسکرا دیئے۔

فرحت کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ شہاب اتنی وسیع القلبی سے کام لے گا۔ اور اس فیصلے کا دل سے احترام کرے گا۔

"آپ کل کسی اچھے سے عرائض نویس کو بلوا کر اشٹام کروا لیجیئے گا!"

"شیخ احمد حسن کو تم ہی بلوا لانا!"

"بہتر۔۔۔۔!"

آصف کاروبار کے متعلق بات چیت کرتے رہے۔۔۔۔ ڈاک بنگلہ بھی ابھی تک مکمل نہیں ہوا۔ اس کے متعلق کچھ قیمتی مشورے دیتے رہے۔۔۔ عاطقہ انتظار کرتے کرتے وہیں کرسی پر سر ٹکائے سو گئی۔۔۔ جب کافی دیر کے بعد شہاب کمرے میں آیا۔۔۔ تو سوئی ہوئی عاطقہ کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گیا۔۔۔

وہ کرسی پر نیم دراز کہنی کو کرسی کی پُشت پر ٹیکے گردوپیش سے بے خبر سو رہی تھی۔ آہ سوتے میں وہ کس قدر آسمانی مخلوق لگ رہی تھی۔ شہابی رنگت پر گہرے پنک رنگ کے کپڑے اور قیامت ڈھا رہے تھے۔۔۔ کالے سوئیٹر میں اس کا حسن اور دوبالا ہو رہا تھا۔۔۔ ڈھیلے ڈھیلے بالوں سے چند لٹیں آزاد ہو کر اس کے رخساروں کو چوم رہی تھیں۔ گھنی گھنی پلکوں کی جھالر اس کے شہابی رخساروں پر ایک سایہ سا ڈال رہی تھیں۔۔۔ چھوٹے چھوٹے خراٹے لیتی ہوئی وہ بالکل ایک معصوم سی بچّی لگ رہی تھی۔۔۔ ایک ہاتھ سر کے نیچے اور دوسرا اس کی

گود میں پڑا ہوا تھا۔۔۔۔۔ سنہری گورا گورا سا ہاتھ دودھیا روشنی میں اور جگمگا رہا تھا۔۔۔ دوپٹہ ہر قسم کی قید سے آزاد ہو کر کرسی سے نیچے لٹک رہا تھا۔ شہاب اس قیامت خیز سراپے کو دیکھ کر مسحور سا ہو کر رہ گیا۔۔۔۔۔ عاطقہ تو اس کی زندگی کا ایک جزبن چکی تھی۔ صبح کے اجالوں۔ دوپہر کی تمتماتی روشنیوں، شام کے سرمئی ملگجے اندھیروں۔۔۔! در رات کی خوابناک تاریکی میں اس کے قریب رہی۔۔۔۔۔ اتنی شدت سے اس نے اس کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔۔۔۔۔ وہ دبے دبے قدموں سے اس کے قریب پہنچا۔۔۔۔ پھر یک بارگی گھٹنے ٹیک کر اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔۔ اور اچانک اپنا سر اس کے گھٹنوں پر ٹیک دیا۔۔۔۔

عاطقہ نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ مخمور آنکھوں میں نیند کا خمار۔ اور سرخ شعلوں کی لپک دیکھ کر شہاب پر ایک غنودگی سے طاری ہو گئی۔۔۔

"شابی کیا بات ہے۔؟"

"عطی بدگمان نہ ہو جانا۔ میں نے اپنی روح کی تمام تر شدتوں کے ساتھ تمہیں چاہا ہے۔ آج دل خود بخود چاہا۔ کہ تمہارے قدموں میں سجدہ ریز ہو جاؤں۔" ! عاطقہ نے خود کو سنبھال لیا۔ اور شہاب بھی سنبھل کر ایک طرف ہو کے بیٹھ گیا۔۔۔ عاطقہ پلکیں جھکائے خاموشی سے قالین کو تکے جا رہی تھی۔۔۔۔ آہستہ سے بولی۔۔۔۔

"ابو جان نے کس لئے بلوایا تھا۔؟"

اور شہاب نے ساری بات آہستہ آہستہ سنا دی۔ عاطقہ کے دل میں جانے کیوں انجانے سے خدشات ابھرنے لگے۔۔۔۔۔ شہاب کی پروقار جبین پہ سوچ کی

گہری لکیریں واضح تھیں۔۔۔۔۔۔وہ سوچ رہا تھا۔ کہ کس طرح اور کیسے ابو سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے عطی کو مانگ لے۔۔۔۔۔۔اب تو وہ اس کے بغیر ایک پل بھی نہیں گذار سکتا۔۔۔

"کیا سوچ رہے ہو شابی ۔؟"

"بہت گہری سوچ ہے ۔"

"کیا مجھے شامل نہیں کرو گے اپنی سوچوں میں شابی ۔!"

"تم ہی تو میرے تصورات کا مرکز ہو عطی ۔ ایک بھاری سا بوجھ دل پر محسوس کرتا ہوں ۔ کسے رازدان بناؤں ۔؟ کسے اپنی راہبری سونپوں ۔۔۔۔؟" شہاب نے غمگین سر کو جھٹک کر کہا ۔

"شابی کیا بات ہے ۔ کیا مجھے نہیں بتلاؤ گے ۔؟"

"عطی ۔۔! تمہیں پانا چاہتا ہوں ۔ کس طرح پاؤں ۔۔۔۔مجھے کوئی جائز راستہ بتادو ۔۔۔ میرا کوئی نہیں ۔۔۔۔۔۔ میرا کوئی نہیں ۔۔۔۔!" ایک دم اس کی آواز شدتِ غم سے رندھ گئی ۔۔۔۔ عاطفہ بھی نیچے اتر آئی ۔۔۔۔۔ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی ۔۔۔۔

"اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے ؟ مرد ہیں ۔۔ مردانگی سے کام لیجئے ۔ ابو سے کھل کر بات کر لیجئے ۔۔۔"

"ابو سے ۔۔۔ حوصلہ نہیں پاتا ۔۔۔۔!" شہاب نے غم میں بھری پلکوں کو اٹھاتے ہوئے کہا ۔

"کیسے مرد ہیں۔؟ ایک جائز تمنا ہے ..... اظہار کر دیجئے"۔

"اگر میری تمناؤں کا خون ہو گیا عظمیٰ۔ تو کس کا گریبان پکڑوں۔؟"

"خدانخواستہ نا امیدی کا تصوّر آپ کے دل میں جاگزیں ہوا کیوں۔؟"

"امّی ہر وقت کامران کی تعریفیں کرتی نہیں تھکتیں ..... مجھے ڈر ہے کہ کہیں میری قسمت کا پانسہ امّی کے ہاتھوں نہ پلٹ جائے"۔

"اس سے پیشتر کہ امّی اپنا کوئی فیصلہ کرے۔ آپ کل ہی ابّو سے تنہائی میں بات کر لیجئے۔"

"کر لوں عظمیٰ —؟"

"بالکل ..... بھلا اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے"۔

"ابّو نے کچھ کہا تو۔؟"

"شاہی ابّو کو آپ پر بہت ناز ہے ....."

جب یہ دونوں باتیں کر رہے تھے ..... سیٹھ آصف اتفاق سے اس وقت ان کے کمرے کے پاس سے گزر رہے تھے ..... چند لمحوں کے لئے وہ ٹھٹھکے ..... شہاب کا عندیہ سنتے ہی وہ کانپ سے گئے ..... دلی خوشی تو یہی تھی کہ اپنی اکلوتی بیٹی کا ہاتھ ایک ہونہار باوقار لڑکے کے ہاتھ میں دیتے ..... مگر دوسری طرف کامران میں بظاہر کوئی بھی برائی نہ تھی ..... اور پھر وہ اپنا خون بھی تو ہے ..... لاکھ وہ شہاب کو اہمیت دیئے ہوئے تھے ..... مگر دل کے کسی نہاں خانے سے ایک شک ضرور سر اٹھاتا۔

اور اس کی اصلیت کا پردہ اٹھاتے ہوئے اس کی اہمیت کو ہلکا کر جاتا۔۔۔۔۔ اور وہ کانپ کر رہ جاتے۔۔۔۔۔ فرحت کے کہنے پر ــــــ وہ آخری وصیت کرنے پر بھی مجبور ہو گئے۔۔۔۔۔۔ شہاب کے لئے تھوڑی بہت جائیداد نکال کر باقی سب فرحت اور عاطفہ کے نام کرنا چاہتے تھے۔۔۔۔۔ بقول فرحت کے کہ کہیں ان کی خون پسینے کی کمائی سے غیر گلچھڑے نہ کریں۔۔۔

دروازے پر قدموں کی آہٹ سن کر شہاب بولے۔۔۔

"عطی باہر کوئی ہے۔؟"

"تمہارا وہم ہوگا ــــــ رات کی سرسراتی ہواؤں کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔؟"

اتنا سن کر آصف دبے قدموں اندھیرے میں گم ہو گئے۔۔۔۔۔ شہاب نے اپنا شک مٹانے کے لئے باہر جھانک کر دیکھا۔۔۔۔۔۔ اندھیرے اس بات کی گواہی دے رہے تھے۔۔۔۔۔ کہ ابھی اس تاریکی میں کسی انسان کے سانس کی مہک رچی ہوئی ہے۔۔۔۔۔۔ وہ شاید آگے جا کر دیکھتے کہ عطی کی آواز سنائی دی۔۔۔۔

"شابی تمہاری ٹارچ کہاں ہے۔؟"

"میرے سرہانے رکھی ہے۔"

"اچھا میں پھر جا رہی ہوں۔!"

"میں چھوڑ آؤں۔؟" شہاب نے مڑتے ہوئے کہا۔؟

"نہیں شابی میں چلی جاؤں گی۔"

شہاب نے بے ساختہ اس کے مرمریں ہاتھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگا لیا۔

عاطفہ کا سر اپنے آپ اس کے کندھے سے جا لگا....

"عطی مجھے دھوکہ نہ دینا۔"

"شابی۔ تم عطی پر اتنا ہی اعتماد رکھو، جتنا خود پر رکھتے ہو" یہ کہہ کر وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اور شہاب اندھیرے میں اسے دیکھتا رہ گیا۔..

آصف نے اچانک دونوں کی باتیں سنیں، تو ان کے ہوش و حواس اُڑ گئے۔ جس بات کا خدشہ وہ مدت سے اپنے ذہن میں چھپائے ہوئے تھے۔ وہ باتیں کھل کر ان کے سامنے آگئیں۔!!

ساری رات کروٹیں لیتے گذر گئی۔ شہاب کی پر درد آواز۔ ان کی قوت سماعت سے ٹکراتی رہی۔

"مجھے ڈر ہے کہیں میری قسمت کا پانسہ ہی نہ پلٹ جائے۔!"

ساری رات جاگ کر گذاری . . . . کہیں کامران کا ہیولہ۔ اور کہیں شہاب کا...... دونوں اپنی تمام تر مردانہ وجاہت کے ساتھ کھڑے نظر آئے...... کبھی اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر۔ کامران کی طرف دیکھتے۔ تو کبھی شہاب کی طرف......

قدامت۔ جسامت.... شرافت.... بول چال.... محنت

مشقت سبھوں میں شہاب کا پلڑا بھاری رہا۔۔۔

"مت بھولو۔ کہ یہ ایک بھکاری کا بچہ ہے۔

ایک فقیر کو محلوں میں رکھو۔ تو اس کی فطرت نہیں بدل سکتی۔۔۔۔

پتھر کو شوکیس میں سجا دو۔ پتھر ہی دکھائی دے گا۔

پیتل پر سونا چڑھا دو۔ پیتل پیتل ہی رہے گا۔

صدائے بازگشت نے آصف کو بے چین کر دیا۔۔۔

انسان بھی کتنا خود غرض ہوتا ہے۔ اگر محبت دینے پر آئے۔۔۔۔ تو بیکراں سمندر بن جاتا ہے۔ اور اگر نفرت کرنے پر آئے۔ تو آگ کا سمندر۔ ہاں متضاد کیفیتوں سے اٹھایا ہوا خمیر۔ ہر رنگ دکھا سکتا ہے۔۔۔ دل کے نہاں خانے میں چھپی ہوئی ایک پھانس چبھتی رہی۔ کہ کسی وقت ہرا یا خون رنگ دکھا سکتا ہے۔۔۔ کہیں ایسا نہ ہو، کہ آج تک ریت میں بیج بوتے رہے ہیں۔۔۔ مگر پھر خیالات کا دھارا مخالف سمت اختیار کر لیتا۔ شہاب کا۔ حول کمینہ تھا۔ اس کی فطرت کمینی نہیں۔۔۔۔۔ اگر فطرت کمینی ہوئی۔ تو آج چوبیس برس میں چوبیس مرتبہ کوئی نہ کوئی حرکت سرزد ہو چکی ہوتی۔۔۔۔ عاطفہ کے ساتھ کئی مرتبہ تنہا دیکھا۔۔۔ مگر وہ اس کا اتنا ہی احترام کرتا رہا۔ جتنا ایک بھائی ایک بہن کا کر سکتا ہے۔۔۔۔ ماحول میں تو دونوں بہن بھائی کی حیثیت سے رہے۔۔۔ ہاں دنیا والوں نے شہاب پر واضح کر دیا۔۔۔ کہ وہ عاطفہ کا سگا بھائی نہیں۔۔۔ دوسرے جب سیٹھ آصف نے شہاب کو گود لیا۔۔۔ تو وہ اچھا خاصا سیانا بچہ تھا۔۔۔ اس کی یادوں میں ہمیشہ اپنا بچپن محفوظ رہے گا۔ جب بھی

وہ بھیک منگوں کو دیکھے گا۔۔۔۔۔ اداس تو ضرور ہو جاتا ہوگا۔۔۔ کوئی نہ کوئی انوکھا درد۔ اسے ضرور تڑپاتا ہوگا۔۔۔

آصف سر کو جھٹکتا رہا۔۔۔۔ کروٹیں لیتے لیتے صبح ہوگئی۔۔۔۔ صبح آنکھیں سوج کر انگارہ بن چکی تھیں۔۔۔۔۔ سورج کی روپہلی کرن کے ساتھ شہاب پرنور پروقار چہرہ لئے کمرے میں داخل ہوا۔۔۔

"ابو جان صبح بخیر۔"

"صبح بخیر میرے لال۔!"

"ابو آپ کو بخار تو نہیں۔؟" شہاب نے آصف کی بدلی ہوئی حالت دیکھ کر تشویش ناک لہجے میں کہا۔

"نہیں بیٹے ویسے ہی سر بھاری ہے۔"

"کیا رات نیند نہیں آئی۔؟"

"ہاں کچھ یہی کیفیت رہی ہے۔"

"ٹھہریئے میں آپ کے ڈاکٹر کو بلواتا ہوں۔"

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔"

کہ اتنے میں فرحت گرم سوٹ کے ساتھ شاندار کشمیری شال اوڑھے اندر داخل ہوئیں۔۔۔ صبح ہی صبح شہاب کو آصف کے پاس دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔۔۔ ذرا تحکمانہ لہجے میں بولیں۔

"کیا کام پڑ گیا ہے صبح صبح تمہیں۔۔۔" شہاب لہجے کے تیروں کو خوب

سمجھ چکا تھا....

"امی ہیں صبح صبح ڈاک بنگلے کی طرف جانا چاہتا تھا..... تاکہ قبل از دوپہر، گھر واپس آسکوں..... یہاں آکر معلوم ہوا۔ کہ ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں.... شہاب نے بوجھل آواز میں کہا۔

"کیا ہوا آپ کو۔" فرحت نے جلدی سے آگے جھک کر پوچھا.....

"یونہی معمولی سی طبیعت خراب ہے..... یہ بگلا تو گھبرا گیا ہے۔"

"امی دیکھئے نا۔ آنکھیں کتنی سرخ اور متورم نظر آرہی ہیں...." شہاب ایک بار پھر سب سلوک بھلا کر پیار کی لہروں پر بہنے لگا۔

"تم اپنے کام پر جاؤ۔ اور ہاں ذرا جلدی لوٹنا۔ کہ آج شام اشٹام ہونا ہے۔" فرحت نے زہر سے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بہتر امیؔ حضور۔"

کہہ کر شہاب دل برداشتہ اپنے کام پر چلا گیا۔ وہاں اکبر خاں کا خلوص۔ اور شیریں کی پیار بھری باتیں بھی اس کے ذہن کی تلخی کو دور نہ کر سکیں.... رہ رہ کر اسے یہی خیال ستاتا رہا۔ کہ ساری عمر کی ریاضت کو صرف مٹھی بھر روپوں پر قربان کیا جا رہا ہے۔ کہیں امیؔ کو یہ شک نہ ہو، کہ یہ ہماری دولت پر نظریں جمائے ہوئے ہے..... جتنی جلدی ہو سکے یہ اشٹام ہو جانا چاہیئے۔ تاکہ امیؔ کے دل سے بوجھ تو اتر جائے۔ اور گھر کا ماحول پر سکون ہو جائے۔ پھر امیؔ شاید مجھے پہچان سکیں... کہ میں کون ہوں۔؟

مزدوروں کو کام کرتا دیکھا..... ان کا کھانا پکتے دیکھا... تینوں حسیناؤں

کو بھرپور لگن سے کام کرتے دیکھا۔۔۔۔ اکبر خاں کو سمجھا کر مجھے دل سے وہ کار میں آکے بیٹھ گئیں۔۔۔۔ اچانک اس کی نگاہیں شیریں پر جم گئیں جو بڑی حسرت اور محبت سے اسے تک رہی تھی۔۔۔۔ شہاب نے ایک جھٹکے سے کار سٹارٹ کی۔۔۔۔ اور وہ تیزی سے اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر دوڑنے لگی۔ شہر میں پہنچ کر وہ بے مقصد گھومتا رہا۔۔۔۔ شام کے سائے جب گہرے ہونے لگے۔۔۔ ساری فضا پر شفق کی سرخی پھیلنے لگی۔ تو وہ اپنی کار میں عرائض نویس شیخ احمد حسین کو بٹھائے بڑی تیزی سے آصف ولا کی کی طرف جا رہا تھا۔

انتظام وغیرہ بخیر و بخوبی ہو گئے۔۔۔۔ عرائض نویس کو خوب اچھی طرح خوش کر کے شہاب واپس ان کے گھر چھوڑ کر آئے۔ اور سیدھے بڑے خوش باش امی کے کمرے کی طرف گئے۔۔۔۔ انہیں آج ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ایک بھاری بوجھ ایک ضمیر کی خلش اپنے آپ دور ہو گئی۔

"امی میں آ سکتا ہوں۔" شہاب نے پردے کے پیچھے کھڑے ہو کر اجازت طلب کی۔

"آ جاؤ بیٹے۔" یہ آواز آصف کی تھی۔۔۔۔

"اوہو میں تو امی جان کو مبارک باد دینے آیا ہوں۔ خدا آپ دونوں کا سایہ تادیر ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔۔۔۔" شہاب کے چہرے پر بھرپور طمانیت کے آثار دیکھ کر پل بھر کے لئے فرحت ضرور حیران رہ گئیں۔

انتظام ہونے کے فوراً بعد وہ آصف سے بضد ہو گئیں۔ کہ عید کو کوئی زیادہ

دن نہیں رہ گئے۔ اس لئے اب عاطقہ کی شادی کی تیاری شروع کر دو۔ پہلے پہل تو آصف یہ کہہ کر ٹال دیا کرتے تھے۔ کہ جن کے پاس دولت ہو۔ ان کو تیاری کی ضرورت نہیں۔۔۔۔ تیاری تو درمیانے طبقے یا غریب لوگوں کو کرنی ہوتی ہے۔۔۔ جو اپنی آمدنی سے پیسہ پیسہ جوڑ کر اپنی بچیوں کے لئے کس مصیبت سے جہیز اکٹھا کرتے ہیں۔۔۔۔۔ پھر اس جہیز میں ہزار کیڑے نکال کر۔ اس متوسط طبقے کی غیرت کا جنازہ سر بازار نیلام کیا جاتا ہے۔۔۔۔ یہ بھی نہیں سوچا جاتا۔ کہ ان کی اپنی بھی بیٹیاں ہیں۔۔ ان کی بیٹیوں کے ساتھ بھی یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔۔۔۔ کیا زمانہ آ گیا۔ انسان سے زیادہ مادی چیزوں کی قدر ہونے لگی۔۔۔۔۔ لڑکی کی قیمت جہیز کی چیزوں پر لگنے لگی۔۔۔۔ اس کی سیرت اس کا کردار اس کا حسن سب کچھ بیکار شے بن کر رہ گیا۔۔۔۔ جو لڑکی اپنے ساتھ بینک بیلنس کوٹھی کار۔ اور قیمتی زیبائش کا سامان ساتھ لے آئے۔۔۔۔ وہی دنیا کی قابل رشک ہستی بن سکتی ہے۔۔۔۔

”کچھ سوچ میں پڑ گئے“ فرحت نے ان کی طرف دیکھ کر حیرانی سے پوچھا۔ اور آصف کو رات کی تمام باتیں یاد آ گئیں۔ وہ شہاب کے مطالبے سے پہلے پہلے کچھ کہہ کر اس کی زبان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کرنا چاہتے تھے۔۔۔۔

”شہاب بیٹے آج تمہاری موجودگی تدبر۔ اور فراست سے ایک بہت بھاری فرض سے سبکدوش ہو گیا ہوں۔۔۔۔ اپنی زندگی میں جو لوگ دصیت کر جاتے ہیں۔ وہ کئی قسم کی الجھنوں سے چھٹکارا پا جاتے ہیں“

”شہاب تمہارے لئے تمہارے ابو نے کپڑے کی مل۔ اور رضا پور کے تمام

مکانوں کا کرایہ اپنے وصیت نامے میں لکھ دیا ہے ۔"

"میری اچھی امی خدا آپ کو اور ابّو کو خضر کی عمر دے ۔ ۔ ۔ مجھے صرف آپ کے پرشفقت سائے کی ضرورت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور کسی چیز کی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ !"

"بیٹے پھر بھی باعزت زندگی گذارنے کے لئے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے ۔"

"ابو ایک بہادر مرد کا سرمایہ اس کی غیرت اور اس کے بازو ہوتے ہیں ۔ آپ نے مجھے ایسی تعلیم و تربیت دی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ میں دونوں قسم کے سرمائے سے مالا مال ہے ۔ ۔ ۔ !"

"ہاں بیٹے مجھے تمہاری ذہانت اور تابعداری پر ناز ہے ۔"

"اور انشاء اللہ رہے گا ۔" شہاب نے پرجوش آواز میں کہا ۔

"بیٹے ایک فرض سے تو تم نے سبکدوش کر دیا ۔ دوسرے فرض سے بھی مجھے سبکدوش کر دو ۔ تو میری روح ہلکی پھلکی ہو جائے ۔ ۔ ۔ ۔ !"

شہاب کے کانوں کو یقین نہ آیا ۔ ۔ ۔ ۔ دل میں جلترنگ بجنے لگے ۔ خوشی و مسرت کی لہریں اس کے خوبصورت چہرے پر رقصاں ہو گئیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دل کی دھڑکن بے قابو ہونے لگیں ۔ ۔ ۔ ایک دم اپنی قسمت پر رشک آیا ۔ اور کنواری لڑکیوں کی سی شرم محسوس کر کے سر جھکا لیا ۔ ۔ ۔ ۔ تصوّر ہی تصوّر میں عاطقہ کو سرخ بنارسی کا دوپٹہ اوڑھے گھونگٹ نکالے سر جھکائے دیکھا ۔ ۔ ۔

"بیٹے میری بات کا تم نے جواب نہیں دیا ۔"

آصف کی آواز سن کر شہاب کے تصورات ایک دم غائب ہو گئے۔

"ابو جانی میں خوش نصیب ترین انسان ہوں۔ جن کے والدین اپنا بوجھ اس اولاد پر ڈالتے ہیں۔ جو اس بوجھ کو پلکوں کا بوجھ سمجھ کر اٹھا لے...... میں آپ کے دیئے ہوئے ہر بوجھ کو اپنی آنکھوں اور اپنے دل پر اٹھاؤں گا......" شہاب نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"بیٹے میں عاطقہ کے بارے میں فکر مند ہوں۔!"

ابو جانی اس معصوم ہستی کو بوجھ نہ کہیئے...... وہ تو ایک معصوم پھول ہے.."

شہاب کے کانوں میں شہنائیاں گونج اٹھیں...

"وہ اپنی تعلیم ختم کر چکی ہے۔ میں اپنی زندگی میں اسے اس کے گھر بستا دیکھنا چاہتا ہوں۔" آصف نے گہری نظروں سے شہاب کی طرف دیکھا۔

"ہر والدین اپنی بیٹیوں کے لئے یہی تمنا رکھتے ہیں۔" شہاب نے سر جھکائے جھکائے کہا......

"میں رضوان بھائی کو عید کے بعد کی تاریخ دے آیا ہوں۔ تمہاری مدد کی ضرورت ہے...... باہر کے سارے کام تمہارے نازک کندھوں پر ڈال رہا ہوں" آصف نے سیدھا تیر اس کے دل پر مارا...... اور وہ مرغ بسمل کی طرح تڑپ اٹھا...... اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے گرم گرم سیسہ اس کے کانوں میں انڈیل دیا اس کی روح پر کسی نے زہریلا تیزاب الٹ دیا ہو...... اور وہ اس کی جلن تڑپ سے اس طرح بے قرار ہوا اٹھا...... اس نے سلگتی ہوئی نظروں سے دونوں کو اس

طرح بے بسی سے دیکھا کہ اگر کوئی اور دل ہوتا۔ ۔ ۔ تو تڑپ اٹھتا۔ ۔ ۔ ۔ مگر وہاں تو مکمل بے حسی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔

شہاب کا دماغ سنسنا اٹھا۔ ۔ ۔ جسم کانپا۔ ۔ ۔ روح میں بے قراری پیدا ہوئی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ ۔ ۔ ۔ کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ ۔ ۔ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنی حسرتوں کو کندھا دے کر گیٹ سے باہر آگیا۔ ۔ ۔ ۔ ایک ٹیکسی کو ہاتھ دے کر ٹھہرایا۔ ۔ ۔ ۔ اپنے بے جان وجود کو دھکا دے کر زبردستی بٹھایا۔ ۔ ۔

"بابو جی کہاں — ؟"

"جہاں بے جاؤ۔ لے چلو۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اس ظالم دنیا سے بہت دور لے جاؤ۔" شہاب اپنے آپ بڑبڑایا۔ ۔ ۔ ۔

ٹیکسی ڈرائیور نے قدرے سر کو خم دے کر پیچھے کی طرف موڑا۔ ۔ ۔ ۔ شہاب کی زرد رنگت۔ ۔ ۔ ۔ اور مرجھائی ہوئی آنکھیں دیکھ کر یک بارگی اس کے دل میں ایک رحم کا جذبہ ابھرا۔ ۔ ۔ ۔ ٹیکسی کھڑی کر کے وہ پیچھے کی طرف آیا۔ ۔ ۔ ۔ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ شہاب کا سر ایک طرف کو لڑھک گیا۔ اس نے اس کے جسم کو ہاتھ لگایا۔ تو بالکل ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔

"بیچارہ بابو — ضرور کوئی دلی صدمہ پہنچا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔" ڈرائیور اپنے آپ بڑبڑایا۔ ۔ ۔ ۔

وہ جلدی سے فرنٹ سیٹ سے اپنی پانی کی تھرماس اٹھا لایا۔ ۔ ۔ ۔ پانی کے چھینٹے اس کے منہ پر بھی مارے۔ ۔ ۔ ۔ اور کچھ زبردستی اس کے حلق میں بھی ٹپکایا۔

اور اپنی ٹوپی سے کچھ ہوا بھی دی... قدرے حرکت پیدا ہوئی... تو ٹیکسی ڈرائیور کو خیال پیدا ہوا۔ کہ وہ سر راہ کھڑا ہے... ابھی کسی پولیس والے کی نگاہ میں آیا.... تو کسی نہ کسی الزام میں دھر لیا جائے گا... اور سارا دن تھانوں میں حاضریاں دیتے گزر جائے گا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ وہ بیٹھا۔ اور ٹیکسی سٹارٹ کر دی... آن واحد میں وہ اپنے کچے سے پرسکون مکان کے سامنے کھڑا تھا... ٹیکسی کا ہارن بجتے ہی بچے باہر کی طرف دوڑے۔

"ابو آ گئے..... ابو آ گئے....." کا شور اٹھا... ٹیکسی ڈرائیور کی بیوی زلیخا بھی پردے کی اوٹ سے جھانکنے لگی.... اس نے ادھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے کہا......

"زلیخا ذرا باہر آؤ.....!"

زلیخا باہر اپنا دوپٹہ ٹھیک کر کے آئی.... دونوں نے بڑی مشکل سے بابو کو باہر نکالا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اپنی پوری طاقت سے اسے اپنے کندھوں پر لادا...... اور گھر کے اندر لے گیا...... زلیخا نے جلدی جلدی بستر ٹھیک کیا... اور اس نے اسے لٹا کر وہ لحاف اوڑھا دیا... جو خاص خاص مہمانوں کی آمد کے موقع پر نکالا جاتا تھا......

اسد یہ کون ہے —؟ زلیخا نے دھیمی آواز سے اپنے شوہر سے پوچھا

"اجنبی —!"

اور زلیخا سے دوپٹے کی اوٹ سے دیکھنے لگی.... اسد نے شروع

سے لے کر آخر تک سب رام کہانی کہہ سنائی .... نوجوان کے چہرے پر بے بسی کے آثار صاف ہویدا تھے ...... لباس تراش سے کسی اونچے خاندان کا نور نظر لگتا تھا۔

"زلیخا یہ ابھی تک ہوش میں نہیں آیا۔ تم ذرا کمرہ گرم کر دو۔ اور تھوڑا سا دودھ بھی گرم کر دو۔ میں جب تک اس کے تلوؤں کو مساج کرتا ہوں.." یہ کہہ کر اس نے بڑی اپنائیت سے اس کے جوتے اتارے ... موزے علیحدہ کئے ..... اور اپنے پورے خلوص سے اس کے تلوؤں کو مساج کرنے لگا ...... زلیخا نے جلدی سے کمرے میں آگ بروشن کی .... دودھ گرم کیا .... اور ایک صاف ستھری پیالے میں ڈال کر لائی ..

"تم پلاؤ —؟"

"میں —!" زلیخا کا سانس حلق میں پھنسنے لگا ....

"ہاں زلیخا یہ ہمارا مہمان ہے ... یہ ہمارا بھائی ہے۔ اس سے پردہ کیسا —؟"

زلیخا کے چہرے پر ایک سرخ سی لہر دوڑ گئی .... باہر بچوں نے ادھم مچا رکھا تھا ... زلیخا نے آٹے کا کنستر آگے کر کے اس پر پیالی رکھی .... اور خود دبے دبے قدموں سے باہر نکلی ... اور بچوں کو ڈانٹ رہی تھی۔

"کہ تمہیں شرم نہیں آتی۔ تمہارے ماموں بیمار ہیں۔ اور تم لوگوں نے قیامت مچا رکھی ہے ....." لفظ ماموں سنکر اسد کا سینہ خوشی سے پھول گیا ... سوچنے لگا غریب ہیں تو کیا ہیں —؟ کم از کم خلوص اور سچے پیار کی دولت سے تو مالا مال ہیں .....

زلیخا کمرے میں آئی۔۔۔ تو اسد کہنے لگا۔

"زلیخا تم بھائی کے تلوؤں کو مساج کرو۔۔۔۔ میں دودھ پلا دیتا ہوں۔۔۔"

زلیخا جھجکتی ہوئی چارپائی کی پائنتی کی طرف بیٹھ گئی۔ اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے جھجکتے جھجکتے اس کے قدموں کو چھوا۔۔۔۔ گرم گرم دودھ کے قطرے حلق میں اترے تو شہاب نے آنکھیں کھول دیں۔۔۔۔ زلیخا نے دوپٹہ اور ماتھے پر کھینچا۔۔۔ اور نظریں جھکا کر اپنے کام میں منہمک ہو گئی۔۔۔۔

"میں کہاں ہوں۔؟"

"اپنے گھر میں۔۔۔۔!"

اپنے گھر میں۔۔۔۔ میرا کوئی گھر نہیں۔۔۔۔ میں بے گھر ہوں۔۔۔۔"

کہتے کہتے ایک دم شہاب کی آواز رندھ گئی۔۔۔ اور مدتوں کا صبر کا بندھ ٹوٹ گیا اور دو موٹے موٹے آنسوؤں اس کی موٹی مخمور آنکھوں کے گوشوں سے نکل کر کانوں کی لوؤں پر گر گئے۔

"میرے بھائی۔۔۔۔ ہم سب بے گھر ہیں۔۔۔۔ یہ دنیا تو ایک لالچ کا میلہ ہے۔۔۔۔ جہاں میں تمہارا حق غصب کر کے اپنا گھر بھرتا ہوں۔۔۔ اور تم مجھے اپنا حق دے کر رو دیتے ہو۔"

"میرے مخلص تم نے ٹھیک کہا۔ میں اپنا حق دے کر روتا ہوں۔۔۔ میرا حق بھی مجھ سے اس طرح چھینا۔۔۔۔ کہ مجھے اپنی تہی دامنی کا احساس خوب دلایا گیا۔۔ میں آج تک ایک بھول میں مبتلا تھا۔۔۔" شہاب نے گھمبیر آواز میں کہا۔

عاطقہ

"بھیا آج تک طاقتور کمزور کو دباتا - اور دباتا رہے گا۔۔۔۔۔ اپنا دل میلا نہ کیجیئے۔ یہ تو رسمِ دنیا ہے۔۔۔۔!"

ایک مترنم دھیمی سی آواز پائنتی کی طرف سے آئی۔۔۔۔ شہاب نے کن انکھیوں سے ایک مقدّس سراپے کو دیکھا۔۔۔۔ جو نور کی شعاعوں کے ساتھ خلوص دل لیئے اس کے قدموں کو چھو رہی ہے۔

"میری بہن - میں خود آپ لوگوں کے قدموں کی خاک ہوں۔۔۔ مجھے گنہ گار نہ کیجیئے۔۔۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے پاؤں کھینچ لیئے اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔!

"بابوجی ایسا نہ کہو - غریب غریب ہے۔ امیر امیر۔۔۔ ہے!۔۔۔۔" اسد نے فوراً کہا۔۔۔

"میرے مخلص ان ظاہری لبادوں کو نہ دیکھو - ان کے پیچھے ایک غریب کا تاریک ماضی دفن ہے۔۔۔۔ ان کے اندر۔۔۔۔ وہی کلبلاتا غریب جو پیٹ کی خاطر دھکے کھاتا رہا۔۔۔۔ کھاتا رہے گا موجود ہے۔۔۔!"

"آپ کسی گہرے نشتر سے گھائل ہوئے ہیں -!"

"میرے بھیا۔۔۔۔ نشتر کا سا نشتر۔۔۔ جو سیدھا میری روح کی گہرائیوں میں اتار اگیا۔۔۔۔ صرف میری بے کسی کا تماشا دیکھنے کے لئے۔۔۔"

"ابھی ایک ایسا ہمدرد طبقہ موجود ہے۔ جو تمہاری بے کسی کا تماشا کسی امیر کی ڈگڈگی پر نہیں دکھائے گا۔۔!" اسد نے پرجوش آواز میں کہا۔۔۔۔

"بھیا اس گھر کو اپنا گھر سمجھیئے۔۔"، زلیخا نے دھیرے سے کہا۔۔۔

عاطفہ

"میری بہن میں اس لائق نہیں.... کہ کسی کے خلوص کو اپناؤں....!"

"ایسی باتیں چھوڑو بابو.... اپنا نام بتاؤ....!" اسد نے فری ہوتے ہوئے کہا....

"بابو.... اونہہ.... ایک غریب بھکاری ہوں... ایک غریب بھکاری... نام پوچھتے ہوئے امیروں نے غریبوں کا تمسخر اڑانے کے ستاروں کی بلندی پر پہنچا پایا.... اور جب گرانے پر آئے تو پاتال کی گہرائیوں میں لا پٹخا.... غریبوں نے اپنی غریبی کے کانٹے چھپانے کے لئے نام "گل خان" رکھا.... مگر مجھے پھولوں کی یہ دنیا بھی راس نہ آئی۔ جن کے مقدر میں کانٹے لکھے ہوں۔ وہ پھول کی لطافت کیا جانیں۔"

"میرے بھائی! گل خان.... اب تم نے نا امیدی کی باتیں کیں۔ تو میں رو دونگا۔!"

"خدا نہ رلائے تمہیں! میرے مخلص۔! اپنی تقدیر کے سارے سیاہ حاشیئے میرے دامن میں پھیلا دو۔ میں جنم جنم کا جلا ہوا.... اس سیاہی کو بخوبی جذب کر لوں گا....!" شہاب کی آنکھوں میں غموں کے تاریک سے سائے لہرا کر رہ گئے۔

اتنے میں سارے بچے کمرے میں آ گئے.... اسد نے ان کا تعارف شہاب سے کروایا.... اس نے ہر بچے کو دل کھول کر پیار کیا.... اسے ایسا محسوس ہونے لگا.... کہ یہ جگہ جنم جنم سے اس سے مانوس ہے۔ وہ بھول کر امیروں کے محلوں کی طرف نکل گیا تھا.... جس نے اسے بہت دکھ دیئے

اور عاطفہ نے جو یادوں کے دیئے اسے بخشے ۔۔۔ وہ کسی قیمت پر ان دئیوں کو بجھانے کے حق میں نہیں تھا ۔۔۔۔ اس کے کان ترس گئے تھے کہ کوئی اسے شابی کہہ کر مخاطب کرے ۔۔۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں ۔۔۔ انتظار میں ۔ جب بھی باہر سے کوئی آ کر دروازہ کھولتا ۔ اس کی بے قرار نگاہیں آنے والے کے قدموں کو دیکھتیں کہ کہیں وہ اس کا محبوب تو نہیں ۔؟ انتظار ۔ بے قراری میں ایک ہفتہ گذر گیا ۔ دل کی خلش چین نہیں لینے دیتی تھی ۔۔۔ باہر وہ بالکل نہیں نکلا ۔۔۔ کہ اچانک ایک روز اسعد صبح گاڑی لے کر گیا اور آدھ گھنٹے کے اندر واپس آ گیا ۔۔۔ شہاب دھوپ میں بیٹھا کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا ۔۔۔ اسعد کو دیکھ کر چونک اٹھا ۔۔۔

"تم آ گئے ۔ خیر تو ہے ۔"

"تم نے مجھے کیوں نہیں بتلایا ۔ کہ تم سیٹھ آصف کے بیٹے ہو ۔" اسعد کے لہجے میں شدید شکایت تھی ۔

"سیٹھ آصف کا بیٹا ۔؟"

"کہہ دو میں نہیں ہوں اور یہ بھی کہہ دو کہ تم شہاب نہیں ہو ۔؟" یہ کہہ کر اس نے ایک اخبار اس کے سامنے کھول دی ۔۔۔ پہلے صفحہ پر شہاب کی تصویر تھی ۔ اشتہار عاطفہ نے دیا تھا ۔۔۔ "کہ ابو سخت بیمار ہیں ۔ اگر ان کی شکل دیکھنی ہے ۔ تو آ جاؤ ۔" شہاب پھٹی آنکھوں سے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا ۔۔۔ سانس نے اس کے سینے میں گھٹن پیدا کر دی ۔۔۔ ابو کا سراپا نظروں میں گھوم گیا ۔ ان کی شفقت

شخصیت نے جس طرح اسے نکھارا۔۔۔ وہ تمام عنایات یاد آنے لگیں۔۔۔۔۔
امّی سختی کرتی رہتیں۔ ٹوکرتی رہیں۔ ورنہ عاطفہ سے بے کراں تو۔ اور تمام نوکر چاکر تو اس کی دل سے قدر کرتے تھے۔ عاطفہ نے تو اسے بے پناہ محبت دے رکھی تھی۔۔۔۔ اس کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرتی۔۔۔۔ اور پہروں اس کے ساتھ بیٹھ کر اس کا دکھ سکھ سنتی۔۔۔۔ صدائے بازگشت عاطفہ کی اسے سنائی دے رہی تھی۔ "شابی تم کیسے مرد ہو۔؟ تمہارا دل ٹوٹا۔ تو تم گوشہ نشین ہو گئے۔ میرا دل ٹوٹا تو مجھے ساری خدائی کے سامنے بٹھایا جا رہا ہے۔۔۔ یہی تمہارا دعوئے محبت تھا۔۔۔ میرا ہاتھ بیچ منجدھار میں چھوڑا۔۔۔۔ اب ڈوبنے کا تماشہ دیکھو۔۔۔۔"

"میں مجبور ہوں۔۔۔۔ عطی۔۔۔۔ مجھے مجبور کر دیا گیا تھا۔۔۔ عطی"
شہاب اپنے آپ بڑبڑایا۔

اسد اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔۔۔ جو فقرہ اس کے منہ سے نکلا۔ وہ بے بسی و درد میں ڈوبا ہوا تھا۔۔۔۔ اسد نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اٹھایا۔۔۔

"بھیا اٹھو۔ میں تمہیں تمہاری منزل پر چھوڑ آؤں"

"اسد میرے مخلص میری کوئی منزل نہیں۔۔۔"

"کیا سیٹھ آصف سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں۔؟"

خاموشی۔۔۔۔ شہاب کیا کہتا۔ خلوص و محبت کا تو بے پایاں رشتہ موجود تھا۔ پتہ نہیں کس ظالم کی نظر لگی۔۔۔

"ہو نتے کیوں نہیں، ... اشتہار دینے والی غالباً سیٹھ آصف کی بیٹی ہیں۔ ان کے ساتھ بھی تمہارا کوئی رشتہ نہیں ......" اسعد نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی ......

"میں نے کب انکار کیا ہے۔؟" شہاب نے شرمندگی سے کہا۔"

"تو اٹھو ... باپ کی زندگی مانگتے ہو۔ تو اٹھو۔"!

اور شہاب کی نگاہوں میں سیٹھ آصف کا سراپا گھوم گیا ... ان کی بیماری کا تصور آتے ہی وہ کانپ اٹھا ...... ڈاکٹروں سے کون پوچھے گا۔ کہ ابو کی کیا حالت ہے۔؟ عاطفہ کے بہتے آنسوؤں کو کون پونچھے گا۔ امی کے زرد چہرے کو دیکھ کر کون تسلی دے گا ......!! خیالات نے ایک دم پلٹا کھایا۔ اور روٹھا ہوا شہاب اپنے دل کی صفائی سے مجبور ہو کر باپ کے قدموں میں پہنچ گیا۔ انہیں پھر شدید دورہ پڑا ہوا تھا شاید اس کا ردِ عمل شہاب کی گمشدگی ہو ...... وہ بے حس و حرکت لیٹے ہوئے تھے ...... عاطفہ ان کے سرہانے بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی ... امی بار بار دوپٹہ پھیلا کر دعائیں مانگ رہی تھیں ...... شہاب کو دیکھتے ہی وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ فرحت کی آنکھیں جھک سی گئیں۔ شہاب جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ابو کو پکار رہے تھے ......

"ابو ... آنکھیں کھولیئے۔ آپ کا نالائق بیٹا آگیا ہے۔"!

عاطفہ

"ابو جاگ جائیے ـــــ میں آپ کو کبھی تنہا چھوڑ کر نہ جاؤں گا"
سیٹھ آصف نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں...... رنگت ایک دم سفید لٹھے کی طرح ہونے لگی...... اچانک ڈاکٹر رحمان آ گئے... سبھوں کو کمرے سے نکل جانے کو کہا.... تاکہ مکمل سکون ہو سکے. شہاب کو تسلی دی..... کہ بیمار انسان کے سامنے اتنا شور نہیں مچاتے..... وہ تو اور گھبرا جائے گا - پھر انہیں کورامین کا ایک انجکشن دیا.. اور حالت قدرے تشویشناک تبلائی ـــ اور ہسپتال لے چلنے کا مشورہ دیا.... کسی کو بھلا کیا انکار ہو سکتا تھا.... فون کر کے ایمبولنس منگوائی - اور انہیں ہسپتال داخل کر دیا..... وہاں انہیں فوری آکسیجن دی گئی.... فرحت اپنے شوہر کی پٹی کے ساتھ افسردہ سی لگی بیٹھی تھی.... اس موقع پر شہاب کی آمد ایک بہت بڑا سہارا نظر آ رہی تھی...... کچھ دوائیاں خریدنے کے لئے شہاب نکلا...... تو خیال آیا... کہ اس موقع پر عاطقہ کا اپنے باپ کے سامنے ہونا بہت ضروری ہے....... وہ سیدھا "آصف ولا" کی طرف مڑا... کار سے بھاگتا ہوا نکلا...... اور عاطقہ کے کمرے کے باہر جا کر گہری سانس لیا..... آہستہ سے دروازہ کھولا...... پردہ سرکایا.... تو عاطقہ تکیے میں منہ دیئے اوندھی لیٹی ہوئی تھی....... شہاب کا دل کٹ سا گیا...... دبے قدموں بالکل اس کے قریب پہنچ گیا وہ رو رہی تھی. اس نے آہستہ سے اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیریں

عاطفہ نے تڑپ کر سر اٹھایا۔ ۔ ۔ اپنے مد مقابل شہاب کو پاکر ایک زور سے سسکی لی اور پھر تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ ۔ ۔

"عطی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدارا روؤ مت"۔

"آپ کون آتے ہیں مجھے چپ کروانے والے۔!"

"میں کچھ بھی نہیں ——— مگر پھر بھی میں تمہارے آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔!"

"آنسو دیے کسے کہتے ہیں، میں دیکھ نہیں سکتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔" گریہ شدت کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ اور متورم ہو رہی تھیں۔

"میں نے آنسو دیے ——" شہاب کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ ۔ ۔ ۔

"گھر سے فرار میں ہوئی تھی۔"

"او عطی —— ! میں تمہیں بتلائے بنا کبھی بھی نہ جاتا —— اگر ایسی اچانک بات نہ ہو جاتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" شہاب اس کے سرہانے بیٹھا۔ ۔ اور اس کا سر اپنے گھٹنوں پر رکھ کر سہلانے لگے۔ ۔ ۔ ۔ عاطفہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ خوب پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"عطی تم سے اگر کچھ مانگوں۔ تو دو گی۔ ۔ ۔ ۔"

اس کی آواز میں بے پناہ درد پاکر عاطفہ نے سوجھی سوجھی پلکوں کو بمشکل کھولتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ۔ ۔

"دو گی ۔؟"

"کیا ۔؟"

"پہلے وعدہ کرو.....!"

"اگر دینے کی چیز ہوئی تو تمہارے معاملے میں انکار نہیں ہوگا۔"

"سچ عطی ۔!"

"بالکل ۔!" عطی اس کے افسردہ چہرے کو دیکھ کر کچھ نرم سی پڑ گئی۔

"عطی..... مجھے دنیا بھر کی نفرتیں اپنی جھولیاں بھر بھر کر دے دو۔ تاکہ میں ان نفرتوں کو سمیٹتے سمیٹتے تمہاری طرف کبھی بھی نہ دیکھ سکوں... جہاں نفرتوں کا بیکراں سمندر دو... وہیں ان شبنمی قطروں..... (آنسوؤں کی طرف اشارہ کر کے) کو روکنے کے لئے اتنی بخالت برتو..... یہ کم از کم میرے نام سے تمہارے شہابی رخساروں پر نہ بہیں....!"

"شہابی.... خدا کے لئے سچ سچ بتلادو... میری محبت سے دل بھر گیا ہے۔ تو وہ بھی بتلادو۔ میں تمہارے راستوں سے خود بخود ہٹ جاؤں گی....."

عاطقہ کے قیمتی موتی شہاب کے ہاتھوں پر نچھاور ہونے لگے.....

"عطی مجھے خدا کے لئے زندگی کے کسی موڑ پر بھی غلط نہ سمجھنا... میں نے جو دو چیزیں تم سے مانگی ہیں ۔ وہ دو گی یا نہیں ۔؟"

"نہیں.... نہیں.... نہیں.....!" عاطقہ نے جوشِ جنوں میں شہاب کے کالروں سے پکڑ کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں ......!" شہاب کو اس کے غصے کی یہ بے ساختہ ادا بھا گئی۔ اور ایک دم اس کے دل میں سابقہ خدشات دور ہو گئے۔ اور محبت کے سوتے ابل پڑے

"نہیں ...... !" عاطفہ بھی اس کی فسوں کار نظروں کے سحر سے بے خود سی ہو گئی...."

اور آن واحد میں شہاب نے اس کے افسردہ سے وجود کو بازوؤں میں سمیٹ لیا...... دونوں کی بے قرار روحوں کو سکون مل گیا.... جھجھک کر سمٹی ہوئی عاطفہ اسے اتنی اچھی لگی۔ کہ اس کا جی چاہا..... کہ وہ اسے یونہی اپنے بازوؤں میں سمیٹے اس مکار دنیا سے اتنی دور چلا جائے...... جہاں کوئی اس کا سایہ بھی نہ پا سکے..... قربت کے لطیف احساسات نے دونوں کو غموں سے بہت دور ــ ایک ایسے جانفزا مقام پر پہنچا دیا..... جہاں پر خوشیاں ہی خوشیاں رقصاں ہوں۔ اور غم کے لئے اندر آنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔!

"قدموں کی چاپ سن کر عاطفہ چونکی اور آہستہ سے خود کو چھڑاتے ہوئے بولی......

"شابی کوئی آ رہا ہے۔"

"میرے راستے میں جو بھی آئے گا۔ وہ تنکے کی طرح اڑا دیا جائے گا....

اچانک دل کی آواز ــ اس کے منہ سے نکل پڑی...."

"یہ نازو تھی۔"

"بی بی جی آپ کا فون آیا ہے۔"

عاطفہ

"تم چلو میں آ رہی ہوں ....."

"کس کا ہوگا ...؟"

"کہیں ہسپتال سے نہ آیا ہو۔؟"

"او عطی — میں تو دوائیاں لینے کے لئے نکلا تھا۔ اور مجھے اپنی دوا یاد آگئی۔ شہاب نے قدرے سنجیدہ لہجے میں کہا....

"مل گئی پھر تمہیں اپنی دوا ....!!"

"شروع شروع میں ذرا کڑوی لگی۔ لیکن بعد میں تو شہد سے زیادہ میٹھی اور کیوڑے سے زیادہ معطر تھی۔"

"عطی بھاگ کر فون پر جاؤ۔ ... اور پھر میرے ساتھ ہسپتال جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔" اتنا کہہ کر عاطقہ پردہ اٹھا کر باہر نکل گئی .... اور شہاب ٹہلتا ٹہلتا اس کی رائٹنگ ٹیبل کی طرف مڑ گیا۔ کئی چھوٹے چھوٹے پرزے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے ... اس نے دو ایک اٹھا کر دیکھے تو ان پر اپنا نام لکھا ملا ... وہ عاطقہ کی بے قراری اور دل کی تڑپ سے بخوبی واقف تھا کہ اچانک ایک جملہ تیر کی طرح اس کی سماعت سے ٹکرایا ... اور اس کی سوچ کا محور خود بخود ٹوٹ گیا

"شہاب جلدی چلو۔ ابو کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ گھبرائی ہوئی عاطقہ نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ اور دونوں عالم گھبراہٹ میں ہسپتال پہنچ گئے ...... بھاگتے قدموں سے وہ کمرے میں داخل ہوئے۔

تمام ڈاکٹروں سے کمرہ بھرا ہوا تھا ... شہاب ہاتھوں سے سبھوں کو

ہٹاتا ہوا باپ کے سرہانے جا کر کھڑا ہو گیا۔۔۔۔۔۔

رنگت بالکل دُھلے ہوئے سفید کپڑے کی طرح ہو چکی تھی۔۔۔ آنکھوں کے گرد بڑے بڑے کالے حلقے نمایاں تھے۔۔۔۔۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں بڑی بڑی آنکھیں پتھرا چکی تھیں۔۔۔۔۔ ڈاکٹر مصنوعی طریقے سے سانس دے رہے تھے۔۔۔۔ پانچ منٹ کی ان تھک کوششوں کے بعد ان کی نبضیں ٹٹولی گئیں دل کو سٹیتھسکوپ سے۔۔۔۔ اور آنکھوں کو ٹارچ کی روشنی سے دیکھا۔۔۔۔ اور پھر خاموشی سے ان پر کمبل اوڑھا کر سب ایک ایک کر کے جانے لگے۔

عاطفہ ایک دم قدموں کی طرف سے انہیں جھنجھوڑنے لگی۔

"ابّو جانی۔۔۔۔ اکیلے نہیں جانا۔۔۔۔ مجھے ساتھ لیتے جائیے۔۔۔۔ مجھے ساتھ لیتے جائیے۔۔۔"

شہاب ان کے سینے سے لگا سسک رہا تھا۔

اور فرحت پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک ایک کو دیکھ رہی تھی۔۔۔۔۔۔

سہاگن کا لفظ پل بھر میں بدبختوں میں رنگ کر۔۔۔ ابھاگن میں تبدیل ہو چکا تھا عرش سے فرش پر قدرت نے پھینک دیا۔ ایک محبت کرنے والا۔۔۔ چاہنے والا۔۔۔ شوہر ہر فکر سے بے نیاز میٹھی نیند سو رہا تھا۔۔۔ اس کی اکلوتی بچی سسک رہی تھی۔ جس کے چہرے پر وہ ہلکا سا درد بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ آج کس شان بے پرواہی سے میٹھی نیند سو رہے ہیں۔

"امی ابّو کو آواز دیجئے۔ میری تو کسی بات کا جواب نہیں دیتے۔" عاطفہ نے ماں

سے لپٹتے ہوئے کہا۔

مسز آصف کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ اور وہ بلک بلک کر رو دیں۔ میت کو گھر لے جایا گیا۔۔۔ رضوان کو بذریعۂ ٹیلی فون اطلاع دے دی گئی۔۔۔ فرحت کے عزیزوں کو تاروں کے ذریعے مطلع کیا گیا۔ سارے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح سیٹھ آصف کے انتقال کی خبر پھیل گئی تمام ادارے بند ہو گئے۔۔ ان کا اپنا کاروبار ان کے سوگ میں تین دن کے لئے بند کر دیا گیا۔۔ پوری حویلی۔۔۔ ہجوم سے بھری پڑی تھی۔ سیٹھ آصف کو نہلا دھلا کر میت کو تیار رکھا ہوا تھا۔ بہت سے عزیز جو قریب قریب تھے پہنچ چکے تھے۔ رضوان کا شدت سے انتظار تھا۔۔۔ عاطفہ کئی بار بے ہوش ہو چکی تھی۔ رضوان کی آمد کا شور اٹھا۔۔ تو ساری حویلی آہ و بکا سے گونج اٹھی۔ سارا شہر گریہ کناں تھا۔۔۔ شہر کی ایک شفیق۔۔۔۔ خدا ترس۔۔۔۔ ہمدرد ہستی کا سایہ اٹھ چکا تھا۔ میت اٹھانے کے لئے عزیز و اقارب پردہ کروا کے اندر آ چکے تھے۔۔۔ عاطفہ بجلی کے ایک جھٹکے سے اٹھی۔۔۔

"شابی میرے ابو کو کہاں لئے جا رہے ہو۔۔۔۔ خدا کے لئے مجھے بھی ان کے ساتھ دفن کر دو۔"

اس کے دردناک نالوں سے ساری فضا بھیگ گئی۔ شہاب عاطفہ کی مخدوش حالت دیکھ کر مجنونانہ انداز میں اسے چپ کروا رہا تھا۔ اس کا سوگوار انداز اسے تڑپائے جا رہا تھا۔ مگر اللہ کی رضا میں کون دم مار سکتا تھا۔۔ میت

کو اٹھاتے وقت عاطفہ۔۔۔ ہائے میرے ابّو۔۔۔۔ میرے ابّو جانی کہہ کر بے ہوش ہوگئی اور آصف سنگدلی سے چپ چپاتے اپنی منزل کی طرف چلے گئے۔

جانے والے تو چلے جاتے ہیں مگر اپنے پیچھے ایک ایسا داغ ایک ایسا غم چھوڑ جاتے ہیں۔۔۔ جو ہر خوشی میں اپنا تاثر ضرور چھوڑتا ہے اور انسان گیلی لکڑی کی طرح تازیست سلگتا ہے۔۔۔ یادوں کے دھویں سے دم گھٹتا ہے۔۔۔ مگر اس گھٹن میں بھی انسان جیئے جاتا ہے۔۔۔

سیٹھ آصف تو دل کے مریض تھے۔۔۔ دل انہیں لے ڈوبا۔۔۔ مگر عاطفہ نے جس طرح باپ کا غم دل پر لگایا۔۔۔ جنم جنم کی روگی نظر آنے لگی۔ اس کی مخدوش حالت دیکھ کر ماں کا کلیجہ پھٹتا۔۔۔ شہاب کا دل جلتا۔ کامران ہر ممکن طریق سے دلجوئی کرتا۔ رضوان انجم بھی ہر وقت اسے سمجھانے بجھانے کی ناکام کوششیں کرتے۔۔۔

قرآن پاک کے ختم اگربتی لوبان کی خوشبو۔۔۔ پلاؤ زردے کی نذر و نیاز جو غریبوں سے زیادہ شہر کے مقتدر لوگوں کے حصے میں آئی۔ چہلم کی رسم بھی ختم ہوگئی اور سب عزیز و اقارب اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف روانہ ہونے لگے۔۔

فرحت کے بھائی بہن۔۔ ماموں وغیرہ سب متفکر تھے۔۔۔ کہ اتنی بڑی جائیداد کو کون سنبھالے گا۔۔ شہاب کو انہوں نے نہ شروع سے اہمیت دی۔ اور نہ ہی فرحت کے دل میں اس کی محبت پیدا کرنے کی کوشش کی۔۔ یہی وجہ تھی۔۔۔ کہ سکھانے پڑھانے سے تو دیواریں بھی پکی ہو جاتی ہیں۔ فرحت کے

دل میں اپنے عزیزوں کا بویا ہوا بیج الیا نفرت کا تناور درخت بن گیا کہ شہاب کی بے پناہ محبت ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی تابعداری، اس کی شرافت، اس کی انکساری کوئی چیز بھی تو فرحت کے دل میں اس کی قدر پیدا نہ کر سکی ۔ ۔ ۔ اس نے اپنے اعزہ کو یہ مژدہ سنا کر کہ آصف ساری جائیداد اس کے نام کر گئے ہیں۔ ان کی فکروں کو دور کر دیا ۔ ۔ اور وہ شہاب کو بے ضرر سا انسان سمجھنے لگے۔

اس صدمے میں اسعد، اس کی بیوی ۔ ۔ ۔ جو اس کے دینی بھائی بہن بن چکے تھے۔ ڈاک بنگلے کے مزدوروں میں سے وہ تین پہاڑی لڑکیاں خاص طور پر شامل رہیں ۔ ۔ ۔ یہ لوگ مسلسل اور برابر آتے رہے ۔ ۔ ۔ پہاڑی لڑکی شیریں شہاب کو گم سم دیکھ کر ۔ ۔ ۔ بڑی اداس ہو جایا کرتی۔ کتنی کتنی دیر وہ سوچوں میں ڈوبی رہتی ۔ ۔ ۔ پھر مغموم نگاہوں سے شہاب کی طرف دیکھتی ۔ ۔ ۔ اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوتی ۔ ۔ ۔ وہ چپکے سے شہاب کو دیکھ کر کہتی۔

خان ۔ ۔ ۔ ۔ صبر کرو ۔ ۔ ۔ ۔ مرنے کے بعد تو صبر آجاتا ہے ۔ ۔ لیکن اگر کسی کا جیتے جی کوئی کھو جائے ۔ ۔ ۔ ۔ تو اس کا صبر آنا بہت مشکل ہے، بہت مشکل ۔ ۔ اس کی آواز رندھ جاتی ۔ ۔ ۔ اور وہ آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھر کے چلی جاتی ۔ ۔ ۔ شہاب کچھ کھو سا جاتا ۔ ۔ ۔ شیریں کو دیکھتے ہی اس کا دل بیٹھنے لگتا ۔ ۔ ۔ دل میں خواہ مخواہ کا کوئی درد اٹھتا ۔ ۔ ۔ وہ اس سے نظریں نہ ملا سکتا کیونکہ شیریں کی نظروں میں پیار کا امنڈتا ہوا سمندر دیکھ کر خوف زدہ سا ہو جاتا ۔ ۔ ۔ اسے کیا ہو جاتا تھا ۔ ۔ ۔ وہ اپنی اندرونی کیفیت کو خود بھی

نہیں سمجھ سکتا تھا۔۔ وہ کسی اور کو کیا بتلاتا۔۔۔۔؟ آج کا شیریں کا فقرہ رہ رہ کر اس کے کانوں میں صدائے بازگشت کی طرح گونجتا رہا۔۔۔ "اگر کسی کا کوئی جیتے جی کھو جائے۔۔۔ تو صبر آنا بہت مشکل ہے۔" شہاب نے پکا ارادہ کر لیا۔۔۔ کہ وہ شیریں سے پوچھ کر رہے گا کہ اسے کون سا غم کھائے جا رہا ہے۔۔۔ وہ کون سا صدمہ ہے جسے محسوس کر کے اس کی آنکھیں بھیگ سی جاتی ہیں۔

کافی دنوں کے بعد شہاب باڈی گیج کے کام کی دیکھ بھال کے لئے جانے لگا۔ اس عظیم صدمے کے بعد اس کی صحت کافی گر چکی تھی۔۔۔ ایک اندرونی درد اپنے آپ اسے کھائے جا رہا تھا۔ اس نے اپنے بہلانے کی ہر ممکن کوشش کر دیکھی۔۔۔ مگر کامران کو دیکھ کر وہ یہی محسوس کرتا۔۔۔۔ کہ بازی وہ جیت جائے گا۔

آج صبح بھی۔۔۔ وہ براؤن کوٹ پینٹ میں مکمل مردانہ وجاہت کی جیتی جاگتی تصویر نظر آ رہا تھا۔۔۔ ایک ہاتھ اس کا پینٹ کی جیب میں اور ایک ہاتھ میں سلگتا ہوا سگریٹ پکڑے وہ آہستہ آہستہ قدموں سے عاطقہ کے کمرے کی طرف سے گزر رہا تھا۔۔ غیر ارادی طور پر اس کے قدم کمرے کی طرف بڑھ گئے۔۔۔ دھیرے سے پردہ سرکایا۔۔ کامران عاطقہ کے سرہانے رکھے ہوئے گلدان میں پھول سجا رہا تھا۔۔ اور وہ آنکھیں بند کئے لیٹی ہوئی تھی۔۔۔ قدموں کی چاپ سن کر اس نے اپنی بوجھل پلکوں کو تھوڑا سا اٹھایا۔۔۔ اپنے سامنے اپنے

شہاب کو دیکھ کر دھیرے سے مسکرائی... خدا بھی بعض اوقات دل کی بات کتنی جلدی سن لیتا ہے... وہ اس وقت شہاب کا تصور لئے آنکھیں بند کئے لیٹی ہوئی تھی کہ وہ آ گیا — !!

شہاب نے آنکھ سے اشارہ کامران کی طرف کیا... اور جواباً عاطفہ نے ہونٹوں کے گوشوں پر ایک پراسرار سی مسکراہٹ لاتے ہوئے آہستگی سے "ہونہہ" کہا......

"صبح بخیر کامران صاحب!" شہاب نے اس کی محویت کو توڑتے ہوئے کہا۔

"صبح بخیر" اس نے وہیں سے کٹتے ہوئے جواب دیا

"عاطفہ بڑی اچھی ہوا چل رہی ہے۔ بند کمرے میں اس وقت لیٹنا..... اُن بھیگی بھیگی نشیلی ہواؤں سے ناانصافی ہے۔!"

"اس ہوا سے ٹھنڈ لگ جانے کا امکان بھی تو ہو سکتا ہے۔!" کامران نے جھٹ مڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں کامران صاحب... آپ دروازہ بند کر کے بیٹھئے واقعی کہیں ٹھنڈ نہ لگ جائے۔"..... یہ کہہ کر عاطفہ نے چپل پہنے... ایک ہلکی سی شال اوڑھی اور شہاب کے ساتھ باہر نکل گئی۔

کامران کا رواں رواں سلگ اٹھا... وہ اپنی شکست و ناکامی پر جھنجھلا اٹھا..... غصے سے آگے بڑھا... کہ ایک ٹھوکر تپائی کو لگی اور

عاطفہ

خوب صورت چینی کا گلدان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر آ رہا۔۔ کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز سن کر عاطفہ بھاگتی ہوئی کمرے میں آئی۔ اپنے خوبصورت گلدان کے ٹکڑے ٹکڑے دیکھ کر اس نے قدرے غصے سے پوچھا۔

"کامران صاحب آپ نے میرے قیمتی گلدان کا یہ کیا حشر کیا۔؟"

"گلدان آپ کے نزدیک بہت قیمتی ہیں لیکن کسی کے احساسات کا خون کرتے یہ جاوید حیا۔۔!!

اور اسی لمحے ایک پراسرار سی مسکراہٹ عاطفہ کے لبوں پر کھیل گئی۔

شہاب، فرحت، امیؔ، رضوان اور انجم وہاں بیٹھے عاطفہ اور کامران سے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ رضوان بولے

"بھابی۔۔۔ بھائی صاحب کی حسرت دل ہی دل میں رہ گئی۔ عاطفہ کی کمزور حالت دیکھ کر میرا تو دل بہت کڑھتا ہے۔"

"اگر شہاب کا سہارا نہ ہوتا۔۔۔ تو عاطفہ پاگل ہو چکی ہوتی۔!"

انجم نے شہاب کے افسردہ چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بھائی ہو تو ایسا ہو۔۔ بہن کو اتنا بہلائے رکھتا ہے کہ ایک منٹ اسے رونے نہیں دیتا۔" فرحت نے جان بوجھ کر شہاب کی پوزیشن کو چھپاتے ہوئے کہا۔۔۔

"بھابی! بھیا مرحوم کو شہاب پر بڑا ناز تھا۔۔ اتنا اعتبار، جتنا والدین اپنی فرمانبردار اولاد پر کر سکتے ہیں۔"

"رضوان بھیا میرا شہاب تو سیاہ و سفید کا مالک ہے۔ اب باپ کے بعد اسی نے سارے کاروبار کو سنبھالنا ہے اور بہن کو اس کے سسرال رخصت کرنا ہے"۔۔۔ افرحت کے لہجے سے صاف چاپلوسی ٹپکتی تھی۔

کھل کر بات سامنے آجانے سے شہاب کا رنگ پھر اڑ گیا۔ دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔۔ جس بات کو سن کر وہ پہلے بھی گھر سے فرار ہوا تھا۔ وہی بات پھر سے دہرائی جانے لگی۔ شہاب کے ماتھے پر پسینے کے ہلکے ہلکے قطرے نمودار ہو گئے۔۔۔ اس نے آہستہ سے جیب سے رومال نکالا۔۔ اور پسینہ پونچھا۔۔۔ انجم بڑی گہری نظروں سے اس کا مطالعہ کر رہی تھی۔

رضوان بولے

"بھابی افسوس کہ بھیا عاطفہ کی خوشی نہ دیکھ سکے۔۔۔ عید کو کتنے دن رہ گئے تھے۔۔۔۔۔۔۔ کامران کی ماں بھی یہی حسرت لے کر چلی گئی۔۔ !!"

شہاب کی طاقت جواب دینے لگی۔۔۔ دل کی دنیا میں زلزلہ برپا ہو گیا۔ اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا کہ فرحت کی آواز نے اسے اور لڑکھڑا دیا۔

شہاب میرے لال۔۔۔ یہ تمہاری بہن کے سسرال والے ہیں۔ مجھ سے سادگی سے کوئی تاریخ مانگ رہے ہیں۔ چونکہ ابو کے جانے کے بعد تم ہمارے سرپرست ہو۔۔۔ اس لئے تم کوئی تاریخ دے دو۔ کاش آج تمہارے ابو زندہ ہوتے۔۔۔۔۔۔ تو وہ یہ فرض خود اپنے ہاتھوں

سے انجام دیتے"۔۔۔۔۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔۔۔۔!!

آخری فقروں نے شہاب کو اس کی برباد دنیا سے کھینچ لیا۔۔۔۔۔

ابو کا فرض۔۔۔۔ اور ان کی غیر موجودگی۔۔۔ تم۔۔۔ سرپرست۔۔۔۔۔ بہن کے سسرال۔۔۔۔ تاریخ مانگ رہے ہیں۔

اس نے اپنے لرزتے دل اور کانپتے وجود کو دیوار کے سہارے

آپ کو کوئی پاس نہیں۔!

عاطقہ نیچے بیٹھ کر اس کی کرچیاں چننے لگی۔

"گلدان کے ٹوٹنے کا آپ کو غم ہے۔۔۔۔ کسی کا دل ٹوٹ گیا۔ اس کا آپ کو غم نہیں۔!!"

"ابو کی نشانی تھی۔ اتنی سنبھال کر رکھی تھی۔!"

"اور یہاں بچپن کی یادوں کو سنبھال سنبھال کر رکھنے کی یہ سزا ملی"۔

"کامران صاحب آپ کیسی بات کہہ رہے ہیں"

"اتنی مشکل زبان تو نہیں کہ آپ سمجھ نہ سکیں"۔ کامران نے کٹتے لہجے میں کہا۔

"مجھے ایسی باتیں سمجھنے کی ضرورت نہیں"۔

"ضرورت شابی جو پوری کر دیتے ہیں"

"کامران صاحب حد سے بڑھنے کی کوشش نہ کیجئے"۔ عاطقہ نے غصے سے کہا۔

"ورنہ آپ کیا کر لیں گی"؟

"جس کا آپ گمان بھی نہیں کر سکتے۔"

"دھمکی دے رہی ہیں۔"

"بالکل"

"مجھے تمہارا چیلنج منظور ہے"۔!! یہ کہہ کر کامران غصے سے قدموں کو دھم سے تھاما...... سراسیمہ نظروں سے سبھوں کی طرف دیکھا... جن میں اس کا حقیقی مخلص کوئی نہیں تھا... دماغ چکرانے لگا... لب تھرتھرانے لگے...... بے بسی...... بے چارگی...... اور تہی دامنی...... آنسو بن کر آنکھوں میں امنڈ آئی......

اسے روتا دیکھ کر انجم کا بھی دل بھر آیا... اس کی آنکھوں نے بھی آنسوؤں کی ہزاروں مالائیں توڑ دیں.... رضوان نے بھی تڑپ کر سر جھکا دیا۔ پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھے... اور شہاب کو تسلی دینے لگے......

"میرے بیٹے حوصلہ کرو... اب تو صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں... تم نے اپنے ابّو کے سارے کاموں کو استقلال و پامردی کے ساتھ سنبھالنا ہے مرد ہو کر روتے نہیں... بلکہ اب تو تم نے اپنی امّی... اور بہن کو رونے نہیں دینا ان کے آنسو پونچھنے ہیں...... نہ کہ اپنے آنسو دکھانے ہیں... !!

"پھوپھا جان... ابو میرے ناتواں کندھوں پر بہت بھاری بوجھ ڈال گئے ہیں.... بہت بھاری"! شہاب نے دل کے بوجھ کو گھمبیر آواز میں کہا۔

"دل چٹان کی طرح مضبوط کرو۔۔ میرے لعل۔۔۔!" انجم نے آنسو پونچھتے ہوئے قدرے جوش سے کہا۔

"امی نہ روئیے۔۔۔ عاطفہ سنے گی۔۔۔ تو وہ بھی تڑپے گی۔ پہلے ہی اس کی صحت ان دنوں میں شدید گر چکی ہے" شہاب نے ایک دم اپنی حالت سنبھال کر ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد یہ غمزدہ محفل برخاست ہو گئی۔۔ شہاب ڈاک بنگلے کی طرف پوری رفتار سے کار چلائے جا رہا تھا۔۔۔ دماغ غم سے چکرائے جا رہا تھا۔۔۔ عاطفہ جو اس کی نس نس میں سما چکی تھی۔۔۔ عاطفہ جو اس کی زندگی بن چکی تھی۔۔۔ عاطفہ جو اس کی محبِ صادق تھی۔۔۔ عاطفہ جو اس کے خوابوں کے شیش محل میں چپکے چپکے آ کر اسے حسین حسین اداؤں سے کھیلتا کرتی تھی۔ اسے کیا معلوم۔؟ کہ زندگی کی منزلوں میں آرزوئیں ہمیشہ بھٹکا کرتی ہیں۔۔۔ دل کا سہارا چھوٹنے سے انسان کتنا مایوس ہو جاتا ہے اور باقی زندگی مایوسیوں کے گھنگھور اندھیاروں میں ڈنگ ٹوئیے مار کر ہی بتا دیتا ہے۔ ان گھنگھور اندھیاروں میں یاد سب سے بڑا سہارا ہوتی ہے۔۔۔ اگر یاد کو بھی تلخیوں کی دبیز تہوں کے نیچے چھپا دیا جائے۔۔۔ تو زندگی کا سفر۔۔ کتنا طویل ہو جاتا ہے۔۔۔؟ کتنا کٹھن ہو جاتا ہے۔۔۔! کتنا دشوار گذار ہو جاتا ہے

شہاب کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔

ڈاک بنگلے کی خوب صورت عمارت نظر آ رہی تھی۔ تارکول کی سیاہ چمکدار

سڑک بھی اسے دھندلی نظر آرہی تھی۔ دونوں جانب نیم کے درختوں کا سایہ سڑک کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔۔۔ شہاب کو دور سے ایک سیاہ دھبہ سا نمایاں نظر آنے لگا اور اسے پہچانتے ہوئے دیر نہ لگی کہ وہ سایہ۔۔۔ شیریں کا تھا۔۔۔ جو افسردہ غمگین سی، ان راہوں پر نظریں بچھائے۔۔۔ جو شہر سے آتی ہیں۔۔۔ ایک اونچے سے پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی۔۔۔۔ شہاب نے ایک جھٹکے کے ساتھ کار اس کے سامنے لے جاکر روک دی۔ اس نے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ادھ کھلی کلیوں کا نکھار آگیا۔۔۔!!

"شیریں کیسی طبیعت ہے۔؟"

"آپ سنائیے۔۔۔ بہت کمزور نظر آرہے ہیں۔"

"شیریں اب تو جینے کی حسرت نہیں، مرنے کو جی چاہتا ہے۔" شہاب نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

"خدا نہ کرے۔" بے ساختہ شیریں کے منہ سے نکلا۔ "ایسی باتیں نہیں کہا کرتے خان۔ آپ کو خدا بہت لمبی عمر دے۔" شیریں کے لالہ گوں ہونٹ کپکپانے لگے۔

"تمہیں دکھ ہوگا۔ اگر مجھے کچھ ہوگیا۔!!"

"بہت۔!"

"کیوں۔؟"

"شیریں میں تم سے کچھ پوچھوں تو ٹھیک ٹھیک بتاؤ گی۔!" شہاب

دھوئیں کے مرغولے اڑاتے ہوئے بولے۔

"خان میں کبھی تم سے کچھ چھپا نہ سکونگی . . . پوچھئے۔!" شیریں نے پلکیں اٹھائیں . . . اور پھر حیا سے جھکا دیں . . .

آؤ اس درخت کے تنے کے پاس بیٹھتے ہیں . . " شیریں کا راز جاننے سے زیادہ — وہ اس تصویر یا دھندلے عکس کی تصدیق چاہتا تھا جسے کبھی بابا نے اس کے ساتھ وابستہ کیا تھا۔ نام بھی وہی تھا۔ بچپن کی یادوں کا دھندلا دھندلا عکس بھی وہی تھا۔

وہ دل میں سوچنے لگا . . . کہ اگر یہ وہ شیریں نہیں — تو اس کی رشتہ دار ضرور ہوگی ورنہ اتنی مشابہت ناممکن ہے

شیریں اس کے پیچھے پیچھے دھیرے دھیرے قدموں سے چلتی ہوئی تقریباً اس کے قدموں میں ذرا فاصلے پر بیٹھ گئی

"پوچھئے خان"

"تمہارے والدین کہاں ہیں۔؟"

"اپنے شہر میں"۔!

"تم یہاں کس کے پاس ہو؟"

"اپنے ماموں کے پاس۔!"

"کیا تمہاری منگنی ہو چکی ہے؟"

"ہاں"۔ اور شہاب کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

"کس کے ساتھ ؟" شہاب کی آواز لرزیدہ سی ہو گئی۔

"اپنے منگیتر کے ساتھ —!" اس کے لبوں پر ایک دل نواز سی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔

"او۔ وہ منگیتر ہی ہو گا ۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کا نام۔۔۔۔۔ اور وہ ہے کہاں ۔۔۔!!"

شہاب نے اپنی بے چینی چھپا کر بہت سارے سوال اس پر کر ڈالے

"نام ۔۔۔ نام پوچھ کر کیا کریں گے ۔۔۔ وطن کی حفاظت کے لئے گھر سے نکلا ۔۔۔ اور پھر ۔۔۔۔ اس کی کوئی خبر نہ آئی ۔۔۔ معلوم نہیں ۔۔۔ زندہ ہے یا ۔۔۔ کہتے کہتے اس کی آواز رندھ سی گئی۔

"او ۔۔۔!" کہہ کر شہاب کے سینے سے منوں بوجھ اتر گیا ۔۔۔ اس نے شیریں کو تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

"خوش نصیب ہو ۔۔۔ کہ تمہارا سہاگ وطن کی آبرو کو بچاتے ہوئے قربان ہوا ۔۔۔ شہیدوں کا سوگ نہیں منایا کرتے ۔۔۔ وہ اگر زندہ ہے تو غازی اور اگر مر چکا ہے تو عظمت کا درجہ شہادت پا چکا ہے ۔"!

"میں سوگ تو نہیں مناتی خان ۔۔۔ دیکھو میں تو ہر وقت ہنستی رہتی ہوں ۔۔۔ بس ایک تڑپ ۔۔۔ ایک خلش ۔۔۔ ایک بے چینی ہے ۔۔۔ کہ وہ مجھ سے ملے بغیر چلا گیا ۔۔۔ میں ان دنوں بھی اپنے ماموں کے گھر تھی ۔۔۔ کاش میں اسے صرف ایک بار ۔۔۔ زندگی میں ایک بار دیکھ سکوں ۔۔۔ پھر میں اپنے

خدا سے کچھ نہیں مانگوں گی۔" شیریں کی شرارتی آنکھوں میں بے پناہ ادا ئیاں گھلنے لگیں۔۔۔ "اگر ابھی تمہارا منگیتر تمہیں ملنے آجائے۔۔۔۔ اور تمہیں میرے ساتھ بیٹھا دیکھے۔۔۔ تو کیا اس کا دل نہیں ٹوٹے گا۔؟"

"وہ مجھے خوب جانتا ہے۔۔۔۔ کہ شیریں اس کے بغیر کسی اور مرد کی طرف دیکھنا بھی گناہ سمجھتی ہے۔۔۔۔ اسے مجھ پر ہمیشہ سے بھروسہ تھا اور رہے گا۔!"

"تو کیا میں مرد نہیں۔؟" شہاب نے شوخی سے کہا۔

"تمہاری طرف میں نے کبھی بری نگاہ سے نہیں دیکھا۔ تم مجھے ویسے ہی بہت اچھے لگتے ہو۔" شیریں نے صاف دلی سے پاکیزہ لہجے میں کہا۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ تمہاری شکل بہت"۔۔۔

"تمہارے منگیتر سے ملتی ہے۔۔!" شہاب نے ہنس کر جملہ مکمل کر دیا۔۔۔

"ہاں یہی وجہ ہے۔۔۔ کہ میں لاشعوری طور پر تم سے باتیں کر کے اپنے دکھی دل کو مطمئن کر لیتی ہوں۔۔۔۔" شیریں کی آواز میں بے پناہ درد بھر آیا۔

"آج اکبر خان نے تمہیں کوئی کام نہیں دیا۔" شہاب کو دکھ ہوا۔ کہ اتنی دکھی لڑکی کو اس نے کیوں چھیڑا۔

"اب کام میں جی نہیں لگتا۔"

"کیوں۔" اس نے ایک دم حیرت سے پوچھا

"تم نظر نہیں آتے تو کام کرنے کو جی بالکل نہیں چاہتا۔"

"میں شہر چھوڑ کر آجاتا ہوں۔ میرا بھی اب وہاں دل نہیں لگتا۔"

"وہ کیسے؟ وہاں تو آپ کی بہت پیاری منگیتر موجود ہے۔"

"وہ میری منگیتر نہیں شیریں۔ وہ تو حوروں کا خواب اور فرشتوں کا تخیّل ہے۔۔۔ جو میری پہنچ سے کہیں زیادہ دور ہے۔۔۔ میں ٹھہرا ایک گناہ گار انسان۔۔۔!" شہاب نے ایک دل فگار آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"تو کیا وہ تمہاری منگیتر نہیں۔؟"

"نہیں!"

"تمہاری بہن ہے؟"

"نہیں۔!" ایک دم شہاب کے منہ سے نکلا اور ایک دل گرفتہ سی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔

"شیریں۔۔۔ وہ ایسا رشتہ ہے۔۔۔ جس میں جسموں کا کوئی تعلق نہیں بلکہ روحوں کی پرواز ہے۔۔۔ میری روح اس کے دل کی عمیق گہرائیوں میں گھوما کرتی ہے تمہاری سمجھ سے بالاتر ہیں یہ باتیں۔۔۔ چلو آؤ چلیں۔۔ کہہ کر شہاب اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔ اس نے ہاتھ بڑھایا۔۔۔ تو بالکل معصومیت سے اس نے اپنا مرمریں ہاتھ بڑھا دیا۔۔۔ شیریں بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ شہاب کار میں جا کر بیٹھ گیا۔۔ شیریں بجھے بجھے قدموں سے آگے آئی۔ اور کہا۔

"خان۔ آج میرا دل بہت اداس ہے۔۔۔ میں گھر جا رہی ہوں۔

کل کام پر آؤں گی۔" . . . . اور جواب سنے بغیر وہ تھکے تھکے قدموں سے پگڈنڈی کی طرف ہولی . . . شہاب کے دل میں انجانے غموں نے پھر مایوسیاں بھر دیں . . . . گھر سے وہ جس غم سے فرار حاصل کرنے کے لئے یہاں آیا تھا شیریں کو دیکھتے ہی سب غموں کو وقتی طور پر بھول گیا۔ اب اس کے جانے کے بعد ایک ایک کر کے سارے واقعات پھر سے یاد آنے لگے . . . اس کا سر چکرانے لگا . . . تھوڑی دیر کے لئے اس نے اپنا سر سٹیرنگ پر ٹیک دیا . . پھر ایک جھٹکے کے ساتھ کار سٹارٹ کر دی اور اپنے خیمے سے کچھ فاصلے پر کھڑی کر کے خود بوجھل قدموں سے اپنے خیمے کا پردہ اٹھا کر اندر چلا گیا . . . اور مسہری پر اوندھا لیٹ گیا . . . اکبر خان کو دوسرے مزدوروں نے بتلایا کہ آج . . بہت دنوں کے بعد خان آئے ہیں . . . اور وہ ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ اکبر ان کا پیغام لے کر شہاب کے خیمے میں آیا تو وہ سسک رہا تھا . . . . وہ سمجھا . . کہ باپ کی موت کا صدمہ ناقابل برداشت ہو چکا ہے . . . وہ بھرپور محبت سے آگے بڑھا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"خان . . . رونے سے آپ کے آغا جان واپس آجائیں گے . . وہ تو ایک سچے راستے پر گئے ہیں اور ہم نے بھی اسی راستے پر جانا ہے۔"

"اکبر خان وہ دکھوں سے چھوٹ گئے . . . مجھے بھی موت آجائے تو جان نیوا دکھوں سے نجات پا جاؤں۔"

"خان دوسروں کو جینے کا درس دینے والا خود موت کی تمنا کر رہا ہے۔"

"اکبر خان میں نے زیست کی ہر تمنا قربان گاہ کی بھینٹ چڑھادی۔ اب میرے پاس کچھ نہیں کسی کو دینے کے لیے ۔۔۔ یہ مجھ سے بہت ارمانوں کے خون کی ہولی سے کھیلنا چاہتے ہیں جو میرے دائرہ اختیار میں نہیں"۔

"حوصلے سے کام لیجئے خان ۔۔۔ دنیا بڑی بے رحم ہے۔ اس کی سنگدلی کا ڈٹ کر مقابلہ کیجئے۔"

"اکبر میرے بھائی ۔۔۔ ایسی ٹھوکر لگائی ہے ۔۔ کہ اٹھنے کے قابل نہ چھوڑا۔"

"بھیا زندگی میں ہر انسان کو ٹھوکر لگتی ہے۔ مگر سنبھلتا کوئی کوئی ہے مرد ہو۔ مردانہ وار اپنی مشکلات کا سامنا کرو۔"

اکبر خان کے تسلی آمیز جملوں نے شہاب کو قدرے سنبھالا ۔۔ اور وہ ٹھیک ہو کر بیٹھ گیا ۔۔۔ مگر سر جھکائے ۔۔۔ بیٹھا رہا۔

"آپ کے ملازمین آپ سے ملنے کے متمنی ہیں!"

"اکبر خان ۔ آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ۔۔۔ میں کل ان سے ضرور ملوں گا۔"

"آج آپ گھر نہیں جائیں گے؟"

"جب تک دل میں طوفان برپا ہے۔ شاید گھر نہ جاؤں۔" شہاب نے گھٹے گھٹے لہجے میں کہا۔

اگلے روز شیریں بھی نظر نہ آئی۔ اور اس طرح دن سونا سونا سا رہا ۔۔

وہ کچھ دیر کے لئے اپنے ملازموں سے ملا۔۔ ان کی ہمدردی میں سچائی پنہاں تھی ان کا خلوص لئے خیمے میں واپس چلا آیا۔۔۔ تین چار دن یونہی گزر گئے۔۔ دل کی پریشانی نے چہرے کو بھی پژمردہ کر رکھا تھا۔ اس وقت بھی وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے۔ انگلیوں میں سگریٹ تھامے کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا کہ اکبر خان کی آواز سنائی دی "جی یہی ان کا خیمہ ہے۔" شہاب نے نیم باز نظروں سے خیمے کے دروازے کی طرف دیکھا۔۔۔ تو اپنے سامنے عاطقہ کو دیکھ کر ایک دم گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

"عطی خیر ہے۔۔۔؟" بے ساختہ وہ پوچھ بیٹھا

"آپ اپنی سنائیے۔۔۔ دوسروں کو تباہی کے گڑھے میں گرا کر خود گوشۂ عافیت سنبھالے بیٹھے ہیں۔۔۔ یہی آپ کی مردانگی ہے۔ یہی آپ کے قول و قرار تھے۔۔۔"

"عطی خدا کے لئے مجھے غلط نہ سمجھو۔۔۔ تم بیٹھو تو سہی۔"

"آپ کی حقیقت مجھ پر واضح ہو چکی ہے شہاب صاحب۔ میں بیٹھنے کے لئے نہیں آئی۔۔۔ سوچا۔۔۔ زندگی میں دو دو باتیں ہو جائیں۔۔۔"

"جب تک تم بیٹھو گی نہیں۔۔ میں لڑنے کے موڈ میں نہیں آؤں گا۔" شہاب اٹھا اور عاطقہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی مسہری پر بٹھاتے ہوئے بولا۔

"ہاں جناب!۔۔۔ اب کہو۔۔۔ کیسے آئی ہو۔؟ اور کس بات سے طیش آیا ہے اس بندۂ ناچیز پر۔"

"جیسے آپ کو تو کچھ معلوم ہی نہیں۔!" عاطقہ کے لہجہ بھی ایک دم دھیما پڑ گیا۔

"تم کچھ بولو تو سہی۔۔۔۔ اگر میں اس بارے میں جانتا ہوں گا تو ضرور اقرار کر لوں گا۔۔۔!" شہاب کی آواز کی لغزش عاطقہ سے بھی چھپی نہ رہی۔ اور اس نے پلکیں جھکا دیں۔

"کیا تمہیں یہ معلوم نہیں کہ ابّو مرحوم شادی کی تاریخ مقرر کر چکے تھے۔"

"معلوم تھا۔!"

"معلوم تھا۔۔۔!" عاطقہ نے حیرانی سے پوچھا۔"کس خلوص کا ڈھنڈورا تم پیٹتے ہو؟ شہاب۔۔۔ میری بربادی کی خبر سن کر بھی تم ایسے چپ رہے جیسے یہ تمہارے لئے عام سی خبر ہو۔۔۔"

"عطّی۔۔ میری خاموشی۔۔۔ کو تم عام خبر سمجھتی رہیں۔۔۔شاید میں اپنا وہ ردّ عمل نہ بتلاتا۔۔ اگر تم میرے احساس کو نہ جھنجھوڑ دیتیں۔ میری گمشدگی تم سے پوشیدہ نہ تھی۔۔۔!"

"تو کیا تم اس خبر کو سن کر نکل گئے تھے۔؟"

ہاں عطّی۔۔ میری زندگی موت کا فیصلہ تھا۔۔ میں اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کی اس آخری خوشی کا گلا گھونٹنا نہیں چاہتا تھا۔۔ گستاخی کی جرأت مجھ میں نہیں۔۔۔ میں ہمیشہ کے لئے یہ در چھوڑنا چاہتا تھا جس کے دروازے مجھ پر خود بند کر دیئے گئے تھے۔

"امّی تو کچھ اور کہتی تھیں۔!"

"وہ کیا۔؟"

"وہ کہہ رہی تھیں۔۔۔ کہ وصیت نامے کا انتظام لکھوا کر یہ گھر سے نکل گیا۔ شاید اسے یہ چیز بری لگی ہو۔۔۔"

"عطی" اتنا بڑا الزام دے کر میرا ایمان نہ چھینو۔ میں نے تمہیں زندگی کی ہر شے میں بڑھ کر چاہا۔۔۔ میرا ہر سانس تمہارا نام لے کر نکلتا رہا۔۔۔۔ یہ سانس تمہاری سانسوں میں شریک ہو کر تمہیں عمر دراز۔۔۔ اور حیات کی خوشیاں بخش دے۔۔۔۔ تو میں۔۔۔ سمجھوں گا۔۔۔ کہ مجھے عمر بھر کی ریاضت کا اجر مل گیا۔!"

"تو کیا امّی حضور نے جھوٹ کہا؟"

"نہیں عطی وہ بزرگ ہیں۔۔۔۔۔ میں اتنا بڑا الزام نہیں دھر سکتا۔۔ نہ اتنی بڑی گستاخی کر سکتا ہوں۔۔۔ مجھ سے جو بڑی غلطی سرزد ہوئی۔ گھر سے نکلنے کی۔۔۔ میں نے صفائی قلب سے اس کی کردی۔۔۔!"

"تم نے اس کا ذکر مجھ سے کیوں نہیں کیا۔؟"

"خبر اتنی جانکاہ تھی کہ میں سنبھل نہ سکا۔"

"جس روز تم یہاں آئے۔۔ کیا پھر اس مسئلے پر کوئی بات کسی نے کی۔؟"

"تم بتلاؤ۔۔۔ کیا تم سے کسی نے کچھ کہا؟"

اور عاطفہ نے جھلملاتی آنکھوں اور لرزیدہ آواز سے ساری رام کہانی کہہ سنائی کہ کس طرح امّی نے یہ خبر سنا کر اس پر بجلی گرائی۔۔۔ ان کا کہنا کہ تمہارے آبو زبان

دیے چکے ہیں ۔۔۔ اور شہاب کی اپنی رضامندی سے یہ سب کچھ طے پایا ۔ جب
مہر کار رواں ہی لٹیرا بن گیا ۔۔ تو میں کس سے جھگڑتی ۔۔۔ قسمت کو کوستی
رہی ۔۔ دل و دماغ میں آگ لگی ہوئی تھی ۔۔۔ میرا خیال تھا ۔۔۔ پہلے تم سے
بات لوں پھر اپنی قسمت پر آخری مہر لگانے کی اجازت دیتی ۔

"عطی امید کے سارے دیئے بجھ چکے ہیں ۔ ہر طرف گھنگھور اندھیرا چھایا
ہوا ہے ۔ نہ کوئی جگنو ۔۔ نہ کوئی دیپک ۔۔۔۔ خاموشی سے خود کو حالات
کے سپرد کر دو ۔ شہاب اتنا کہہ کر اداسیوں کے گہرے سمندر میں ڈوب گیا ۔

"شابی صاف کہہ دو ۔۔ کہ تمہارا دل مجھ سے بھر چکا ہے ۔" عاطقہ کے
ہونٹ تھرتھرانے لگے ۔۔ اور آنسو کی حدود میں رک کر رہ گئے ۔

"والدین کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں عطی ۔۔۔ تمہارا ۔۔۔ یا میرا ٹکرانا
صرف سر پھوڑنے کے مترادف ہوگا ۔"

"شابی میں اپنے راستے کی ہر چٹان سے ٹکرانے کی طاقت رکھتی ہوں ۔"

"والدین کی محبت کے سامنے ہر چٹان ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے ۔"

"اپنی محبت کے سامنے شوریدہ سر سمندر ۔۔۔ وسیع فصلیں ۔۔۔ اونچے
پہاڑ تنکے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے ۔!"

"بغاوت پر مت اترو ۔۔۔ یہ زندگی کے فیصلے ہوتے ہیں ۔۔ ٹھنڈے
دل سے سوچے جاتے ہیں ۔"

"شابی میں اپنی زندگی کو جہنم بننے سے پہلے سبھوں کی زندگی جہنم بنا دوں
عاطقہ

گی۔ میری خوشیاں لوٹنے والے اتنی آسانی سے میرے ارمانوں کا خون نہیں کر سکتے اگر تم نے میرا ساتھ چھوڑا۔۔ یا تم نے مجھ سے دھوکہ کیا۔۔ تو سب سے پہلی گولی تمہارے سینے میں اتاروں گی۔!" آواز نے ساتھ چھوڑا۔۔۔ اور آنسو ٹوٹتے ستاروں کی طرح اس کے مقدس گریبان پر گرنے لگے۔

"عطی کاش۔۔۔۔۔ تم مجھ پر یہ احسان کر دو۔۔۔۔ میں تو اس زندگی کے بوجھ کو اب سہار نہیں سکتا۔ کاش اس جان لیوا عذاب سے مجھے چھٹکارا دلا دو تو میں تمہارا روزِ قیامت تک ممنونِ احسان رہوں گا۔؟"

عاطقہ سسکیاں لے لے کر روتی رہی۔۔۔۔۔ شہاب پتھر بنا۔۔ خلاؤں میں گھورتا رہا۔۔۔۔ کہ اچانک فضا میں ایک آواز گونجی۔۔۔

"گھر چلو۔۔۔!"

"میرا کوئی گھر نہیں۔ میرا کوئی در نہیں۔"

"مجھے تنہائیوں کے ناگوں کے سپرد کر کے تم سکھ سے بیٹھ سکو گے۔؟"

"رضوان پھوپھا چلے گئے ہیں۔"

"جی میرے گلزار میں آگ لگا کر چلے گئے۔"

"ہوش میں آؤ عطی۔!"

"ہوش چھین کر کہتے ہو۔۔۔ ہوش میں آؤ۔۔۔۔۔!" عاطقہ نے کٹتے لہجے میں کہا۔

"چلو اٹھو گھر چلیں۔" شہاب نے اس کا کانپتا ہوا ہاتھ تھاما۔

"میرا کوئی گھر نہیں۔ میں خود بے در ہوں۔۔"!

"ایسی باتیں مت سوچو عطی۔ تمہارے دم سے تو اس کائنات میں رنگ و بو ہے۔ تم نہیں تو کچھ بھی نہیں۔"!

عاطقہ اٹھنے لگی۔۔۔ تو شہاب نے آہستہ سے کہا۔

"منہ دھو لو۔۔۔ صاف روئی ہوئی نظر آتی ہو۔۔۔"!

عاطقہ نے متورم نگاہوں سے شہاب کو دیکھا۔۔۔ اور اس کی دنیا لٹنے لگی۔۔۔ وہ جلدی سے باہر نکل آیا۔۔۔ روٹی روٹی سی یہ معصوم لڑکی بہت پیاری نظر آ رہی تھی۔۔۔ رخساروں کا رنگ آتشیں ہو چکا تھا۔ چہرے پر بارش کے بعد آسمان کی شفاف نیلاہٹوں کا سا نکھار آ گیا تھا۔۔۔ بھیگی بھیگی پلکیں قتل کا سامان مہیا کر رہی تھیں۔ وہ اس کے پیچھے سر جھکائے چلی آ رہی تھی

"اپنا ڈاک بنگلہ نہیں دیکھو گی؟"

"نہیں"۔ ایک دم سپاٹ سا جواب ملا

اور پھر دونوں جانب مکمل خاموشی۔۔۔ مزدوروں نے مالک کو دیکھا تو اور گرمجوشی سے کام شروع کر دیا۔۔۔ کچھ بیٹھے ہوئے تھے۔۔۔ گھبراہٹ سے کھڑے ہو گئے۔۔۔ بسست قدم تیز اٹھنے لگے۔۔۔ عاطقہ کبھی کبھار اپنی بوجھل پلکیں اٹھا کر دیکھ لیتی۔۔۔ کہ اچانک اسے تین شوخ سی لڑکیاں بھی کام کرتی نظر آئیں۔۔۔ جو اپنی زبان میں کوئی گیت گنگنا رہی تھیں

"دل بہلانے کے کافی سامان مہیّا کر رکھے ہیں۔۔"!

عاطقہ

"جی" شہاب نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جب ہی تو گھر آنے کو دل نہیں چاہتا۔۔؟"

"نہیں عاطفہ ایسی کوئی بات نہیں ۔۔" ابھی وہ اتنا کہنے ہی پایا تھا کہ نیوں پرجوش قدموں سے ان کے قریب آگئیں۔۔۔ ہلکے سے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا۔ شیریں نے بڑے مخلص لہجے میں عاطفہ کا حال پوچھا۔

"ٹھیک ہوں" اس نے قدرے بے دلی سے کہا۔

دوسری دو لڑکیوں نے شیریں سے سرگوشی کرتے ہوئے پوچھا

"یہ خان کی بیوی ہے۔۔؟"

"سیش" شیریں نے مسکرا کر اسے ڈانٹا۔۔ اور منہ پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کو کہا۔۔۔ عاطفہ کے چہرے پر تھوڑی سی مسکراہٹ ابھری اور اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔۔۔ شہاب نے دزدیدہ نگاہوں سے عاطفہ کی طرف دیکھا اور ایک سرد دل فگار سی آہ نکل پڑی۔۔

"یہ آپ کو تنگ تو نہیں کرتے۔؟" عاطفہ نے شہاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں یہ تو بہت اچھے ہیں۔۔۔" بے ساختہ شیریں کے منہ سے نکل پڑا۔

"تم کہتی ہو نا۔۔ کبھی کالیں چلے تو مجھے تھری ناٹ تھری کی گولی کا نشانہ بنا دے۔" شہاب نے لائٹر سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"وہ کون ایسا بدبخت ہے۔ ۔ مجھے بتلائیے میں اس کا خون پی جاؤں"۔
شیریں نے جوش سے کہا ۔ ۔ ۔ اور عاطفہ کا رنگ اڑ گیا ۔ ۔ چہرہ بالکل دھلے ہوئے لٹھے کی طرح نظر آرہا تھا ۔ ۔ ۔ اس نے جلدی سے بات ٹالتے ہوئے کہا۔
"شابی گھر چلو ۔ ۔ ۔ امّی منتظر ہوں گی ۔ !" اتنا کہہ کر بغیر جواب کا انتظار کئے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی کار میں جا کر بیٹھ گئیں۔
"کب آؤ گے خان ۔ ۔ ؟"
"بہت جلد ۔ !" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا
اس نے کار اسٹارٹ کر دی ۔ ۔ ۔ ۔ عاطفہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی ۔ ۔ ۔ ڈاک بنگلے کی حدود سے نکل کر اسنے کار کھڑی کر دی ۔ ۔ ۔ ۔ اور پچھلا دروازہ کھول کر آہستہ سے کہا۔
"عطی آگے آجاؤ ۔"
"ٹھیک ہوں ۔ !"
"آجاؤ ۔ !"
اور وہ خاموشی سے اس کے پاس آکر بیٹھ گئی ۔ شہاب نے اس کے افسردہ چہرے پر نگاہ دوڑائی ۔ ۔ ۔ تو وہاں رنج والم کی تصویر پائی ۔ اس کا دل ایک دم ہمدردی سے لبریز ہو گیا ۔ اس نے آہستہ سے کہا۔
"عطی سگریٹ تو سلگا دو ۔"
"لائیٹر کہاں ہے ؟"

"جیب میں۔"

"اور ڈبیہ۔"

"وہ بھی جیب میں۔"

عاطفہ نے خموشی سے دونوں چیزیں نکالیں۔۔ لرزتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگایا۔ ایک ننھا سا شعلہ کانپا۔۔ شہاب نے بڑے دکھ سے سوچا۔

"بالکل ہماری محبت کا شعلہ بھی اسی طرح لرزاں ہے۔ جسے کسی وقت بھی بادِ صرصر کا تند جھونکا بجھا سکتا ہے۔۔"

"لیجئے!"

اور شہاب نے ہاتھ بڑھا کر اپنی انگلیوں میں سگریٹ دبایا۔۔ اور گہری سوچ میں ڈوب کر منہمک انداز میں سگریٹ پینے لگا۔۔ عاطفہ اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔۔۔ جلتی ہوئی سگریٹ کا ٹکڑا اس کی انگلیوں کی پوروں تک پہنچ کر اسے تپش پہنچا رہا تھا۔۔ مگر وہ دل کی لگی آگ کی تپش کے سامنے سگریٹ کی تپش محسوس نہ کر سکا۔۔۔ عاطفہ کا دل جل اٹھا۔۔ اس نے جلدی سے وہ ٹکڑا اس کی انگلیوں سے نکالا۔۔ اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

شہاب نے سلگتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"انگلی جل رہی تھی۔!" عاطفہ نے تڑپتے ہوئے انداز میں کہا۔

"عطی یہاں تو پورا وجود جل رہا ہے۔۔ میری روح سلگ رہی ہے یہ ذرا سا پورہ جل جائے گا تو کیا قیامت آجائے گی۔!"

عظمیٰ کی پلکیں سہم کر آنسوؤں کو چھپانے کے لیئے جھک گئیں۔ پریشاں آرزوؤں کے ہر لفظ نے بارود کا کام کیا۔۔۔ اس کا رواں رواں جل رہا تھا مگر وہ کیا کہتی۔۔

آصف ولا کی شان۔ اور باوقار کوٹھی نظر کے سامنے تھی۔۔۔۔ دیکھنے والے مکینوں کو خوش قسمت کا لقب دیا کرتے ہیں۔۔۔ مگر کسی کو کیا معلوم۔۔ کہ اس اونچی حویلی کی اونچی اونچی دیواریں کسی زندان سے کم نہیں وہاں انسانوں پر پہرے بٹھائے جاتے ہیں تو یہاں دلوں پر۔۔۔ وہاں انسانوں پر پہرے بٹھائے جاتے ہیں — تو یہاں دلوں پر — وہاں انسانوں پر ظلم و ستم توڑے جاتے ہیں۔ تو یہاں خانہ کعبہ پر۔۔۔ وہاں انسان آزادی کیلئے زندان کے قانون توڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔۔۔ اور یہاں رسم و رواج — خاندان کی عزت — اور منہ کے بولوں پر — اپنی زندگی بھر کی ریاضت مٹا کر رکھ دیا ہے

کار ایک جھٹکے کے ساتھ سیلٹی بجری پر سے چرچراتی ہوئی برآمدے کے سامنے آکر رکی — شہاب نے گوشۂ چشم سے عاطفہ کی طرف دیکھا۔۔۔ جو خزاں کے پتوں کی طرح کانپ رہی تھی۔ شاید اپنے آنسوؤں کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی —!! کار کے رکتے ہی۔۔۔ وہ بھاگتے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی — اس کا یہ سوگوار انداز۔ شہاب کی دنیا میں ایک تہلکہ مچا گیا۔۔۔

شام سے موسم کے تیور بگڑے ہوئے تھے ہوائیں کسی برہن کی طرح خاک اڑاتی چل رہی تھیں . . . . . اونچی اونچی پہاڑیوں پر سے بادلوں کا اٹھنا ایک دلفریب منظر پیش کر رہا تھا۔ بادل گرجتے رہے . . . ہوائیں بین کرتی رہیں شاید یہ بھی ان دو بدنصیبوں کی قسمتوں کی بربادی پر گریہ بے پناہ کر رہی تھیں۔ آسمان کو زمین کے پیاسے لبوں پر بے پناہ ترس آیا . . اور وہ اپنے سینے سے پیمانے بھر بھر کر پیاسے لبوں کی تشنگی مٹانے لگے . . . سیاہ گھٹائیں ساقی کا کردار نبھانے لگیں۔

شہاب کرسی پر ٹانگیں پھیلائے . . . آنکھیں بند کئے سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا بے طرح سگریٹ پینے سے حلق میں جلن سی ہونے لگی انگلیوں کے پوروں میں بھی سوزش ہونے لگی . . . وہ زخمی ذہن لئے . . . اس

گھمبیر سی اداسی کا پیچھا کر رہے تھے جس نے ان کی روح کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔۔۔ بھیگی بھیگی ہواؤں نے یکبارگی دریچے کے پٹ کھول دیئے۔۔۔ ننھے ننھے بارش کے قطرے اس پیاسی روح کو بھی سیراب کرنے لگے۔۔۔

شہاب نے جلتے ہوئے احساس کے ساتھ اٹھ کر دریچہ بند کیا۔۔ تو سامنے عاطفہ کے کمرے کی بجلی بھی جل رہی تھی۔۔ ایک دم شہاب کی نظریں اپنی کلائی کی طرف اٹھ گئیں۔۔۔ ساڑھے بارہ۔۔۔ اف میرے خدایا اتنی رات گئے تک وہ جاگ رہی ہے؟ ہم دونوں ایک ہی تیر کے گھائل۔۔۔ ایک ہی بے قراری کے شکار۔۔۔ ایک ہی لاینحل مسئلے کو حل کرنے کے لئے سرگرداں۔۔۔ دریچہ بند کر کے بوجھل قدموں سے شہاب کچھ دیر کھڑے سوچتے رہے۔۔ پھر آہستہ آہستہ قدموں سے اس کے کمرے کی طرف چل پڑے۔۔۔۔ دروازے پر پہنچ کر وہ ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔۔۔ اندر سے کسی کی باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہواؤں کی وجہ سے دروازہ قدرے کھلا ہوا تھا۔۔ آواز پہچاننے میں دیر نہ لگی۔۔۔ کہ وہ امّی۔۔۔ اور عاطفہ ہیں۔۔۔ عاطفہ کی سسکیوں کی آواز۔۔۔ اس بھیگی بھیگی فضا کو اور بھی سوگوار کر رہی تھی۔

"امّی حضور۔۔۔! یہ پوری زندگی کا سودا ہے۔۔۔۔ جس پر میں داؤ نہیں لگانا چاہتی۔"

"ماں باپ دیکھ بھال کر اپنی اولاد کا مستقبل سنوارتے ہیں۔"

"ماں باپ اولاد کی خوشیوں کو بھی بخوبی جانتے ہیں۔"

عاطفہ

"عاطفہ جو کچھ تم چاہتی ہو... وہ روزِ قیامت تک نہ ہوگا۔"

"امّی حضور... مگر کیوں... شہاب میں کس بات کی کمی ہے؟"

"وہ ہمارے معیار کا نہیں۔"

"آپ کے معیار کا پیمانہ کس چیز سے ناپا جاتا ہے۔؟ کیا وہ خوبصورت نہیں۔؟... کیا وہ جوان نہیں؟ کیا وہ شریف نہیں؟.. کیا وہ تعلیم یافتہ نہیں؟... کیا وہ..!"

"عاطفہ زبان سنبھال کر بات کرو......... تمہارے سامنے تمہاری امّی بیٹھی ہیں......!" فرحت کا لہجہ ایک دم خوفناک ہوگیا

"میرے سامنے میری وہ امّی بیٹھی ہیں... جو میری ذرا سی تکلیف پر تڑپ جایا کرتی تھیں... میری ذرا سی پھانس چبھنے پر اس طرح بے چین ہوجایا کرتی تھیں... جیسے یہ پھانس میرے جسم میں نہیں۔ ان کی روح میں چبھی ہے۔ اور اب یہ وہی امّی ہیں۔ جنہیں میرے بے دریغ بہتے آنسوؤں کی قیمت کا کوئی احساس ہی نہیں...!" اور وہ بلک بلک کر رو دی۔

"عطی ماں تو تمہارے لئے در در کی خاک بھی چھان سکتی ہے۔ ممتا بڑی ظالم ہوتی ہے... اس معاملے میں میرے ہاتھ پاؤں تمہارے ابّو مرحوم کاٹ گئے ہیں... بچپن سے تمہیں تمہاری پھوپھی نے مانگ لیا تھا۔ میری شدید ناراضگی کی بھی انہوں نے کوئی پرواہ نہ کی... اور تمہاری پھوپھی کو زبان دے دی۔ پچھلی گرمیاں جب ہم ان کے گھر گئے تو تمہارے ابّو شادی

کی تاریخ خود مقرر کر آئے ۔۔۔ اگر وہ زندہ ہوتے ۔۔۔ تو تم آج اپنے گھر بیٹھی ہوئی ہوتیں ۔!"

"امی میرے ابو اتنے سنگدل نہیں تھے ۔!"

"تو کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ۔؟"

"کامران میں کون سے ایسے سرخاب کے پر لگے ہوئے تھے جو ان کی نگاہ میں شہاب ط چچا

"شہاب کی ساری خوبیاں ۔۔۔ اس کے تاریک ماضی نے نگل لی ہیں ۔!"

"وہ کیسے ۔۔۔؟ اس کا ماضی کیوں تاریک ہے ۔؟" عاطقہ بھی بحث پر اتر آئی ۔۔۔ شہاب اپنا ذکر سنتے ہی پوری توجہ سے اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے منتظر تھے ۔

تم ویسے بھولی بن رہی ہو ۔۔۔ مت بھولو ۔۔ کہ ہم نے شہاب کو بھیک منگوں کے ایک گروہ سے دس ہزار روپے میں خریدا تھا ۔۔ دس ہزار میں ۔۔۔۔!"

سرگوشیوں کے اس بم نے شہاب کے پورے جسم کو تھرا کے رکھ دیا ۔ جسم بے جان ہونے لگا ۔۔ دماغ میں ہلچل مچ گئی ۔۔۔ اور دل بے جان نقارے کی طرح بجنے لگا ۔ اگر دروازے کو زور سے نہ تھام لیتے ۔ تو شاید اپنی پوری طاقت سے ذہن پر گر چکے تھے ۔۔۔ ہتھوڑوں کی طرح یہ الفاظ اس کی قوت سماعت سے ٹکرا رہے تھے ۔

"بھیک منگوں کا گروپ...... دس ہزار... بھیک منگوں کا گروپ...... دس ہزار...!"

"امی اس میں ان کا کیا قصور......!"

"کیا اب بھی تمہیں انکار ہے کہ وہ نجیب الطرفین نہیں...!"

"امی یہ ذات پات... یہ فرقہ بندیاں... یہ طبقاتی کشمکش.... سب سرمایہ داروں کی پیدا کردہ ہیں..... ایک غریب کا تمسخر اڑانے کے لئے اس کے چیتھڑوں پر مخمل لپیٹ دیا گیا ..... جب غریب کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں تو اس کی کھلی آنکھوں میں نفرت و حقارت کی سنگین چبھاتے ہوئے اس کے احساس کو جلایا جاتا ہے.. کہ مخمل کی نرماہٹ یا قیمتی پن کے نیچے..... اس کھردرے میلے.... اور پھٹے ہوئے بوسیدہ لباس کو دیکھو... جو تمہارا مقدر ہے۔" امی مجھے اتنا بتلائیے.... کہ اگر انہیں حقیر ہی سمجھنا تھا... تو کیوں ان کی جھونپڑی کی آزادی ان سے چھینی.. اور محلوں کی تنگ نظری کی قید میں انہیں گرفتار کیا... اگر انہیں نظروں سے گرانا تھا... تو کیوں اتنی بلندی پر انہیں پہنچایا... امی حضور.. بلندی سے گرا ہوا انسان پھر بھی اٹھ سکتا ہے۔ مگر نظروں سے گرا ہوا انسان اپنی حقارت و نفرت کی ذلتوں کو لئے ہوئے کبھی بھی کھڑا نہیں ہو سکتا......"

"عاطقہ مجھ سے الجھنے کی کوشش بے سود ہے... میں اپنی لاکھوں کی کمائی ہوئی دولت کسی بھیک منگے کے پھٹے ہوئے گریبان میں ڈالنا نہیں چاہتی!"

عاطقہ

"امّی حضور... امّی حضور... صاف صاف کہہ دیجئے کہ آج انسان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ جس کے پاس پلکوں کی روپہلی جھنکار ہو... کوٹھی ہو... امپالا کاریں ہوں... غریبوں کے خون سے چوسی ہوئی یہ دولت... غریبوں ہی کے لئے نفرت و حقارت کے سانپ بچھو بنا کر ان کے سینوں میں اتار سے جاتے ہیں۔"

شہاب کے سینے میں سنگین اتر گئیں... آج سے پہلے وہ فرحت کی نفرت کو خوب جانتا تھا مگر نفرت میں اتنی شدت ہوگی اس کا اسے احساس نہ تھا... اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر فرحت امی سے پوچھے کہ صرف اس کا... صرف اس کا قصور بتلا دیجئے... اس کے بعد ایسا دھکا دیجئے... کہ وہ اٹھ نہ سکے... اور اس طرح آپ کی نفرت کی آگ بجھ جائے گی۔"..

"عاطقہ میں تم سے لیکچر سننے نہیں آئی... یہ میرا فیصلہ بعد میں ہوگا... حکم... اور آخری فیصلہ تمہارے مرحوم ابّو کا ہے۔ چاہو تو ان کی روح میں نشتر چبھو دو... اور چاہو تو انہیں سکون دے دو۔" اتنا کہہ کر وہ غصے سے اٹھیں... شہاب تڑپ کر ستون کے پیچھے چھپ گیا.. وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں.....

عاطقہ کی دلخراش سسکیوں کی آوازیں ہوا کے دوش پر بین کرتی ہوئی سنائی دے رہی تھیں... شہاب کا دماغ سنسنا رہا تھا... جی تو چاہتا

تھا کہ ان سرمایہ داروں کو وہ کھری کھری سنائے... کہ ان کی بھی راتوں کی نیندیں حرام ہو جائیں... پھر سوچا کہ شاید یہ جرأت کبھی پیدا نہ ہو سکے... عاطفہ تو ویسے ہی ظلم کی چکی میں پس رہی ہے... اور اسے کیا پسنا... تھکے ہارے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور لپک کر اپنے بستر پر اوندھا گر کے سسکنے لگا......

ابّو میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا... گندی اینٹیں نالی میں چنی جائیں یا پینٹ کر کے محل یا کوٹھی میں لگائی جائیں... اینٹ کی اصلیت وہی رہے گی... آپ نے مجھے میرے گندے ماحول میں ہی رہنے دیا ہوتا۔ ابّو جانی... آپ کی ہمدردی مجھے اتنی مہنگی پڑی... کہ عمر بھر کی ریاضت بھی خاک میں مل گئی... ہر تمنا، ہر آرزو، ہر حسرت اس ہمدردی کی بھینٹ چڑھادی... مگر مجھ سے یہ دنیا والوں کے تلخ طعنے نہیں سنے جا سکتے۔

ابّو جانی آپ نے مجھ پر بہت بڑا ظلم کیا... بہت بڑا ظلم... اتنا مضبوط حوصلہ رکھنے والا انسان... اپنی حقیقت جان کر ایک کمزور بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ اسے تو پھر ممتا کا پیار ڈھارس بندھا کر اس کی کمزوری کو چھپا دیتا ہے یہاں تو کوئی ایسا مخلص بھی نہیں تھا جو اس کی بے حقیقت زندگی پر پردہ ڈالتا... اور اسے جینے کی ڈھارس بندھاتا... ساری رات کروٹیں بدلتے سگریٹ پھونکتے گذر گئی... امّی اور عاطفہ کو اس کسمپرسی کے عالم میں جبکہ انہیں ایک سہارے کی ضرورت ہے۔ تنہا چھوڑنا خود غرضی ہوگی

عاطفہ

جتنی جلدی ہو سکے عاطفہ کی شادی ہو جائے.. تاکہ کامران کے آتے ہی.... وہ اس گھر کو چھوڑ سکے.... اس کا ضمیر تو کم از کم اسے کچوکے نہیں دے گا۔ رات بھر کی ذہنی کوفت.... اور دلی خلش کو لئے وہ اس نتیجے پر پہنچا..... کہ عاطفہ کی شادی کو ایک فرض سمجھ کر نبھائے گا... تاکہ دنیا والے ہمیشہ کی طرح آصف ولا کو ایک گہوارہ سکون سمجھیں.... کوئی ایسی بات نہ اٹھے.... کہ اس کو بھی اور اس کے مکین بدنام ہو جائیں... شہاب نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ ہر صورت عاطفہ کی نفرت مول لے گا... خواہ اس بہروپ میں اس کا ضمیر کتنا ہی تڑپے... اس کی روح کتنی ہی بے قرار ہو..... وہ تقدیر کا پانسہ الٹ کر دکھائے گا.... اور یہ بھیک منگا دنیا پر کر دے گا.... کہ انسان فطرتاً بُرا نہیں ہوتا اسے جیسا ماحول بخشا جائے وہ اس کے سانچے میں ڈھل کر اپنی شخصیت کو ظاہر کرتا ہے ساری رات کرب و بے چینی میں کروٹیں لیتے گذر گئی... جس بری طرح روح گھائل ہوئی اس کا احساس صرف شہاب کو ہی ہو سکتا تھا۔ سورج اپنی پوری چھب دکھاتا ہوا مشرق کے دریچوں سے اپنی سنہری رتھ پر نکلا... اور ساری دنیا کو اپنی سنہری کرنوں سے منوّر کر دیا... سورج کی روشنی بھی شہاب کو بری لگی... وہ آہستہ سے بڑبڑانے لگا.. کاش رات کی سیاہی میرے مقدر کی طرح اس جہان کو اپنے دامن میں سمیٹتی رہتی... اے رات! تیرے نصیب میں پھر امید سحر تو ہے تیری سیاہ چادر کو چاک کر کے سپیدہ سحر سے پرنور چادر تجھے پہنا دی گئی ہے۔ مگر میرے مقدّر میں چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی ہے... اب کبھی بھی شمع امید

جگمگا نہ سکے گی۔۔۔۔ جب تک تاریکی میں رہا۔۔۔ ٹامک ٹوئیے مارتا رہا۔۔۔ اپنی اوقات بھول کر۔۔۔۔۔ اس کوٹھی کے مکینوں کی ہمسری کرتا رہا لیکن اپنے کانوں سے سن کر مجھے اپنی اوقات کا بھرپور احساس ہُوا۔۔۔۔ کہ مخمل کے لباس میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگ سکتا۔۔۔ یہ اس کی بھول تھی۔۔۔ جو آج تک اس ماحول میں رہ کر اسے بیگانگی اور دلی کھوٹ میں رکھے رہی۔

مگر جب انسان اپنے کانوں سے سب کچھ سن لے۔۔۔۔۔ تو پھر کیا رہ جاتا ہے۔۔۔۔!!"

آہستہ سے دروازہ کھلنے کی آواز سے وہ چونکا۔۔۔۔۔۔ فضلو بابا جھانک رہے تھے۔۔۔۔

"باباجی کیا بات ہے؟"

"چھوٹے سرکار ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔"

دل میں شہاب کے آیا کہ۔۔۔ صاف انکار کر دے۔۔۔۔۔۔ ساتھ بٹھا کر ناشتہ کروانے سے کیا ان کی امارت اور شان و شوکت کو دھکا نہیں پہنچتا غریب کو مسلسل ذلیل کرنا۔۔۔ امیروں کا شیوہ بن چکا ہے۔

"کس سوچ میں پڑ گئے سرکار؟"

شہاب نے ایکدم چونکتے ہوئے کہا۔۔ "بابا تم چلو میں بس ایک دو منٹ میں پہنچا۔۔۔۔؟"

"بہتر سرکار" کہہ کر بابا فضلو اپنے موٹے بوٹوں کے ساتھ ٹھپ ٹھپ کرتے

ہوئے چلے گئے۔

باحوصلہ دل نے سہارا دیا۔۔۔روشن ضمیر نے راہ دکھائی اور چمکتے روشن ذہن نے منزل پر پہنچا دیا۔۔۔کہ ایسے انسانوں کو اپنے زخم نہ دکھانا۔۔۔۔۔۔ جو ہمدردی کا پھایہ رکھنے کی بجائے نشتر سے اسے اور گہرا کردیں گے۔۔۔زخمِ دل چھپا کر مسکراؤ۔۔۔تاکہ زخم دینے والے خود شش و پنج اور ورطۂ حیرت میں ڈوبے رہیں کہ ہم جسے بے موت مارنا چاہتے تھے۔۔۔وہ تو پنجۂ اجل کی دست بُرد سے بہت دور ہے۔۔۔

شہاب نے جلدی جلدی منہ ہاتھ دھویا۔۔۔کپڑے تبدیل کئے۔۔ آنکھیں دل کا خون لئے سرخ ہو رہی تھیں۔۔۔شہاب نے اپنا سراپا آئینے میں دیکھا۔۔۔ظاہری بشاشت کے پیچھے شکست کی مار صاف دکھائی دے رہی تھی وہ ہولے ہولے قدموں سے ڈائننگ روم کی طرف چلا۔۔۔پردہ سرکایا۔۔۔تو صرف امی کو بیٹھا دیکھا۔۔۔اس کا دل دھک سے رہ گیا۔۔۔جسے تڑپانے کے لئے اس نے یہ بہروپ بدلا تھا۔۔۔وہی سامنے نہیں۔ یہ بہروپیا پن خود اسے ڈسنے لگا۔۔۔

"شہاب تم نے بڑی دیر کردی۔۔ چائے کب کی ٹھنڈی ہو چکی ہے۔"

"امی ایسی گہری۔۔۔اور میٹھی نیند آئی کہ۔۔۔کافی دن چڑھے کا پتہ نہ چل سکا۔"

شہاب نے خوش باش لہجے میں کہا۔۔۔اور ایک ہلکے سے قہقہے کے

ساتھ ٹوسٹ کی پلیٹ اپنے سامنے کھسکا لی

"دوبارہ چائے بنوائی ہے .. . تم جب تک یہ آملیٹ لو۔"

فرحت کے لہجے میں صاف افسردگی نمایاں تھی۔

"امی عاطفہ کہاں ہے۔ ؟" شہاب نے چوٹ کرتے ہوئے کہا

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !" ممتا کی آواز درد میں ڈوب گئی

"امی ... یہ لڑکیاں بڑی نخریلو ہوتی ہیں ... . ذرا سی بھی پھانس چبھ جائے تو رو رو کر اپنی جان ہلکان کر لیتی ہیں اور خواہ مخواہ دوسروں کی ہمدردی لینے کی ناکام کوشش کرتی ہیں۔ لڑکے بڑے شیر دل ہوتے ہیں امی ۔۔ اگر کوئی گولی سیدھی ان کے دل میں بھی اتر جائے نا ... تو وہ مسکرا مسکرا کر یہی کہیں گے ... معمولی سی چوٹ آئی ہے ۔ ؟" شہاب نے زہر سے بجھے ہوئے لہجے میں بڑے زور دار انداز میں کہا۔

آخری فقرے کو سن کر بیگم آصف مسکرا دیں۔

"بڑے شریر ہو ... عاطفہ سن پاتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو ایک جھگڑا کھڑا کر دیتی — !"

"اور میں جھگڑے میں ان کے دولہا میاں کا نام لے کر اسے پسپا کر دیتا اور وہ سر جھکا کر دانتوں تلے زبان کاٹتی رہ جاتیں۔" شہاب نے تیز اور تیکھی نظروں سے بیگم آصف کی طرف دیکھا۔ اور خود ٹوسٹ کی تہوں میں آملیٹ رکھ کر اسے کھانے لگا۔

"لڑکی نام کس کا ہے ۔ ۔ ۔ ؟" بیگم آصف نے دھیرے سے کہا

"امی اب کب ہمارے گھر میں جیجا جی تشریف لائیں گے ۔ ۔ ۔ ؟"

"میں خود اس فرض سے بہت جلد سبکدوش ہونا چاہتی ہوں ۔ مگر عاطقہ ۔ ۔" کچھ کہتے کہتے بیگم آصف خاموش ہو گئیں ۔

"امی بھلا لڑکی کب اس معاملے میں اپنی رائے دیتی ہے ۔ اس کی ایک بات نہ مانئے اور آج ہی فون پر پھوپھا صاحب کو مطلع کر دیجئے ۔ کہ تاریخ طے کر کے کوئی نیک گھڑی دیکھ کر اپنی امانت لے جائیے ۔ ۔ ۔ ۔" کہتے کہتے بہادر انسان کی زبان بھی لڑکھڑا کر رہ گئی ۔ ۔ ۔ دنیا کی ہر قسم کی شکست کا غم برداشت کیا جا سکتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ مگر دل کی شکست کچھ انوکھی شکست ہوتی ہے جسے ایک بہادر سے بہادر انسان بھی سہہ نہیں سکتا ۔ ۔ ۔ دل کے داغ مٹتے نہیں اور انسان سلگتا رہتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہ جان لیوا غم انسان کو بیگانہ ہواس کر دیتا ہے

"تم ایسے کرو ۔ ۔ ۔ کہ خود پھوپھا کے پاس جاؤ ۔ ۔ ۔ اور کوئی تاریخ لے آؤ ۔ ۔ ۔ ۔ !"

"امی میں جاؤں ۔ ۔ ۔ ؟" شہاب نے بے بسی سے کہا ۔ ۔ ۔ دل تڑپا کہ صاف کیوں نہیں کہہ دیتے ۔ ۔ ۔ کہ اپنے ارمانوں کا خون اپنے چہرے پر مل کر آجاؤ تاکہ دنیا والے تمہیں اچھی طرح سے دیکھ سکیں ۔

"یہاں انہیں بلوا نو لیوں ۔ ۔ ۔ ۔ مگر عاطقہ نے رو رو کر خود کو ہلکان کر رکھا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ویسے تمہارے جانے میں کوئی ہرج تو نہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

مسز آصف نے اپنی تیز آنکھیں اس پر گاڑتے ہوئے کہا۔

"امی لڑکے والوں کا تاریخ لینے آنا۔ ضروری ہے۔۔۔!" نامرادی سے شہاب نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"بیٹے یہ سب باتیں اپنوں میں ضروری نہیں۔۔۔ تمہارے ابا مرحوم تو خود تاریخ مقرر کر چکے تھے۔۔۔ بس میری قسمت خراب نہ ہوتی۔۔۔ تو آج مدت سے میں اپنے فرائض کو نبھا چکی ہوتی۔۔۔۔" مسز آصف نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔

"امی خدا آپ کی قسمت خراب نہ کرے۔۔۔ میں آج ہی تاریخ لینے چلا جاؤں گا۔"

چائے آ چکی تھی۔۔۔۔ دونوں نے بے دلی سے ناشتہ کیا۔۔۔ شہاب لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے کمرے میں آیا۔۔۔ اور چھوٹے سے بیگ میں اپنا مختصر سامان رکھنے لگا۔ کہ نازو پیغام لائی۔

"چھوٹے سرکار۔۔۔ آپ کو چھوٹی بی بی بلا رہی ہیں۔"

"مجھے۔؟"

"جی آپ کو۔"

"کہہ دو۔۔۔ مجھے فرصت نہیں میں کسی ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں واپسی پر ملوں گا۔۔۔!" شہاب نے سنگ دلی سے اپنے جذبات کی کرچیاں کر دیں۔۔"

"بہتر۔"

ابھی شہاب اپنی سگریٹ وغیرہ رکھ رہا تھا۔ ۔ ۔ کہ پھر نازو آئی۔

"سرکار۔ ۔ ۔ چھوٹی بی بی کہتی ہیں۔ ۔ ۔ کہ صرف ایک بار ایک منٹ کے لئے آ جائیے۔ ۔ ۔!"

چند ثانیے کے لئے شہاب اس التجا پر مبہوت ہو کر رہ گیا۔ ۔ ۔ دل پکارتا رہ گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جذبات میں شعلوں کی لپک پیدا ہو گئی۔ ۔ ۔ ذہن زخمی ناگ کی طرح تڑپنے لگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فوراً اپنا بیگ اٹھایا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور نازو سے کہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"انہیں کہہ دو کہ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ ۔ ۔!"

آواز اتنی تیز تھی۔ ۔ ۔ کہ عاطفہ اپنے کمرے کے دروازے سے لگی کھڑی صاف سن رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ وہ لمحہ بھر کے لئے سٹپٹا کر رہ گئی۔ اس نے دیکھا سلیٹی مائل سوٹ میں ملبوس انگلیوں میں سلگتا ہوا سگریٹ پکڑے وہ اسی راستے پر چلا آ رہا ہے۔ ۔ ۔ جب عاطفہ کے دروازے کے قریب پہنچا۔ ۔ ۔ تو شدت غم سے خود بخود اس کی پلکیں جھک گئیں۔ ۔ ۔ ۔ عمر بھر کی ریاضت کو خود دوسروں کی جھولی میں ڈالنے جا رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ یہ سوچ کر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ ۔ ۔ کہ اچانک عاطفہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اس کے سامنے آ گئی۔ ۔ ۔ شدت گریہ سے اس کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔ ۔ ۔ شہابی رخساروں پر آگ سی لگی ہوئی تھی۔ ۔ ناک سے ہلکی ہلکی سوں سوں کی آواز آ رہی تھی۔ ۔ بھیگے بھیگے کنوارے ہونٹ کپکپا

رہے تھے۔۔۔

"میں نے آپ کو کئی بار بلایا۔۔۔۔ کون سی خاص مجبوری نے آپ کے قدم روک لئے تھے؟"

لمحہ بھر کے لئے شہاب نے نظریں اٹھائیں۔۔۔ سفید کپڑوں میں ملبوس اسے وہ ایک دیوداسی سی نظر آئی۔۔۔ جو ساری رات عبادت میں گزار کر اپنے دیوتا کے روبرو۔۔۔ شکن آلود کپڑوں میں کھڑی تھی۔ اس کا صبر ڈگمگانے لگا دل کے ساحل پہ محبت کی شوریدہ لہریں ٹکرانے لگیں۔۔۔ دل چاہا۔۔۔ کہ سب ناراضگیوں کا جواب۔۔۔ اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر دے دے۔ مگر ہوش نے قدم تھام لئے۔۔۔ حالات نے سنبھالا دیا۔۔۔ آواز نے ساتھ دیا اور کھردرے لہجے میں بولا۔

"ہر مجبوری بتائی نہیں جا سکتی۔"

"مجھ سے بھی پردہ داری۔"

"مس آصف آپ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیئے۔۔۔۔ آپ کے اور میرے درمیان کبھی بے تکلفی نہیں رہی۔۔۔!!" ایک سپاٹ سا جواب دے کر اس نے عاطفہ کی آنکھیں حیرت سے کھول دیں۔۔ وہ اس کی مبہوت ہوتی ہوئی حالت سے فائدہ اٹھا کر بے دردی سے جا چکا تھا۔۔۔ عاطفہ نے خود کو سنبھالا اور بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں جا کر اوندھی گر گئی۔۔۔ اور تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔۔۔ ایک دل خراش جملہ اس کی قوت سماعت سے ٹکرا کر اس کی روح میں

زہر بھر رہا تھا۔۔۔ اس نے تکیے کے نیچے سے اس کی تصویر نکالی اور اس سے باتیں کرنے لگی۔۔۔۔ آپ کے اور میرے درمیان کبھی بے تکلفی نہیں رہی۔۔ یہی کہا تھا تم نے۔۔۔ شابی آؤ تمہیں میں بتلاؤں۔۔۔ وہ لمحات میں تمہیں یاد دلاؤں۔۔ جب تمہارے اور میرے درمیان بے تکلفی نہ تھی۔۔۔شابی جی۔۔۔۔ ان بھیگی بھیگی ہواؤں کا تصور تو کر لو۔۔۔ جب تم مجھے ڈرائیونگ سکھانے کے بہانے شہر سے دور گنگناتی فضاؤں میں لے جایا کرتے تھے۔۔۔۔ شابی اس خواب ناک رات کا تصور تو کر لو۔۔۔۔ جب تم نے میرے قدموں میں جھکے ہوئے تھے۔۔۔ تم شاید بھول گئے کہ تم نے کیا کہا تھا۔۔۔ مجھے تو آج بھی اس کا ایک ایک لفظ یاد ہے۔ ”عطی بدگمان نہ ہو جانا۔ میں نے اپنی روح کی تمام تر شدتوں کے ساتھ تمہیں چاہا ہے“۔۔۔ شابی کہہ دو کہ یہ جملہ تمہارے اور میرے درمیان تکلف کی کوئی دیوار کھڑی کرتا ہے۔۔۔شابی وہ چاند راتیں ہمارے پیار کی گواہ رہیں گی۔ جب تم اور میں پہروں اس کوثر و تسنیم کی لہروں میں ڈوبے رہتے۔۔۔ صبح کی بھیگی ہواؤں سے پوچھو۔۔۔ جب وہ ہمیں اس سہانے تصور سے آ کر گدگداتیں۔۔۔ تو تم اپنی مہکتی سانسوں کو میرے قریب لاتے ہوئے سرگوشی کرتے۔ ”عطی کاش یہ رات کبھی ختم نہ ہوتی۔ میں تمہاری قربت کے لطیف و پاکیزہ احساس کو پا کر تمہارے پہلو میں سکڑ سمٹ کر چلتی تو تم مجھے خوابیدہ سی نظروں سے دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے۔۔۔ شابی جی کہہ دو یہ سب جھوٹ ہے۔۔۔سب جھوٹ تمہارے اور میرے درمیان کبھی بے تکلفی نہیں رہی۔۔۔ عاطقہ نے تصویر کو روبرو کر کے دل کے زخم دکھانے شروع کر دیئے۔ شابی میرے چہرے پر ذرا سی پریشانی

یا غم کا سایہ دیکھتے ۔ ۔ ۔ تو تم اس طرح مضطرب و بے چین ہو جاتے ۔ جیسے تمہارا گھر ہی تو لٹ گیا ہو ۔ کہہ دو شابی کہ تمہارے اور میرے درمیان بے تکلفی کب تھی ۔ شابی جی ۔ ۔ ۔ میں تمہیں کون کون سا واقعہ یاد دلاؤں ۔ ۔ ۔ میں تمہیں بھیگی سانسوں سے لے کر تابناک اجالوں، خواب ناک اندھیروں ۔ ۔ گنگناتی بہاروں، دلفریب پھولوں کی مسکانوں ۔ ۔ ۔ لبستی ندیوں کے شوروں ۔ ۔ ۔ میں سب کچھ یاد دلا سکتی ہوں ۔ کہ تم صرف میرے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ اور صرف میرے ۔ ۔ ۔ یہ کہہ کر تصویر پر ستاروں کی مانند آنسو ٹوٹنے لگے ۔

بس اپنی پوری رفتار سے جا رہی تھی اور شہاب اپنے سلگتے خیالوں میں کھویا ہوا تھا ۔ ۔ ۔ اسے پتہ بھی نہ چلا ۔ ۔ ۔ کہ اس کی منزل مقصود آ گئی ہے ۔ کنڈیکٹر کے کہنے پر وہ چونکا ۔ ۔ ۔ چاند نگر کا خوب صورت شہر اپنے دامن میں ہزاروں دلکشیوں کو سمیٹے اپنی گہما گہمیوں میں مصروف تھا ۔ ۔ دل اداس ہو ۔ ۔ ۔ تو سارا جہان اداس نظر آتا ہے ۔ ۔ ۔ شہاب حد سے زیادہ افسردہ تھا ۔ ۔ ۔ گھر پہنچنے سے قبل وہ کسی نہ کسی طرح اپنی اداسی کو دور کرنا چاہتا تھا ۔ ۔ ۔ عاطقہ کے سسرال کا معاملہ ۔ ۔ پھر کامران سے مقابلہ ۔ ۔ ۔ تاریخ لینے کا معاملہ ۔ ۔ ۔ ۔ اور چہرے پر منوں زردی گھنڈی ہوئی آواز میں لڑکھڑاہٹ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاتھوں میں خواہ مخواہ رعشہ طاری اور دل ایک بے جان نقارے کی طرح بج رہا تھا ۔ ۔ ۔ شہاب نے اپنے پاک پروردگار کو پکارتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔ ۔

" آقائے دو جہان میری لاج رکھ لے ۔ مجھے صبر و حوصلہ بخش تاکہ آج اپنے

ہاتھوں سے اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ سکوں ۔۔۔۔

دوپہر ساری بے مقصد ادھر ادھر گھومتا رہا ۔۔۔ کچھ دل ٹھکانے آیا تو چہرے پر مصنوعی خوشی پیدا کر کے پھوپھا کے گھر پہنچا۔

اس کی آمد کی سب سے زیادہ خوشی انجم کو ہوئی ۔۔۔۔۔ کامران اپنے کام پر گیا ہوا تھا ۔۔۔ شہاب نے اس کی غیر موجودگی کو غنیمت سمجھا ۔۔۔ شام کی چائے پینے کے فوراً بعد ہی اس نے وہ اہم مسئلہ چھیڑ دیا جس کے لئے وہ آیا تھا۔ رضوان کہنے لگے۔

"بھابی سچ کہتی ہیں ۔۔۔ بیٹی ایک ہو یا چھ ۔۔۔ اس کا غم برابر ہوتا ہے والدین اپنی زندگی میں اس کے ہاتھ پیلے کر دینا چاہتے ہیں"

"ہاں پھوپھا دیکھئے نا بے چارے ابو جان یہ حسرت دل میں لئے چلے گئے۔ وہ زندہ ہوتے تو آج بھابی کیوں فکر مند ہوتیں" انجم نے بھی آہستگی سے کہا۔

اچھی خاصی تاریخ مقرر تھی ۔۔۔ مگر قدرت کے کھیل ۔۔۔ رضوان نے لائٹر سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"بس پھوپھا جان اب تو بہت قریب کی تاریخ دے دیجئے تاکہ یہ کام بخوبی ہو جائے ۔۔۔۔" شہاب نے اپنی بے قراری چھپاتے ہوئے کہا۔

انجم تم کوئی مناسب سی تاریخ بتلا دو؟

"اس ماہ کی پندرہ ٹھیک نہیں رہے گی ۔۔۔ اتوار کا دن بھی ہے

انجم نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہاری تیاری مکمل ہے۔ اتنا سوچ لو"

مکمل کی بھی مکمل۔۔ انجم نے ہنستے ہوئے کہا

اور آپ لوگوں کی۔۔۔؟ شہاب کی طرف منہ کر کے رضوان نے پوچھا

ہماری بھی مکمل ہے"

"تو بس ماہ حال کی پندرہ ٹھیک رہے گی"۔ رضوان نے آخری فیصلہ دیتے ہوئے کہا۔

اور مبارک سلامت کا شور پھر اٹھا۔۔۔ انجم نے کریم سے مٹھائی منگوائی اور سبھوں کا منہ میٹھا کروایا۔ شہاب نے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک ٹکڑا جبراً منہ میں رکھا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے منہ میں افیون گھول دی ہو۔

"بھئی اس خوشی میں ایک بار چائے پھر پلا دو ۔"! رضوان نے انجم سے کہا۔

"آپ کو تو سارا دن چائے کی خوشی رہتی ہے۔۔۔ لیجئے میں ابھی لائی"

وہ اپنی شال ٹھیک کر کے اٹھ کر چلی گئیں اور اسے لمحے کامران جو سرمئی رنگ کے سوٹ میں بہت شاندار لگ رہا تھا۔ شہاب کو دیکھ کر بے پرواہی سے اپنے کمرے میں جانے لگا کہ اچانک رضوان کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"کامران تمہارے بھائی آئے ہیں۔ ان سے ملو

جواباً کامران نے نہایت بیزاری سے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اور

شہاب نے بھی ایک سرد سرد سا کانپتا ہاتھ بڑھا دیا۔

"طبیعت تو خراب نہیں؟" کامران نے کٹتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں۔!" شہاب نے بھی سرد لہجے سے جواب دیا۔

"آج تمہاری شادی کی تاریخ لینے آئے ہیں۔" رضوان نے کہا

"ابو میں نے آپ سے کئی مرتبہ کہا ہے کہ میں نے شادی نہیں کرنی" کامران کا لہجہ سراسر گستاخی پر اتر آیا۔

"اب تو میں تمہاری تاریخ دے چکا ہوں۔"

"میں اس تاریخ کو گھر سے فرار ہو جاؤں گا۔"

"کامران۔!" رضوان اپنی پوری شدت سے چلائے

شہاب نے کانپتے ہاتھوں سے کامران کی پشت پر ہاتھ رکھا اور اس نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔

"مجھے آپ کی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔"

"مجھے اپنا مخلص سمجھو۔!"

"مخلص۔! جن کے دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ ہو۔ اب کیا تماشہ دنیا کو دکھانا چاہتے ہیں۔" کامران نے جلتے ہوئے انداز میں کہا۔

"کامران جلد بازی سے کام مت لو۔ غلط انداز سے مت سوچو..... زندگی بھر کا سودا ہے۔"

"آپ اپنی زندگی بھر کا سودا کیوں چکانے آئے ہیں؟"

"کامران الو کھڑے ہیں.. ہوش کی دوا کرو..." شہاب نے غصے کے ساتھ کہا۔

"مجھے ہوش آچکا ہے شہاب صاحب..!"

شہاب نے بے بسی سے ماحول پر اک نگاہ دوڑائی... عاطفہ کی عزت کا سوال تھا... کامران کے منہ سے نکلا ہوا ایک لفظ بھی... اس کی دنیا کو تاریک کرسکتا تھا۔ مصلحت کا تقاضا یہی سمجھا کہ خود باہر نکل جائے۔ تاکہ کامران کے دل کی بھڑکتی ہوئی آگ خود بخود بجھ سکے... شہاب جیسے ہی باہر نکلا۔ رضوان کامران سے الجھ گئے۔

شہاب کے قدم جیسے کسی نے تھام لئے... جیسے کسی نے اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا دیا۔

"الو مجھے ایسی عورت کی ضرورت نہیں... جو دل سے کسی کی پرستش کرے اور زبان سے کسی اور سے شادی کا اقرار کرے۔"

"تم کیا بکتے ہو؟" رضوان چیخے

"ابو میں سچ کہتا ہوں..!"

"تمہارا ذہن پراگندہ ہوچکا ہے... شہاب اور عاطفہ بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھے رہتے چلے آتے ہیں... انسیت اور خلوص کا ہو جانا لازمی امر ہے۔"

"ابو میں آپ کو کیسے بتلاؤں کہ یہاں انسیت نہیں محبت ہے۔ محبت

ہے۔" کامران کے لہجے میں صاف شکست خوردگی کے آثار پائے جانے لگے

"اگر یہ بات ہوتی ... تو شہاب کبھی بھی یہاں رشتہ کرنے پر رضامند نہ ہوتا۔"

"اب بھی وہ رضامند نہیں ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہے ؟"

"اس کے چہرے سے ؟"

"اس کا چہرہ پھول کی طرح شگفتہ اور فرشتوں کی طرح معصوم ہے۔" رضوان نے اس کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

"آپ نے اس کی آنکھوں میں اداسیوں کے جلتے ہوئے دیپ نہیں دیکھے"

"یہ اداسیاں ایک بہن کی جدائی کی بھی ہو سکتی ہیں۔"

"ناممکن !"

"کامران کاش تمہاری ایک ہی بہن ہوتی۔ ۔ تو تمہیں پتہ چل جاتا کہ تاریخ مانگنا۔ کتنے بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اپنی ساری عمر کی پونجی دوسرے کے دامن میں ڈال دینا بڑی حوصلہ مندی ہے کامران ..."

"عاطقہ اس کی بہن نہیں۔!"

"وہ بھائی بن کر رشتہ مانگنے آیا ہے۔"

"مجھے حیرت ہے کہ انسان عمر بھر کے کھیلوں کا رخ کس طرح میدان کی بجائے پہاڑوں کی طرف کر لیتا ہے۔"

"اپنی سوچ کے دائرے بدل لو ۔۔۔ کامران"

"تو میں اگر اپنی سوچ کو بدل بھی لوں ۔۔۔ تو میں عاطفہ کے بارے میں ۔۔" ابھی اس نے منہ سے اتنا جملہ نکالا ہی تھا ۔۔ کہ ایک دم شہاب اس پر بجلی کی طرح گرا ۔۔۔ اور ایک زناٹے دار تھپّڑ اس کے منہ پر پانچوں انگلیوں کے نشان چھوڑتا ہوا ختم ہو گیا ۔

"عاطفہ حوروں کا خواب اور فرشتوں کا تخیّل ہے کامران ۔ جس طرح بی بی مریم کے تقدّس کی قسم حوریں کھا سکتی ہیں، جس طرح سیتا کی پاک دامنی کی قسم دنیا کھا سکتی ہے ۔ اسی طرح میں عاطفہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں ۔ کہ وہ فرشتہ صفت لڑکی ہے ۔ پاک دامن ہے ۔۔ جس کے دامن پر فرشتے بھی نماز پڑھ سکتے ہیں" اتنا کہہ کر وہ سسک سسک کر رو دیا ۔۔ رضوان اور کامران مبہوت کھڑے کے کھڑے رہ گئے ۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ کوئی کچھ نہ کر سکا ۔۔۔ رضوان اسے تسلی دینے لگے ۔۔ کامران کو اپنی شکست کا احساس اور ہونے لگا ۔۔ اور وہ اپنے گالوں کو سہلاتا ہوا باہر کی جانب بڑھنے لگا ۔۔ تو شہاب ایک دم اس کے قدموں سے لپٹ کر سسکنے لگا ۔

"کامران میں تمہیں یوں نہ جانے دوں گا ۔۔ تمہیں میری لاش پر سے گزرنا ہو گا ۔۔۔ میں بھکاری بن کر تمہارے دروازے پر آیا تھا ۔ غیرت کی چوٹ نہ سہہ سکا اور غیر ارادی طور پر مجھ سے یہ فعل سرزد ہوا ۔۔۔ خدارا مجھے معاف کر دو ۔۔۔ خدارا مجھے معاف کر دو ۔۔۔ میں امی جان کو کیا منہ دکھاؤں گا

میں مقدس عاطفہ کو جا کر کیا کہوں گا۔۔۔۔ کہ شہاب اس کے سسرال میں کیا گل کھلا کر آیا ہے۔۔۔۔"

"پھوپھا جی۔۔۔ خدا کے لئے آپ کامران کو منا لیجئے"

شہاب کی دلدوز پکار سن کر انجم بھی دوڑی آئی۔ یہاں کا عجب منظر دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گئی۔۔۔ کامران اس کے خلوص کا پہلے سے معترف تھا۔۔ رضوان سے اس کی بے کسی دیکھی نہ گئی۔ اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور کامران جھٹ اس کے گلے لگ گیا۔۔ "میرے دوست مجھے معاف کر دو۔۔۔ میری وجہ سے تمہیں ندامت اٹھانی پڑی۔!"

میرے چھوٹے سے بھیا کہہ کر شہاب نے اسے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ اور اس طرح ایک ناخوشگوار واقعہ۔۔۔ خوشگوار واقعہ میں تبدیل ہو گیا۔ ایک آدھ گھنٹے کے بعد شہاب نے واپسی کی اجازت مانگی۔ کیونکہ وقت کم اور کام زیادہ تھا اور سبھوں نے اسے خوشی خوشی رخصت کر دیا۔

کامران آج کے واقعات لیٹا سوچ رہا تھا۔۔۔ کہ خوابوں کے شیش محل تو چکنا چور ہو ہی چکے ہیں۔۔۔ طائر خیال عاطفہ کی طرف گھوم رہا تھا کئی مرتبہ وہ عاطفہ کے خیالات پا چکا تھا۔۔۔ کہ اسے اس سے شدید نفرت تھی۔۔۔ وہ جب بھی اس کے قریب آیا۔۔۔ اک عجب سی محرومی و بدنصیبی کی خلش لے کر واپس آیا۔۔۔ اس نے دیکھا کہ جب عاطفہ شہاب کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔۔۔ تو ایک آزاد تتلی کی طرح خوشی و مسرت سے اڑتی پھرتی ہے۔۔۔۔۔۔ اور جب اس کے ساتھ کبھی ایسا موقع اسے پیش آجائے تو اس قیدی۔۔۔ کی طرح پابہ زنجیر چلتی ہے۔۔۔ جسے بیڑیاں نہیں چلنے دیتیں۔ شہاب تسلیم کرے یا نہ کرے۔۔۔۔ عاطفہ اسے دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہے۔۔۔ بعض عمل بڑے گہرے ہوتے ہیں۔۔۔ اور پھر عورت کی

محبت میں تو ہمیشگی کی شان پائی جاتی ہے۔۔۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ بیوی بننے کے بعد بھی۔۔۔اپنی پہلی محبت کو فراموش کر سکے گی۔؟ اور کیا وہ شوہر کے روپ میں اپنی بیوی کی اس حرکت کو نظر انداز کر دے گا۔؟ کیا یہ شادی دونوں فریقوں کے درمیان سمجھوتہ کروا دے گی۔؟؟

"ہرگز نہیں۔۔۔۔۔۔ کامران کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔۔ عاطفہ ایک خودسر ضدی لڑکی ہے۔۔۔اس کا لہجہ اس سے بات کرتے ہوئے کتنا قاتلانہ بن جاتا ہے۔۔۔۔اگر وہ اس کی شریک حیات بن رہی ہے تو جبراً۔۔اور یہاں آنے کے بعد اس کا رویہ واضح ہے۔ لفظ وضاحت نے آئینے کی طرح عاطفہ کا وہ کردار اس کے سامنے کر دیا۔۔۔جو ایک مرد۔۔۔ایک شوہر کی سراسر توہین ہے۔۔۔جو شوہر اپنی بیوی کے دل کو نہ جیت سکا۔۔۔اسے اس کا جسم حاصل کرنے کا بھی حق حاصل نہیں۔۔۔شادی تو ایک باہمی سمجھوتے کا نام ہے۔۔ذہنی قربت کا نام ہے۔۔باہمی افہام و تفہیم کا نام ہے۔۔! ایک مقدّس فریضہ ہے۔۔۔جو دونوں کی باہمی رضامندی سے طے پاتا ہے۔۔جبراً یہ مقدّس فریضہ بھی ناکام ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔اور اگر ذہنی قربت مل جائے۔۔تو زندگی رشکِ جنت بن جاتی ہے۔۔۔کامران نے تڑپ کر کروٹ لی۔۔بیقراری سے سگریٹ سلگایا۔۔۔اندھیرے میں ایک ننھی سی چنگاری تڑپی۔۔۔اور پھر بجھ گئی۔۔۔میرا رویہ کیا ہو گا۔۔؟ مجھے اس سے کیا برتاؤ کرنا ہو گا؟ مجھے اس کی نفرت کو محبت میں کیسے بدلنا ہو گا۔؟ مرحومہ امی جان کی آخری

وصیت، ان کی بھتیجی۔ مرحوم ماموں جان کا خون۔۔۔ اف میرے الٰہی۔۔۔ کہہ کر کامران اپنے ہاتھوں سے ماتھے کو رگڑنے لگا۔

مرحوم بزرگوں کا تصور کر کے۔۔۔ اس کا رواں رواں کانپ اٹھا بزرگوں کا جوڑ۔۔۔ کتنا غلط ثابت ہوا۔۔۔ جس لڑکی کا مجھے بچپن سے تصور دلایا گیا۔۔۔ جسے میں نے چاہا۔۔۔ جسے میں نے اپنے خیالوں میں پوجا اس نے آن واحد میں میری محبت کے تاج محل کو ایسی ٹھوکر مار کر ملیامیٹ کر دیا جیسے وہ مٹی کا گھروندا ہی تو تھا۔۔۔ ایک دل فگار سی آہ اس کے سینے سے نکلی اور تڑپ کر اس نے دوسرا سگریٹ سلگایا۔۔۔ بند اندھیرے کمرے میں سگریٹ کی لو رچی ہوئی تھی۔ وہ اپنی مسہری پر بار بار کروٹیں لے رہا تھا۔ محبت کی اتنی کڑی سزا ہوگی۔۔۔ اپنی سزا کی نوعیت کے بارے میں سوچ کر تھکا۔۔۔ اندھیرے میں امید کی کرن چمکی۔۔۔۔ اور اسے اپنی ساری پریشانیوں کا حل مل گیا۔۔۔!! وہ محبت کی ساری عمر بھیک نہیں مانگے گا۔۔۔ دل کی تمامتر شدتوں کے ساتھ اسے چاہتا رہے گا مگر ظاہری نفرت سے اس کا سینہ بھی سلگتا رہے گا۔۔۔ یا تو نفرت کا یہ لاوا پھوٹ کر دونوں کی زندگی میں ایک طوفان۔۔۔ ایک زلزلہ۔۔۔ جس کے ساتھ سینکڑوں بربادیوں کا تصور لازمی ہے مچا دے گا۔۔۔ یا پھر اس نفرت کے لاوے سے محبت کے کنول کھلا دے گا۔ جو سدا مہکتے رہیں گے۔۔۔ وہ اپنی زندگی کی ساری۔۔ خوشیوں کو اس داؤ میں لگا دینا چاہتا تھا۔۔ اس کا آخری فیصلہ اسے مطمئن کر گیا

عاطقہ

اس نے جلتے ہوئے سگریٹ سے چند دلکش کش لئے۔۔۔ وہ اس خطرناک کھیل کے لئے بالکل تیار ہو گیا۔ بکھرے بکھرے خیالات اس کھیل کے میدان کے گرد مجتمع ہونے لگے۔۔۔۔ پراگندہ سا ذہن پرسکون ہو گیا۔۔۔ اس خطرناک کھیل میں خاصی دلکشی اور کشش محسوس ہوئی۔۔۔ اور وہ ایک شاطر کھلاڑی کی طرح اس کھیل کی تکنیک کے بارے میں سوچنے لگا۔۔۔۔ اور ایک پر اسرار سے مسکراہٹ اس کے لبوں پر رقصاں ہو گئی۔۔۔۔!!"

وہاں پہنچ کر شہاب نے منتظمین کو سب پروگرام سے مطلع کیا۔۔۔۔ اور اپنے کمرے میں بڑے بوجھل قدموں سے آنے لگا۔۔۔ راہ میں عاطفہ کا کمرہ آتا تھا۔۔۔ دور سے ہی دل خواہ مخواہ دھڑکنے لگا۔۔۔ آنکھیں جلنے لگیں۔ سر میں چکر سا محسوس ہونے لگا۔۔۔۔ ایک لرزتی سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اسے محسوس ہوا۔۔۔ جیسے کوئی خوابوں کے دریچے سے اسے پرسوز سی آواز میں پکار رہا ہے۔ اس کا خیال تھا۔۔ کہ یہ کوئی واہمہ ہو گا۔۔۔ اچانک نظریں اٹھیں۔۔۔۔ تو سامنے عاطفہ متورم آنکھیں لئے جس میں سوز و جلن سے سرخی چھائی ہوئی تھی۔۔۔ کھڑی تھی۔۔۔!!

"شہابی میں نے آپ کی عبادت کی تھی۔۔۔ آپ کے نام کی تسبیح میرے لبوں پر ہمیشہ رہی۔ آج آپ نے خود میری عبادت گاہ کو ٹھکرا دیا۔۔۔۔!" اتنا کہہ کر وہ سسکتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔۔۔ شہاب کو ایسا محسوس ہوا۔۔ جیسے اس کی۔۔۔۔ اور اس تڑپتی ہوئی مچھلی۔ کی حالت بالکل یکساں ہے۔۔۔ جسے بے رحم موجوں نے ساحل پر پٹخ دیا ہو۔۔۔ لوگ منزل پہ پہنچ کر شاداں ہوتے ہیں۔۔۔ اور

یہاں..... منزل بھی..... قریب آکر..... اتنی دور چلی گئی۔ کہ ساری زندگی.....
بھٹکنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا.....

اس دلدوز شکوے کو سن کر شہاب کی کنپٹیاں جلنے لگیں..... وہ تیز تیز قدموں
سے اپنے کمرے میں آیا۔ بے دردی سے اپنا دروازہ بند کیا۔ اور انہیں کپڑوں میں اپنی مسہری
پر لیٹ گیا..... زندگی کے چاروں طرف مہیب زناٹے چھائے ہوئے تھے..... چاروں
طرف نفرتوں کی آگ روشن تھی۔ جس میں ایک مظلوم انسان جل رہا تھا۔ کہاں جائے۔؟
کس سے اپنا دکھ بیان کرے۔ خداوندا! یہ کیسی آگ روشن ہے۔؟ جس میں سب کچھ
جل رہا ہے..... لیکن نظر کسی کو کچھ نہیں آتا..... کوئی پرسانِ حال نہیں۔؟ کوئی ہمرانہ
نہیں..... کوئی ہمدم نہیں۔ کوئی ساتھی نہیں۔ اور وہ سسک سسک کر "ماں"!.....
"ماں" پکارنے لگا.....

انسان کا واحد ساتھی۔ دکھ سکھ کا سب سے بڑا سہارا..... سب سے
مخلص..... جس کی گود میں سر چھپا کر لیٹ جاؤ..... تو دونوں جہان کا سکون مل جائے.....
وہ اسی عظیم ہستی کو بے ساختہ پکارنے لگا!..... جب قدرے طوفان تھما..... اپنے بٹوے
کی جیب سے عاطفہ کی تصویر نکالی۔

"عطی میری زندگی کا مدعا..... صرف تمہاری..... اور صرف تمہاری پرستش
ہے۔ میں جیوں گا تو تمہارا نام لے کر۔! اور مروں گا تو تمہارا نام لے کر..... لیکن میری
عطی اب یہ راز مجھے سب سے چھپا کر رکھنا ہوگا..... کیونکہ تم اب پرائی ہو رہی ہو.....
عطی — آنکھوں کی لغزش تھی نا۔ اسے دردناک سزا بھی دوں گا..... کہ اب یہ سدا

جھکی رہیں۔۔۔۔ ایسا نہ ہو۔ کہ کھلی آنکھوں سے تمہاری محبت کا یہ راز فاش ہو جائے۔!!

تصویر کو بڑی محویت سے دیکھتا رہا۔۔۔ پھر تڑپ کر اسے سینے سے لگایا۔۔۔۔ اور اپنے صندوق کی سب سے نچلی کپڑوں کی تہہ میں رکھ دیا۔!! اور اس طرح اس سہانے کو اپنے سے خود بخود جدا کر دیا۔۔۔۔ جس سے اس کی زندگی وابستہ تھی۔!!

اگلے روز۔ طبیعت کی کسلمندی کے باوجود۔۔۔ شہاب دوڑ دوڑ کر سارا کام کرتا رہا۔۔۔ بازار کی شاپنگ میں بھی مسز آصف کا ساتھ دیتا رہا۔۔۔ دل میں حسرت اور آنکھوں میں غم کے دیئے چھپائے۔۔۔ وہ ہر کپڑے پر اپنی پسند ناپسند بتلاتا رہا۔۔۔ کامران کے لئے بہت شاندار فارن کے دو سوٹ خریدے۔۔۔ اور انہیں شہر کے سب سے اعلیٰ درزی کو سلنے کو دے دیئے۔۔۔ فرحت نے اپنی مدد کے لیے اپنی بہن، اس کی بچیوں۔۔۔ اور اپنی بھاوج کو بھی اطلاع دے کر بلوا لیا تھا۔ گھر میں اچھا خاصا ہنگامہ برپا تھا۔۔۔ عاطفہ سبھوں سے بے نیاز۔۔۔ سارا دن اپنے کمرے میں گھسی۔۔۔ نفسیات کی کتابوں میں بظاہر الجھی نظر آتی۔۔۔ چہرہ ہر قسم کے جذبات سے یکساں عاری تھا۔۔۔ وہ اپنی کھلی آنکھوں سے اپنی حسرتوں کا جنازہ تیار ہوتا دیکھتی رہی۔۔۔ ایک دن امی ڈھیر ساری شاپنگ کر کے آئیں۔ تو اتفاق سے اپنی خالہ اور ماموں زاد بہنوں ثوبیہ۔۔۔ حمیرا تبسم اور زندہ کے ساتھ اسی کمرے میں موجود تھیں۔۔۔ وہ دوپٹوں کو کرنیں ٹانک رہی تھیں۔۔۔ اور عاطفہ کے پاس ریکارڈ پلیر رکھا ہوا تھا۔ اسے یہی حکم دیا گیا تھا۔ کہ وہ ریکارڈ سنوائے۔۔۔ عاطفہ نے بھی دل کے سوز کو چھپانے کی بجائے اپنی پسند میں سمو دیئے۔۔۔ دردناک موسیقی نے فضا میں ارتعاش

پیدا کر دیا.... نور جہاں اپنی پرسوز آواز میں جادو جگا رہی تھیں ع

اب وہ زلفوں کی مہکتی ہوئی برسات کہاں

اے دل زار محبت کے وہ دن رات کہاں

عاطفہ پلیز.... خدا کے لئے کوئی خوشی کا گیت سنواؤ.... ہم آج ایسے المیہ گیت سننے کے موڈ میں نہیں.... ثوبیہ جھٹ ڈوپٹہ چھوڑ کر۔ بھاگی ہوئی آئی.. اور ریکارڈ پلیئر سے یہ ریکارڈ اتار دیا..

"ثوبی ــ زندگی سے ایسے منہ موڑ سکتے ہیں ــ؟"

"بھئی ــ! کوئی دلکش گیت سنواؤ.... اب اور کچھ نہیں سننا چاہتے۔" حمیرا نے کرن کو اپنے گھٹنے پر ٹھیک کرتے ہوئے کہا....

"جاؤ ثوبی تم جا کر اپنا کام ختم کر لو.... کہیں تم لوگوں کی حسرتیں دل ہی دل میں نہ رہ جائیں ــ" عاطفہ نے جلتے ہوئے لہجے میں کہا....

"پھر سنواؤ بھی ــ!" تبسم کسی سے کیوں پیچھے رہتی۔

"تو سنو ــ!" کہہ کر عاطفہ نے نیا ریکارڈ لگایا۔ اور ثنا لیلے اپنی پرسوز آواز میں پتھروں کو بھی رلا رہی تھی.... ع

کیسا گھروندا ٹوٹا ــــ پیار نے ہم کو لوٹا

بیری ہے دنیا والے ــ جاؤں کہاں

"عاطفہ.... خدا کے لئے ایسے منحوس ریکارڈوں کو بند کر دو.... ہم نہیں سنتے تمہاری شادی کے گیت..،، ثوبیہ نے ناگوار سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

عاطفہ

"تم میری شادی کے گیت سنانا چاہتی ہو نا ۔ تو میری پسند لگے گی ۔ ورنہ میں یہاں سے اٹھ کر چلی جاؤں گی ۔" عاطفہ نے دھمکی دیتے ہوئے کہا ۔۔۔۔ جب اروناایلیٰ اپنے سوز کا جادو جگانے لگی ۔۔۔ اور یہ پردرد شعر دہرانے لگی ۔۔۔!!

ایسی اجڑی من کی نگریا

ہنستے ہیں پتھر ۔ روتی ہے بینا

تو عاطفہ کی آنکھیں ۔۔۔ جھلملانے لگیں ۔۔۔ دل میں سوئی ہوئی شوریدہ لہریں ۔۔۔ سر اٹھانے لگیں ۔۔۔ محبت کا سوز پھر سے جاگ اٹھا ۔۔۔ ہزار ضبط کے باوجود ۔۔۔ آنسوؤں کی مالا ۔۔۔ ٹوٹ گئی ۔۔۔ محفل میں خاموشی چھائی رہی ۔۔۔ سکھیوں نے ان آنسوؤں "لڑکی کے روایتی" آنسو سمجھ کر اپنے سر جھکا لئے ۔۔۔

ساجن دیکھو حال ہمارا

دیا جو جلایا ہم نے ۔۔۔

اس کو بجھایا غم نے

بیری ہیں دنیا والے ۔ جاؤں کہاں

آخری شعر پر عاطفہ کی سسکیوں نے سبھوں کو افسردہ کر دیا ۔۔۔ اور گیت ختم ہوتے ہی سبھوں نے دل میں شکر ادا کیا ۔۔۔ کہ عاطفہ کو اس سوز و غم سے نجات تو ملی ۔۔۔ ابھی وہ شکر ادا کر رہی تھیں ۔۔۔ کہ اس نے ایک اور پر سوز گیت مہدی حسن کی آواز میں چھیڑ دیا ۔۔۔

ابھی پہلا شعر بج رہا تھا ۔۔۔ کہ اگّی لدی پھندی ۔۔۔ معہ شہاب اور اپنی

بڑی بہن کے اسی کمرے کی طرف آ گئیں۔۔۔ شہاب خوشی خوشی پیکیٹ اٹھائے ہوئے داخل ہوا۔۔۔ عاطقہ نے ایک دم گھٹنوں میں منہ دبا لیا۔ فضا مہدی حسن کے سوز سے سوگوار ہو رہی تھی۔۔۔

شہاب کے قدم ایک دم ٹھٹھک کر رہ گئے۔۔۔ بجلی کے ایک کرنٹ کے جھٹکے کی طرح وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا ہو گیا۔۔

مجھے تم نظر سے گرا تو رہے ہو
مجھے تم کبھی بھی بھلا نہ سکو گے

گیت کے بولوں نے عاطقہ کی زبان اختیار کر لی۔۔۔ وہ خود کو مجرم سمجھنے لگا۔۔ سامان جلدی سے رکھ کر جانے لگا تو تمام لڑکیاں سر ہو گئیں۔

"بیٹھیے ہم نے محفل جمائی ہے۔۔۔ اور آپ بھاگ رہے ہیں۔"

"مجھے کچھ کام ہے۔" شہاب کی آواز لرزیدہ سی تھی۔۔۔

"ہم نہیں جانے دیں گے۔"

"بیٹھ جاؤ بیٹا۔ بہنوں کی خوشی پوری کر دو۔۔۔" مسز آصف نے لڑکیوں کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

شہاب اس مجرم کی طرح کانپ رہا تھا۔۔۔ جسے تختہ دار دکھا دیا گیا ہو۔ اور اس پر ستم۔ کہ مہدی حسن اس کے صبر و شکیب کی طنابیں کھینچ رہے تھے۔۔۔

میری یاد ہو گی جدھر جاؤ گے تم
کبھی نغمہ بن کے، کبھی بن گے آنسو

عاطقہ

تڑپت مجھے ہر طرف.. پاؤ گے

اچانک عاطفہ نے گھٹنوں میں سے سر اٹھایا... عین اسی لمحے شہاب کی نگاہیں بھی اس سے ٹکرائیں.... اتنا سوز.... اتنی تڑپ.... اتنی بیقراری.... ڈھیر سے گلے شکوے.... اور شفاف موتیوں کی روانی دیکھ کر... شہاب ساکن سا ہو گیا..... اسے ایسا محسوس ہوا گویا وہ فضا میں معلّق سا ہو کر رہ گیا ہو۔

کبھی نام باتوں میں آیا جو میرا

تو بے چین ہو ہو کے دل تھام لو گے

نگاہوں میں چھائے گا غم کا اندھیرا

کسی نے جو پوچھا سبب آنسوؤں کا

بتانا بھی چاہو بتا نہ سکو گے

عاطفہ ہلکی ہلکی سسکیوں کے درمیان کمرے سے ایک جھٹکے کے ساتھ جا چکی تھی۔ دروازے کی کنڈی کلائی پر لگنے سے اس کی سنہری چوڑی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر شہاب کے قدم چوم رہی تھی۔ سنز آصف نے اپنی جہاں دیدہ نظروں سے سب کچھ دیکھا کہ انکی بچی کس آگ میں جل رہی ہے۔! ابھی تو مقام شکر تھا۔ کہ بہو کسی کام سے دوسرے کمرے میں گئی ہوئی تھی۔ لڑکیاں بظاہر تو اپنا اپنا کام کر رہی تھیں۔ شہاب نظریں جھکائے۔ اس ٹوٹی چوڑی کے ٹکڑے سمیٹے رہا عاطفہ

تھا۔ جو اس کے دل کی طرح لاکھوں ٹکڑوں میں پڑے تھے۔ اس چوڑی
کے تو ایک ایک ٹکڑے کو متبرک شئے سمجھ کر سنبھالنے والا موجود تھا
مگر اس کے دل کی قدر کرنے والا .... کوئی بھی اس دنیا میں
پیدا نہیں ہوا۔ !

لڑکی کی شادی بھی عجیب چیز ہوتی ہے۔ اس گھر کو چھوڑنے کا اتنا ملال
ہوتا ہے۔ کہ کھانا تک چھوٹ جاتا ہے۔ ہر ہر بات پر آنسو ہے۔ کہ ساون کے
بادلوں کی طرح امنڈے چلے آرہے ہیں...... پھر پیا کی شکل دیکھتے ہی
اپنا گھر پاتے ہی لڑکی ان یادوں کو یکسر ختم کر دیتی ہے۔

شہاب نے تڑپ کر مسز آصف کی طرف دیکھا۔ اور استفامی
نظروں سے پوچھا...... امی کیا یہ حقیقت ہے۔ کہ انسان اپنی انمول یادوں
کو بھلا دیتا ہے۔ جس سے کبھی اس کی زندگی عبارت تھی۔ !

دو خالہ سچ سچ بتلایئے کہ آپ اپنی شادی پر خوش تھیں ۔! ثوبیہ
نے سنہری کرن سے جگمگاتا دوپٹہ پھیلا کر دیکھتے ہوئے کہا
پوچھنے لگیں۔ وہ آپس میں مذاحیہ باتیں کرنے لگیں۔ شہاب نے موقعہ سے
فائدہ اٹھایا۔ اور باہر نکل گیا۔

بچی بہت ....!
مسز فرحت نے زندہ دلی سے کہا...... اور سب لڑکیاں کھلکھلا
کر ہنس پڑیں۔ اتنے میں ثوبیہ کی امی اندر آگئیں ـــــــ تو ہنسنے کی وجہ

"خالہ شہاب بھائی کتنے اچھے ہیں۔ انہیں اپنی بہن کی شادی کا کتنا غم ہے ــــ" تبسم نے معصومیت سے کہا۔

"کوئی اور بھائی ہوتے ــــ تو سارا سارا دن غائب رہتے ــــ اور حمیدا نے طرح لگائی ــــ!

بیچارا شہاب ــــ! ثوبیہ نے درد سے سوچا ...... وہ چند دنوں میں ساری کہانی سے روشناس ہو چکی تھی۔ محبت زبان نہیں رکھتی۔ مگر پھر بھی ...... سمجھی جا سکتی ہے۔

"وہ بڑا اچھا لڑکا ہے ......" ثوبیہ کی امی نے بھی حمایت کر ہی دی۔ جو ساری زندگی اس سے نفرت کرتی رہی ــــ بلکہ بہن کو بھی اس نفرت کے لئے تیار کرتی رہی۔ جس نے اسے کہیں کا نہ چھوڑا۔

شادی میں صرف تین دن رہ گئے تھے۔ شہاب کے دل پر ایک بات بڑی کھٹکی کہ وہ جتنا رنجیدہ ہوتا جا رہا تھا۔ عطی اتنی ہی شوخ نظر آ رہی تھی: لڑکیاں اس سے مذاق کرتیں۔ تو دل کھول کر قہقہے لگاتی۔ سارا دن اپنے جہیز کی چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتی...... اور طرح طرح کے ریمارکس کستی۔

"لٹو بیر کی بچی ـــــ اس سنہری سوٹ پر تم نے کتنا لچکا لگایا ہے اتنے بڑے بڑے ٹانکے جیسے کسی گنوار نے لگائے ہوں" وہ بُرا سا منہ بنا کر کہتی۔

"اچھا جی بے زبان کو بے زبان مل گئی۔ تم ہماری شادی پر اس سے بھی بڑے ٹانکے لگا کر دل ٹھنڈا کر لینا۔"

ثو بیہ بھی ہنس کر جواب دیتی۔

اور پھر سب مل کر خوب قہقہے لگاتیں۔ آج بھی شہاب مسز آصف کے

ساتھ کلم کاج کروا رہے تھے۔ کمروں کی ترتیب و سامان درست کیا جا رہا تھا۔ کہ ایک دم ان کے قہقہوں کی آواز سن کر شہاب کے بڑھتے ہوئے قدم رُک سے گئے۔ جب اسنے عاطفہ اور ثوبیہ کے درمیان باتیں سنیں۔ تو وہ دھک سے رہ گیا۔

لڑکیاں کتنی جلدی اپنا ماضی بھول جاتی ہیں ——؟

اس کا زخمی ذہن اس وقت اور تلملا اٹھا۔ جب یہ سب بھاگتی ہوئی باہر نکلیں۔ اور شوفیر کو گاڑی نکالنے کو کہا —— شہاب سوچتا رہ گیا۔ کہ عاطفہ تو بڑی سنجیدہ اور پروقار سی لڑکی تھی۔ اس کی چال میں تو بڑی تمکنت و غرور تھا۔ اس کے دھیرے دھیرے قدم تو دل کے تاروں کو چھیڑ دیا کرتے تھے۔ اب یہ دھپ دھپ کرنی اس نے کہاں سے سیکھی ——؟ کونسی خوشی مل گئی۔ کہ دھرتی کا سینہ پھاڑنے لگی۔ لڑکیاں جا چکی تھیں۔ شہاب انہیں گیلری کی اوٹ میں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا —— کہ اچانک فضلو بابا کی آواز سن کر چونکا۔.....

چھوٹے سرکار فرحت جیولز والے آئے ہیں.....!

آں...... اچھا...... میں ابھی امی کو اطلاع دیتا ہوں۔ تم انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ..... شہاب نے چلتے ہوئے واقعات سے چونکتے ہوئے کہا.....

وہ بوجھل بوجھل قدموں سے مسز آصف کے پاس گیا۔ اور انہیں فرحت

جیولرز والوں کے آنے کی اطلاع دی۔ ایکدم ان کے چہرے پر فکر کی سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔

"کیا بات ہے امّی ——؟"

"ان کے آڈر تو عاطفہ کے پاس ہیں ——اور وہ شاپنگ کے لئے گئی ہوئی ہیں۔" میں ذرا عاطفہ کے کمرے میں جا کر دیکھ لیتا ہوں —— ہوسکتا ہے اس کی میز ویز پر رکھے ہوں۔"

"جلدی جاؤ میرے بیٹے۔ کاروباری لوگ ہیں۔ کب تک رہیں گے۔"

مسز آصف نے ایک دم خوش ہو کر کہا۔

نجانے کیوں عاطفہ کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے۔ اس کا دل بڑی طرح سے کانپ اٹھا...... عجیب سی اجنبیت کا احساس ہوا۔ سارے کمرے کی چیزیں منتشر منتشر سی اس کے خیالات کی غمازی کر رہی تھیں۔ کمرے سے عاطفہ کی مخصوص خوشبو آ رہی تھی۔ شہاب کی عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔ اس نے جلدی جلدی دو ایک جگہ چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھیں۔ پھر اچانک تکیہ ہٹا کر دیکھا۔ گدیلے کا ایک سرا یونہی اٹھایا۔ خواب آور گولیوں کی بھری شیشی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ شہاب کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے شیشی اٹھا کر دیکھی۔ خواب آور گولیاں ہی تھیں۔

"عطی یہ کیا ——؟ میرے قہقہے.... میرے مذاق۔ میری زندہ دلی

میری شوخی۔ اور میری مسرت کا راز۔ تم تو اپنا دامن چھڑا رہے تھے نا۔ مگر عظمی تمہارے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔

عظمی نے تو تمہاری عبادت کی ہے۔ تمہارے نام کی تسبیح پڑھی ہے اب وہ ان تسبیح کے دانوں کو کیسے بکھیر دے۔ جیسے وہ بچپن سے سنبھالتی آئی ہے۔ صدائے بازگشت اس کے ذہن پر ہتھوڑے کا کام کر رہی تھی عاطفہ کا یہ فعل اسے اس کے خاندان میں زندہ رہنے دے گا۔

ابو کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ امی کے وقار کا آبگینہ بھری برادری میں چور چور ہو جائے گا۔ اور وہ ساری دنیا کے سامنے اس کے منہ پر تھوک کر کہے گی۔ کہ یہ سب کرتوت اس بھیک منگے کی اولاد کے ہیں۔

شہاب کا سر گھومنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا تو چھا یا ہی ہوا تھا۔ کہ اس اندھیرے میں جو اس نے اپنا توازن برقرار رکھا وقت کم ——— اور کام مشکل ——— اس نے جلدی سے وہ شیشی وہاں سے اٹھالی۔ بھاگم بھاگ ابو کے کمرے کی الماری کھولی۔ ڈھیر ساری دواؤں کی شیشیوں کے درمیان اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ کچھ شیشیاں الٹ پلٹ کرنے کے بعد اسے اسی سائز اسی رنگ کی گولیاں نظر آئیں۔ جلدی جلدی میں اس نے اس میں سے وہ ساری گولیاں نکالیں ——— اور دوسری شیشی کی گولیاں اس میں بھر دیں۔ کچھ شیشی خالی نظر آئی۔ حاضر دماغی نے کام کیا۔ جھٹ اس پر

روئی کا ایک پھایا رکھا۔ مضبوطی سے شیشی دوبارہ بند کی۔ اور وہیں جا کر رکھ دی جہاں سے اٹھائی تھی۔ بستر کو دوبارہ ٹھیک کر دیا۔ کوئی محسوس نہ کر سکے۔ کہ اتنے میں مسز آصف کی آواز پھر سنائی دی۔

"شہاب نہیں ملیں ——— تو آجاؤ۔"

آیا امی کہہ کر اس نے اپنے ماتھے کے پسینے کو پونچھا ——— دل پر سے جیسے منوں بوجھ اتر گیا ——— خواب آور گولیاں اس کی جیب میں پڑی ——— عاطفہ کے ارادے کا منہ چڑا رہی تھیں۔ سامنے مسز آصف کو دیکھ کر اس کا دل دھڑک اٹھا۔

"نہیں ملیں ———؟"

"نہیں امی ———!"

"جاؤ تم ان کے پاس بیٹھو ——— میں بھی چیک لیکر آرہی ہوں۔"

بہتر امی ——— ! کہہ کر وہ ڈرائنگ روم کی طرف گھوم گیا۔ میزوں پر خوبصورت مخملیں ڈبوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ فرحت جیولرز والے بڑی شان سے تشریف فرما تھے۔ اسے محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ اپنی پوری کی پوری دکان اٹھا لائے ہیں۔ آڈر کے علاوہ مختلف سیٹوں کے ڈبے ان کی اس آس کو ظاہر کر رہے تھے۔ کہ سیٹھ آصف شہر کے مشہور و معروف شخص کی اکلوتی لڑکی کی شادی تھی۔ اکلوتی بچی کی خوشی کے لئے چھوٹے صاحب اور بیگم صاحبہ سب کچھ خرید سکتے ہیں۔ وہ شہاب کو ڈبے

کھول کھول کر دکھانے لگے .... اور شہاب کا ذہن خواب اور گولیوں کے درمیان گھوم رہا تھا۔ سرخ کپڑوں میں ملبوس ایک کامنی سی لڑکی ڈھیر سارے زیورات سے لدی بھری ...... مانگ میں افشاں سجائے ہمیں سے ہاتھوں پر اپنے ارمانوں کا خون لگائے۔ نیم غنودگی کے عالم میں جھوم سی رہی ہے ——— میرے شابی کو بلاؤ —— میرے شابی کو خدا کے لئے کہو۔ صرف ایک بار آجائے۔ اسے میری طرف سے صرف اتنا کہدو۔ لڑکی زندگی میں صرف ایک بار کسی کو چاہتی ہے۔ میری سیج سجانے والے ظالم میرے جنازے کو کندھا دینا —— تو سنگدل نکلا ...... تو بے وفا نکلا ...... مگر میں اپنی وفا پہ قربان ہوگئی ——— اور اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔

شہاب کے منہ سے ایک دردناک سسکی نکلی ——— اس نے اپنا سر صوفے کی پشت پر ٹیک دیا —— اور آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ کہ اتنے میں مسز آصف کمرے میں آگئیں —— سب مودبانہ کھڑے ہو گئے۔ شہاب کا بالکل زرد چہرہ دیکھ کر ... وہ دل میں تو خوف زدہ ہوئیں مگر ہوشمندی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اس کے قریب آکر پوچھنے لگیں۔

"شہاب کیا بات ہے —؟"

"امی یونہی سر میں ایک چکر سا آیا ...."

"سارا دن کام کرتے نہیں تھکتے۔ گھر میں دس دس نوکر ہیں۔ مگر ایک ہی بات کہ بہن کی شادی روز روز نہیں ہوتی ——"

"چھوٹے سرکار ٹھیک کہتے ہیں۔ بیگم صاحب —— سیٹھ آصف کی اکلوتی بچی کی شادی بڑی دھوم دھام اور شان و شوکت سے ہونی چاہیئے ہم بھی یہی آس لیکر اپنے اور بہترین جواہرات کے سیٹ لائے ہیں۔ کہ یہ انوکھے اور قیمتی زیور صرف چھوٹی سرکار پر سجیں گے۔"

پہلے کی بات کاٹ کر دوسرا نے دوہا دیا۔

"کھولیئے —— نعیم اب —— ڈبے بیگم صاحب کے سامنے۔"

حکم ملتے ہی دوسرے آدمیوں نے کمال چابکدستی سے میزوں پر بڑی خوبصورتی سے جگمگاتے زیورات کے ڈبے کھول کر رکھ دیئے۔ عورت کی کمزوری زیور —— !! نزاکت میں مشہور —— دو سیر بوجھ اُٹھا کر چل نہیں سکتی —— مگر سیروں زیورات پہنا کر میلوں چلا دیکھئے۔ ذرا تھکن محسوس نہ کرے گی۔ بیگم آصف بھی اپنے آڈر کو بھول کر کچھ زیورات میں ایسی کھوئیں —— کہ شہاب کو بھول بیٹھیں۔ شہاب پانی پینے کے لئے باہر جا چکا تھا۔ کہ وہ گویا ہوئیں۔

"شہاب تم بھی اپنی پسند کا کوئی سیٹ بتلاؤ۔"

بیگم صاحب چھوٹے سرکار تو باہر تشریف لے گئے ہیں۔ دوسرے شخص نے پراسرار سی مسکراہٹ لاتے ہوئے مؤدبانہ کہا۔ ..... وہ

عورت کی کمزوری سمجھ چکا تھا ـــــ کہ زیورات میں اتنا شوق اور انہماک یقیناً ان کے لئے فائدہ مند ہوگا۔

"آپ کو ایک منٹ کا انتظار کرنا ہوگا۔ ذرا میں بچے کو دیکھ کر آؤں۔ کہیں اس کی زیادہ طبیعت نہ خراب ہو گئی ہو۔" مسز آصف بڑے وقار سے اٹھ کر کھڑی ہوئیں۔ شال کو اپنے کندھوں پر پھیلایا۔ اور دھیمے دھیمے قدموں سے باہر نکل گئیں۔ ان کے جاتے ہی پہلا شخص بولا۔

"ابھی چھوٹے سرکار کی طبیعت نے خراب ہونا تھا۔"

شکار ہاتھ سے نکل گیا۔

"نہیں نہیں دل چھوٹا نہ کرو ـــــ عورت اور زیور۔ لازم و ملزوم شے ہیں ـــــ!"

پھر تینوں آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے......خود ہی اپنے بنائے ہوئے زیورات پر تنقید کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد بیگم صاحبہ معہ شہاب کے پھر آئیں۔ اور کچھ دیر پسند ناپسند کا سلسلہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ اپنے آڈر کے باوجود چھ سیٹ اور زیورات کے خریدے گئے۔ جس میں ایک دل نما بڑا خوبصورت ہیروں کا سیٹ شہاب نے اپنی طرف سے خریدا ـــــ زیور کا مکمل سیٹ جس میں دل بنایا گیا تھا اس میں تیر لگا۔ اور ذرا نیچے چار پانچ سرخ رنگ کے نگوں سے خون کے قطرے ظاہر کئے گئے تھے۔ عاطفہ اور لڑکیاں آ چکی تھیں۔

آرڈر نمبر مل چکا تھا۔ سب حساب کتاب چکا کر مسز آصف چیک کاٹنے لگیں۔ تو شہاب نے دو ہزار الگ نکال کر دیئے ـــــ اور آہستہ سے کہا ـــ!

" امی یہ سیٹ میری طرف سے عاطقہ کے جہیز میں رکھ دیجئے گا "

" تمہارے اور میرے پیسے کوئی الگ الگ ہیں "۔

' امی ـــــ یہ نقد دے دیجئے بقیہ کا چیک کاٹ دیجئے...... '!

مسز آصف نے شہاب کی طرف دیکھا۔ جو زرد چہرے ـــــ کانپتے لبوں سے ہر کام بڑے ایثار و خموشی سے کر رہا تھا۔ وقتی طور پر ہر ایک ہمدردی کا ریلہ اٹھا اور پھر بہہ گیا۔

جیولرز والے بڑی چابکدستی سے ڈبے بند کر رہے تھے۔ جھک جھک کر سلام کر کے ہزاروں روپوں کا زیور چرب زبانی سے بیچ کر چلتے بنے۔ مسز آصف کچھ ڈبے خود اٹھانے لگیں ـــــ تو شہاب نے بڑھ کر دونوں ہاتھوں میں سارے ڈبے تھام لیے "! امی آپ چلیئے میں لا رہا ہوں ـــــ اور ہاں امی ـــــ عاطقہ یا خالہ جان کسی کو نہ بتلایئے گا کہ یہ سیٹ میں نے خریدا ہے۔ عاطقہ کو میں شادی کے روز یہ تحفہ دوں گا "کہتے کہتے خود اس کی آواز کانپنے لگی۔ ہاں ویسے بھائی کا تحفہ دینا تو بنتا ہے " مسز آصف نے باہر نکلتے نکلتے ایک تیر اور چھوڑا ـــــ

شہاب تلملا کر رہ گیا ـــــ ورنہ چیخ چیخ کر کہتا۔

عاطقہ

امی میں نے تو اپنی زندگی دیدی ہے۔ اپنی ہر خوشی نچھاور کر دی۔ اپنے ارمانوں کا خون کر دیا ـــ آپ کون سے تحفے کی بات کرتی ہیں ـ؟ کون سے تحفے کا حق جتاتی ہیں ـــ؟ ساری عمر کی ریاضت آپ کے قدموں میں "تابعداری اور انکساری میں رکھ دی ـــ؟ آپ کن تحفوں کا ذکر کرتی" ہیں ـــ؟ مگر وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ صرف ہلتے" پردے کو دیکھتا رہا۔

اُس نے ڈرائنگ روم کے در و دیوار کو نفرت اور جلتے ہوئے انداز میں دیکھا ـــ ہر طرف امارت ہر طرف امارت کا غرور۔ اس کا جی چاہا۔ اس امارتی غرور کے ایک ایک سامان کو نذرِ آتش کر دے۔ جس کے سامنے کسی غریب کے دل کی قدر نہیں۔ جس کے سامنے ایک حقیر انسان کی وقعت نہیں۔ جہاں صرف دھن و دولت کی قدر و قیمت ہے۔ ملوں اور کارخانوں کوٹھی بنگلوں کا ذکر ہے۔ غیر ملکی سامان کی آرائش دکھا دکھا کر اپنے سفلی جذبے کی تسکین کا سامان مہیا کیا جاتا ہے۔ اور اپنے ملک کی مصنوعات کا تمسخر بڑی بڑی محفلوں میں بطورِ خاص کیا جاتا ہے۔ یہ سوسائٹی کا روحِ رواں انسانیت کی قدروں سے ناآشنا انسان دل جیسی لطیف شئے کو کیا جانیں ـ؟

دل ہی دل میں جل کڑھ کر اس نے اپنے والا ڈبہ اپنی جیب میں رکھا اب اس کے دلِ ناتواں میں اتنی طاقت نہیں۔ کہ سبھوں کے سامنے اپنی مزید ہتک کروائے۔ یا ہر ایک کی تیز تیکھی نظروں کا نشانہ بنے۔ اب اسے

افسوس ہونے لگا کہ وہ کیوں ایسی حماقت کر بیٹھا۔ اپنی حسرتوں کا نقشہ زیورات کی صورت میں نظر آیا تو مچل اٹھا۔ کاش وہ دل کو سنبھالتا تو ایسی ندامت محسوس نہ ہوتی۔ مسز آصف کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ شہاب کو پکار رہی تھیں۔ وہ جلتے ہو ذہن کے ساتھ زیورات کے ڈبے تھامے اس کمرے میں آ گیا جہاں سب کچھ نہ کچھ کام کر رہے تھے لڑکیاں عاطفہ کے گرد دائرہ بنا کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ لو بیہ ڈھولک بجا رہی تھی۔ کوئی پنجابی بولوں کا بڑا شرارتی گیت کنوارے کنوارے ہونٹوں سے پھسلا جا رہا تھا۔

جونہی شہاب کمرے میں داخل ہوا اور وہ ٹھٹھکا ——— ادھر عاطفہ سکتے میں آ گئی۔ سرخ و سفید رنگت والا شہاب اس وقت بالکل سفید لٹھے کا نچوڑا ہوا رنگ لیئے ——— آنکھیں سرخ سرخ سی جیسے رو کر آیا ہو۔ چہرے پر سینکڑوں بے بسی اور حسرتوں کے مدھم مدھم سے چراغ جل رہے تھے۔ عاطفہ کی نظر شہاب پر پڑتے ہی محبت کی دنیا میں ہل چل مچ گئی الہی مجھے صبر دے۔ حوصلہ دے ———! شہاب دھیرے سے بڑبڑایا لڑکیوں نے ڈھولک ایک طرف لڑھکا دی ——— اور سب زیورات پر چیل کی طرح جھپٹیں ——— عاطفہ اپنی جگہ پر بالکل ساکت و جامد بیٹھی رہی۔

عاطفہ تم بھی دیکھو شہاب نے جناتی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا ——— تمہاری پسند خراب ہو سکتی ہے۔" عاطفہ نے زخمی جذبات

عاطفہ

چھپاتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی گہرا طنز بھی کر گئی۔

"بھائیوں کی تو ہمیشہ سے یہی کوشش ہوتی ہے۔ کہ اپنی بہنوں کو دنیا کی سب سے قیمتی اور اعلیٰ چیزیں دی جائیں ۔۔۔ !"

ثوبیہ کی امّی نے کمال ہوشیاری سے بات بناتے ہوئے کہا "بھیّا آپ کونسا تحفہ دے رہے ہیں۔ عاطفہ باجی کو ۔۔۔ ؟"

تبسّم نے بھولے پن سے پوچھا۔

"بہت قیمتی ہوگا ۔۔۔ !" حمیدہ نے طرح لگائی۔

"مفلس انسان ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قیمتی تحفے دے سکتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو ان کی آنکھوں میں آج آنسو کیوں آتے ۔۔۔ ؟" شہاب نے جذبات سے رندھی ہوئی آواز میں بڑے پرسوز لہجے میں دل کی بات کہی ۔۔۔ اس نے کانپتی پلکوں کے اٹھتے گرتے سایوں میں شبنم کے جھلاتے قطرے دیکھے اور وہاں سے تیر کی طرح نکل کر اپنے کمرے میں آگیا۔

ساری محفل پر سناٹا چھا گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فرحت ان کی بہن عاطفہ اور ثوبیہ سب کچھ سمجھتی تھیں۔ مگر بولے کون ۔۔۔ ؟؟ ایک دوسرے کو استفہامی نظروں سے گھورتی کی گھورتی رہ گئیں۔ خوشی کی محفل میں پھر سوگواری شامل ہوگئی۔

عاطفہ بھی بوجھل قدموں سے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ دونوں بہنوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہا ۔۔۔ اور عاطفہ

لڑکیوں کو حکم دیا۔ کہ سب عاطفہ کے کمرے میں جا کر بیٹھیں اور اسے بالکل رونے نہ دیں۔ دونوں جہیز کی ایک ایک چیز کو سلیقے قرینے سے لگانے لگیں..... وہاں عاطفہ کے صبر پر شہاب کے اس جملے نے زلزلے کا کام کیا — وہ خود کو شہاب کا مجرم سمجھنے لگی۔ اس کی محرومیوں کو جگانے والی صرف وہ تھی۔

ساری زندگی جس انسان نے خوشی کا منہ نہ دیکھا ہو۔ ایک ہلکی سی موہوم خوشی کی جھلک دیکھا کر — ایک دم اسے مہیب اندھیروں میں دھکا دے دیا جائے۔ تو وہ انسان حق پر ٹھوکر کھا کر روئے گا — لڑکیوں کی آمد نے اسے اور چڑچڑا کر دیا — اور قدرے تلخ لہجے میں اس نے کہا

"خدا کے لئے مجھے کبھی تو تنہا چھوڑ دیں —!"

"دلہن کو تنہا چھوڑنے سے آسیب وغیرہ کا خطرہ رہتا ہے" حمیدہ نے کہا — "کاش کوئی آسیب کوئی بھوت مجھے تو کھا جاتا —!"

"عاطفہ کیسی باتیں کر رہی ہو —؟"

ثوبیہ خدا کے لئے انہیں کہئے۔ کہ مجھے تنہا چھوڑ دیں"

ثوبیہ کے اشارہ کرنے پر سب لڑکیاں باہر نکل گئیں اور عاطفہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ثوبیہ سمجھاتی رہی — مناتی رہی۔ مگر عاطفہ چپ نہ ہوئی تو وہ کہنے لگی۔

"میں شہاب کو پکڑ کر لاتی ہوں — کہ اپنے جملے واپس لیں۔ ہماری عاطفہ

عاطفہ نے تو رو رو کر اپنے گریبان کو بھگو دیا ہے۔"

"نہیں نہیں ثوبیہ میں ان کا سامنا کرنے کی طاقت نہیں رکھتی . . . . میں ان کی مجرم ہوں —— میں گناہ گار ہوں۔"! عاطفہ کے آنسو تھے۔ کہ بہے چلے جا رہے تھے . . . . . . !

"عاطفہ تم تو اپنا نیا گھر بسا لو گی۔ تم تو مصروف ہو جاؤ گی۔ کبھی بھولے سے بھی گزری یادوں کی دھڑکن تمہیں تڑپا نہ سکے گی —— سوچو —— شہاب پر زندگی کے شب و روز کتنے بھاری پڑ جائیں گے۔ انہیں تسلی دے دو ——"! ثوبیہ نے راز داں بنتے ہوئے کہا۔

"کس منہ سے اور کس دل سے تسلی دوں —— ثوبیہ —— ؟"

"تمہارے منہ کے نکلے ہوئے دو بول ہی انھیں صبر دے سکتے ہیں۔ وہ مجھ سے بات نہیں کریں گے۔"!

"یہ تمہاری بھول ہے۔ وہ تم سے بات کرنے کو ترس رہے ہیں"۔ "تم نے کیسے جانا۔ ؟" عاطفہ نے اپنی متورم بند بند سی۔ آنکھوں کو جبراً کھولتے ہوئے پوچھا۔

"ان کی آنکھوں کی بے بسی سے۔"

"ثوبیہ میں کیسے جاؤں —— ؟

"ٹھہرو میں ذرا باہر کے حالات کا ایک جائزہ لے کر آؤں پھر تمہیں کچھ مشورہ دوں گی"۔ ثوبیہ باہر نکل گئی اور عاطفہ سوچنے لگی۔ کتنی ہمدرد ہستی ہے

کتنی جلدی ہمارے دلوں کا غم پہچانا اس نے ــــ ثوبیہ آپی ــــ اور سرگوشی کے انداز میں کہا۔

دونوں بہنیں باہر جانے کی تیاری کر رہی ہیں۔ ممانی جان ننھے کو لئے بیٹھی ہوئی تھیں۔ اسے بڑا زبردست خسرہ نکلا ہوا ہے۔ حمیدہ تبسّم اور کچھ محلے کی لڑکیوں ..... کو خالہ جان نے ٹانکنے وغیرہ کا کام دیا ہوا ہے۔

"امی اور خالہ چلی جائیں۔ تو پھر جاؤں گی۔ عاطفہ نے دھیرے سے کہا۔

میں باہر جاتی ہوں۔ لڑکیوں کو اور مصروف رکھوں گی۔ خالہ امی چلی جائیں۔ تو پھر تمہیں آکر مطلع کروں گی۔ ثوبیہ کو گئے گئے ایک گھنٹہ گذر گیا۔ انتظار کی گھڑیاں قیامت بن گئیں۔ دھوپ کے سائے ختم ہو گئے۔ شام کا ملگجہ اندھیرا چھانے لگا ــــ پرندے اپنے اپنے گھونسلوں کی طرف خوشی سے چہچہاتے ہوئے اڑتے چلے جا رہے تھے۔ شفق پر گہری نارنجی رنگ کی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی ــــ موسم بہت ہی حسین ہو چلا تھا۔ دریچوں کی راہ سے معطر ہوائیں چلی آرہی تھیں ــــ عین اسی لمحے ثوبیہ آئی۔ "عاطفہ وہ جا چکی ہیں۔ ذرا جلدی آجانا میں باہر لڑکیوں کے پاس ہی بیٹھوں گی ــــ!"

اس نے بڑی میٹھی نظروں سے عاطفہ کی طرف دیکھا ــــ اور عاطفہ

کی نگاہیں تشکر سے جھک گئیں۔

اس نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ متورم متورم سی سرخ آنکھیں آنسوؤں کی مسلسل بارش سے چہرے کی سرخ دمک آئی۔ بھیگے بھیگے سے ہونٹ اور ان پر سوگوار سی مسکراہٹ۔

"کتنی بدنصیب ہوں میں ——" اس نے ایک سرد آہ بھری۔ اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی شہاب کے کمرے کے باہر ہی ٹھٹھک کر رہ گئی۔ پاؤں من من کے بھاری ہو گئے۔ وہی کمرہ۔ وہی مکین —— جہاں وہ بغیر کسی جھجھک کے آجایا کرتی تھی۔ اب اندر قدم رکھنے کی تاب نہیں —— دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ کمرے میں ملگجہ سا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سگریٹ کے دھوئیں سے سارا کمرہ بھرا پڑا تھا۔ اس نے اپنی سوجی سوجی آنکھوں کو کھولتے ہوئے دیکھا۔ کہ شہاب دریچہ کھولے —— کہنیوں کو ٹکائے —— ایک ہاتھ کے پیالے میں چہرہ رکھے۔ دوسرے ہاتھوں کی انگلیوں میں آدھ جلا سگریٹ پکڑے کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا۔

یہ آہستہ آہستہ قدموں سے کمرے میں داخل ہوئی۔ دریچے میں کھوئے ہوئے انسان نے کوئی جنبش نہ کی...... اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اور اپنی شکست پر پھر آنسوؤں کا سیلاب بند توڑ توڑ کر اس کے رخساروں کو بھگونے لگا۔ اتنی اجنبیت —— اتنی بے نیازی

کمرے میں ایک گھمبیر سی اداسی چھائی ہوئی تھی ۔۔۔۔ ایکدم وہ آگے بڑھی۔ اور اس کی پشت پر سر لگائے سسکیاں لینے لگی ۔۔۔۔۔

"عطی تم ۔۔۔۔؟" اس نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اپنے مقابل کھڑا کرتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"شابی ۔۔۔۔۔ مجھے اپنے ہاتھ سے قتل کر دو ۔۔۔۔ میرا گلا گھونٹ دو۔ مگر اللہ مجھے اتنی کڑی سزا نہ دو کہ میں تا زیست گیلی لکڑی کی طرح سلگتی رہوں۔ اتنا کہہ کر ایک دم وارفتگی سے اس کے قدموں میں جھک گئی۔

شہاب اس غیر متوقع پر حیران تو پہلے ہی تھا۔ عاطفہ کے اس فعل نے اسکے صبر و شکیب کی ساری طنابیں کھینچ دیں ۔۔۔۔ اس کا جی چاہا کہ اپنی پجارن کو قدموں سے اٹھا کر اپنے سینے سے لگائے۔ وہ جھکا بھی ۔۔۔۔۔۔ مگر ایک آواز نے ۔۔۔۔ اسے بے دست و پا کر دیا ۔۔۔۔

"یہ کامران کی امانت ہے ۔۔۔۔ تم ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ تم ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے ۔۔۔۔"

شہاب نے دلِ گرفتہ آواز میں کہا ۔۔۔۔

"عطی اس وقت تمہارا یہاں آنا ۔۔۔۔ میری زندگی کو اور تاریک کر سکتا ہے"

"مجھے کسی کی پرواہ نہیں شابی ۔۔۔۔ میں صرف تم سے پوچھنے آئی ہوں۔ کہ

تم کیسے مرد ہو ــــ؟ جو مجبوری کے بندھن میں ایک عورت کی طرح جکڑے ہوئے ہو ــــ؟"

"کیا تم ماحول سے بغاوت نہیں کر سکتے ــــ؟ کیا تم اپنا حق لڑ کر نہیں لے سکتے ــــ؟ تمہارے بازوؤں میں کوئی سکت نہیں ــــ تم مرد نہیں ــــ تم بزدل ہو ــــ شابی ــــ میرا آئیڈیل تو بزدل نہیں تھا ــــ وہ تو مردانہ وجاہت وقار اور طاقت کا شاہکار تھا ــــ ایک بار وہ پھر اس کے قدموں کو پکڑے سسکنے لگی۔ فضا بھی نم ناک ہو گئی ــــ کمرے میں اندھیرا چھا رہا تھا ــــ اس "تاریکی میں کنواری سسکیوں نے اور غم بھر دیا ــــ یہ سوگوار انداز ــــ شہاب کو تڑپا گیا۔

"عطی وقت گذر چکا ہے۔ تمہارا رونا اور میرا تڑپنا سب بیکار ہے۔ تم امانت ہو کسی کی ــــ میں تم سے یہی التجا کروں گا ــــ کہ تم یہاں سے چلی جاؤ ــــ؟"

تمہاری التجا کا میں پاس رکھوں گی شابی ــــ میں تم سب کی نگاہوں سے دور چلی جاؤں گی ــــ بہت دور ــــ وہ وہیں زمین پر گھٹنوں میں سر دیئے پھر سسکنے لگی۔ اور شہاب کو صبح کا واقعہ ــــ خواب آور گولیوں کی ننھی شیشی نظروں میں گھومنے لگی ــــ اس کا رواں رواں کانپنے لگا۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ــــ

"عطی تم سے کچھ مانگوں ــــ دو گی!"

عاطفہ

"کیا دے کے بھولے ہو ـــ؟" عاطفہ نے جلتے ہوئے انداز میں کہا ـــ!

"میں تو مفلس ہوں۔ تہی دامن ہوں ـ کیا کسی کو دے سکتا ہوں ـ؟ تم تو ایک سیٹھ کی بیٹی ہو ـ دھن دولت تمہاری دہلیز پر سجدہ کرتی ہے ـ خوش بختی تمہارے ہاں کی غلام ہے ـ"

"شاہی میں اس دولت پر لعنت بھیجتی ہوں ـــ دل کی دولت تو تمہارے حصّے میں آئی ہے ـــ مانگو ـــ!"

"دوگی نا ـــ؟" شہاب کی آواز ہلکی سے خوشی سے کانپ اٹھی۔

"دوں گی ـــ!" آواز میں ایک بغاوت سر اٹھا رہی تھی۔

"میری محبت مجھے واپس لوٹا دو ـــ اور تم اس در سے میری محبت کا بوجھ اٹھا کر نہیں بلکہ کامران کی محبت ساتھ لیکر جاؤ گی ـــ!

"اور کچھ ـــ؟"

تمہاری آنکھوں میں میں کبھی آنسو نہ دیکھوں ـــ؟

"کس حق کی بناء پر یہ بات کہہ رہے ہو ـــ؟ عاطفہ نے پھر تیر چھوڑا۔

"کوئی حق نہیں عاطفہ ایک التجا ہے ـــ

"اور کچھ ـــ!"

"خوش رہا کرنا ـــ بہت خوش ـــ تمہیں خدا نے رونے کے لئے پیدا نہیں کیا ـــ!"

عاطفہ

"اور کچھ ـــــ"!

ماضی کو کسی گہرے گڑھے میں دفن کر دینا ـ نفرتوں سے اس گڑھے کو اتنے زور سے دبا نا مگر نہ بند کرنا ـــــ کہ اگر کبھی یادوں نے فرار کی راہ دکھائی تو سوائے "تلخ یادوں کے وہاں کچھ بھی نہ ہو ـــــ!"

"اور کچھ ـــ"!

"بس یہی کچھ کہنا تھا ـــ اتنا ہی تم مان لو ـــــ تو میں دکھوں کے اندھیروں میں ڈوب جاؤں گا۔"

"ایک جاتے جاتے میری یہ التجا پوری کر دو ـــــ"!

شہاب کی زبان مانگو کہتے کہتے لڑکھڑا سی گئی ـ کہیں عاطفہ نے وہ کچھ مانگا۔ جو وہ دے نہ سکا ـ تو زبان کا پاس بھی چلا جائے گا۔" ڈر گئے مرد ہو نا ـــــ"!

"مانگو ـــــ لیکن میری حیثیت دیکھ کر مانگنا عطی ـ"!

"جس روز مجھے دلہن بنایا جائے گا ـــــ سب سے پہلے تم نے میری شکل دیکھنی ہے ـــ!"

"یہ کیسے ممکن ہے ـــ؟"

"تم حسب دستور مجبور ہو گے ـــــ اپنی ناکامی محرومی کے احساس کو لئے روتے رہو گے ـــ دوسرا شان سے تمہارا حق لے کر اڑ جائے گا۔ مجھ میں جرأت ہے ـــ اس غاصب سے مقابلہ کرنے کی ـــ میں خود تمہارے

کمرے میں آؤں گی۔"!

"عطی ___ عطی ___ خدارا مجھے پاگل نہ کرو ___"!

"مجھے پاگل بنایا ___ خود ہوش میں رہنا چاہتے ہو۔" عاطقہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"میں تو خود ہوش و خرد سے بیگانہ ہوا چاہتا ہوں ___"

"تو بس میری یہ بات ماننا ہوگی۔"

"مگر کیسے ___؟"

"اس کی تم پرواہ نہ کرو۔ صرف وعدہ کرو ___"!

"مجھے تمہاری عزت ہر حال میں عزیز ہے۔ عطی ___"!

"دلہن کو دیکھنے کا تو ہر کوئی مشتاق ہوتا ہے۔ شاہی۔ اور تم دامن بچا رہے ہو ___"!

"میرا شوق ___ میرا جنون۔ سب کچھ ختم ہو چکا ہے ___ عطی ___"!

"میں خود پاگل ہو چکی ہوں شاہی ___"!

یکبارگی ___ شہاب نے اسے اٹھایا ___ اور اپنے بیقرار بے چین مضطرب سے سینے سے لگا لیا۔ مگر فوراً ہی جدا کرتے ہوئے کہا۔

"عطی ___ میں تمہاری ہر خواہش کو پورا کروں گا۔ میں تمہیں مزید کسی دُکھ سے دوچار نہ ہونے دوں گا۔ مگر تمہیں میری ایک ایک خواہش کو پورا کرنا ہوگا۔"

"مجھے بھی منظور ہے۔"

عاطقہ

"اب تم جاؤ ــــ!"

"اپنے دل سے نکالتے ہو ــــ"

شہاب لاجواب ہوگیا۔ "کوئی آجائے گا ــــ؟"

"آجائے ــ!"

علی تم تو بڑی اچھی تھیں ــــ یہ ضد کب سے سیکھی ــــ؟"

"تمہیں معلوم ہے کہ بچہ ضدی کب بنتا ہے ــــ؟ میرے گھر آیا کروگے نا۔

شابی ــ پھول لیکر ضرور آیا کرو ــــ نرگس کے زرد زرد سے پھول ــ جو مجھے

بے حد پسند ہیں ــــ!"

"اب جاؤ ــــ"

مجھے دروازے تک چھوڑ آؤ ــــ

ضدی عاطفہ بپھری ہوئی تھی۔ شہاب کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اور وہ

اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اُس کی خوشبو سے مہکتا ہوا وجود ــــ اب

اسے محسوس ہوا ــــ اسکے اپنے سینے میں سانس گھٹنے لگا۔ اب پھر عاطفہ اس

کے سینے سے لگی سسک سسک کر رو دی۔ یہاں تک کہ اسے اپنے کالروں

پر اس کے آنسوؤں کی نمی سی محسوس ہونے لگی۔ اس نے تڑپتے ہوئے دل سے

اس کی مہکتی ہوئی زلفوں کو سنوارا۔ اور گھمبیر آواز میں کہا ــــ:

"عطی وہ انسان امر بن جاتا ہے۔ جب وہ ایثار و قربانی کو اپناتا ہے

ہر دم اپنے خدا سے صبر کی دعا مانگا کرو۔"

عاطفہ

عاطفہ نے سوگوار انداز میں اسے دیکھا۔ اس کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں کے پاس لے گئی۔ اور آنسوؤں کے کئی قطرے ــ ایکدم ــ برسنے لگے ــ!

"وعدہ یاد کرو۔"

"اس کمرے کی چار دیواری میں کوئی قانون لاگو نہیں۔"

کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی ــ ایک ہلکی سی سرگوشی ابھری۔ عاطفہ

"امی اور خالہ آگئی ہیں ــ!"

"جاؤ عطی ـــــ خدا تمہارا محافظ و نگہبان ہے۔"

"شاب ـــ شابی" کہہ کر ایک بار پھر وہ اس کے قدموں میں جھکی ہاتھوں سے اس کے قدموں کو چھوا۔ پھر وہی ہاتھ احترام سے آنکھوں تک لے گئی ـــ اور ایک جھٹکے کے ساتھ باہر نکل گئی۔

"خدا تمہیں خوشیاں دے۔"

خدا تمہیں دلی سکون بخشے۔"

صبر و شکیب کی دیواریں کانپنے لگیں ـــــ اور ایک مرد ـــ جو ایک کمزور عورت کے سامنے اپنی مردانگی کی شان سنبھالے ہوئے تھا۔ سسک سسک کر رو دیا۔

عاطفہ کی دیوانگی بار بار اس کے قدموں کو چھونا..... اس کے دل کو مٹھی میں لے رہا تھا ــ ہاتھوں ـــ کالر پر اس کے آنسوؤں

عاطفہ

کی بُنی صاف محسوس ہو رہی تھی ـــــ غلطی ہم دونوں ـــــ حالات کی چکی میں پس گئے ہیں۔

طبیعت کی خرابی کے باعث وہ باہر بالکل نہ نکلا ـــ ساری رات کروٹیں لیتے ـــ سگرٹیں پھونکتے ـــ اپنا سینہ جلاتے گذر گئی ـــ اس غم میں ایک اور ہستی بھی شامل تھی اور وہ عاطفہ کے سوا کون ہو سکتی تھی۔

شادی کی رسومات مکمل ہو چکی تھیں - عاطفہ کو مکمل گوشہ نشین ہونا پڑا۔ ڈھولک کی تاپ پر کنوارے گیتوں نے ہلچل مچا رکھی تھی - ساری حویلی دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی ـــــ شوخ و چنچل لڑکیوں کے قہقہے ـــــ ریشمی سرسراتے ہوئے آنچل رنگ و بو کے جھلملاتے ہوئے سیلاب میں ہر کوئی ڈوبا ہوا تھا۔ شہاب آنکھیں بند کئے ـــــ اپنے فرائض کو نبھائے چلا جا رہا تھا۔ مایوں کی رسم کے بعد مہندی کی رسم منائی گئی ـــــ قہقہے گیتوں۔ اُبٹن اور مہندی کی خوشبو نے مل کر ـــــ کنواری دھڑکنوں میں ایک ہل چل سی مچا دی تھی ـــــ برات آچکی تھی ـــــ نکاح کا وقت بھی آگیا ـــــ اور چپکے سے آنسوؤں ـــــ اور آہوں کے درمیان عاطفہ ـــــ اور کامران کے درمیان شریعت نے ایک ایسا مضبوط بندھن باندھ دیا ـــــ جسے توڑنا کسی بھی مشرقی لڑکی کے دائرہ اختیار میں نہیں - کھانے کا دور شروع ہو چکا تھا ـــــ قہقہے۔ مذاق ـــــ ریکارڈنگ

کا شور ڈھولک کی آواز ــــــ سرسراتے ــــــ آنچلوں کی سرگوشیاں ــ بدست خوشبوئیں بکھیرتی ہوئی شوخ حسینائیں ــــــ بڑی عمر کی عورتوں کا لڑکیوں کا بھرپور جائزہ لینا ــــ پھر پراسرار سی مسکراہٹ کا نمودار ہونا اور پھر ساتھ بیٹھی ہوئی عورتوں سے اس لڑکی کے بارے میں معلومات لینا ــــ!

عاطفہ کو دلہن بنایا جا چکا تھا۔ سرخ سوٹ پر گوٹے کناری کا بھرپور کام کیا ہوا تھا۔ سرخ ما جال کا دوپٹہ ــــ جس پر لپہّ اور کرن اس کے چہرے پر ہالہ کئے ہوئے تھے۔ اور اس کا چاند سا مکھڑا ــــ اس سرخ زر تار دوپٹے کی اوٹ میں جگمگا رہا تھا۔ بھیگی بھیگی پلکیں لرز رہی تھیں۔ چہرہ پہ ہلکا ہلکا سا میک اپ کیا ہوا تھا ــــ جس سے اس کا معصوم حسن اور قیامت ڈھا رہا تھا۔ نازک نازک ہاتھ جس پر سرخ سرخ سی مہندی عجیب سی مہکیلی خوشبو چھوڑ رہی تھی۔ انگلیاں قیمتی انگشتریوں سے جگمگا رہی تھیں۔ مانگ میں افشاں لگائی تھی۔ سارا زیور پہنایا گیا۔ دلہن کے گرد شوخ سی خوشبو نے ایک مدھر سا شرمیلا احساس بخش دیا۔ سرخ رنگ کے گاؤ تکیے کے سہارے وہ جھکی جھکی سی بیٹھی ہوئی تھی ــــ اس کی سکھیاں اسے دلہن بنا چکی تھیں ــ باہر دلہن دیکھنے کے اشتیاق میں بہت سی نوعمر لڑکیاں کھانے پینے کے ہنگامے کو بھول کر کھڑکیوں دروازوں سے لگی کھڑی تھیں ــــ ثوبیہ ــــ اور عاطفہ سرگوشی میں باتیں کر رہی تھیں۔

عاطفہ نے آہستہ سے کہا۔

"ثوبی۔ ان سب کو کچھ دیر کے لیئے باہر تو نکالو ــــ؟

عاطفہ

"کوئی خاص بات — ؟"

"ہاں —— !"

"وہ کیا —— ؟"

"صرف دو منٹ کے لئے شہاب کو کسی نہ کسی بہانے یہاں لانا ہوگا۔"

"عاطفہ دنیا کی نگاہوں کا اس وقت تم مرکز بنی ہوئی ہو۔ خطرات کو مول نہ لو۔ مجھے مشورہ دینے کی ضرورت نہیں —" صرف اتنا کہو —— کہ تم میری مدد کر سکتی ہو یا نہیں —— ؟"

"ایک صورت ہیں ——"

"وہ کیا —— ؟"

"تم غسل خانے کے بہانے ابو کے کمرے تک چلو۔"

"ابو کے کمرے کے سامنے ملحقہ غسل خانہ ہے نا —— وہاں تمہیں شہاب کمرے میں ملے گا۔ صرف دو منٹ کے لئے —— تم غسل خانے میں چلی جانا —— اور وہ دوسرے کمرے سے باہر نکل جائے گا۔"

"اچھی ثوبی —— آخری التجا پوری کرنے کا شکریہ —!"

"عاطفہ دیر نہ لگانا —— لوگ تمہیں دیکھنے کے مشتاق ہیں — اور ابھی دولہا اندر تشریف لا رہے ہیں۔ کچھ رسومات پوری کرنے کے لئے۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔" عاطفہ کی آواز خوشی سے کانپنے لگی۔

"ایک منٹ انتظار کرو —— میں شہاب کو وہاں پہنچا آؤں۔"

عاطفہ

اور عاطفہ نے جوشِ جذبات سے مغلوب ہو کر ثوبیہ کا ہاتھ چوم لیا۔ اور چلی گئی ۔۔ لڑکیاں اس کمرے میں بیٹھی رہیں ۔ عاطفہ کو چھیڑتی رہیں۔ عاطفہ تو اس وقت خود کسی حسین تصوّر کی بجائے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی معصوم چہرے پر یہ سوچ کی گہری لکیریں واضح تھیں۔ گھونگھٹ کی اوٹ میں اس کی حسین آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس نے سکھیوں کے کوئی ریمارکس نہ سنے ۔۔۔ اس دنیا میں ہوتی تو سنتی ۔۔۔ اتنے میں ثوبیہ نے اس کے کان میں کچھ سرگوشی کی ۔ دلہن کے وجود میں زندگی کی ایک رمق دوڑی اور وہ خوشی سے ایکدم کھڑی ہو گئی ۔۔ سامنے آئینے میں اپنا قیامت خیز حسن دیکھ کر ۔۔ وہ مبہوت سی رہ گئی ۔۔۔

" دُولہا دیکھے گا ۔۔۔ تو اپنی قسمت پر رشک ہی کرتا رہ جائے گا۔"

"اپنے دولہا ہی سے تو ملنے جا رہی ہوں ۔۔"! عاطفہ دھیرے دھیرے بڑبڑائی ۔۔!

"ارے ۔۔ گونگی دولہن بھی کچھ فرمانے لگی ۔۔!"

"اور وہ سب کھلکھلا کر ہنس دیں ۔۔!"

ثوبیہ نے اس کے گرد ۔۔۔ ایک بستر کی رنگین سی چادر لپیٹی۔ شمہ جھٹ کہنے لگی "۔ کہاں کا ارادہ ہے ۔۔؟"

"ابھی تو رخصتی میں کچھ دیر باقی ہے ۔۔"!

زبردست قہقہے اٹھے ۔۔۔ ثوبیہ نے آہستہ سے کہا۔

"ذرا غسل خانے تک جا رہی ہیں —— یہاں کا دروازہ بند ہی رہنے دینا۔ ورنہ ساری دنیا غسل خانے کی طرف دھاوا بول دے گی۔"

"اچھا حضور —— کوئی اور حکم ——!" نسرین فوراً بول اٹھی۔ "فی الحال تو ہم اس حکم کو بجا لاؤں۔ پھر آ کر کوئی اور کام دیا جائے گا۔" عاطفہ بولی

"سبحان تیری قدرت...... سبحان تیری قدرت —— بے زبانوں کو زبان بخشنے والے ——!" شہانہ نے عجیب طریقے سے منہ بنا کر ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا ——

اور ایک بار پھر —— زبردست قہقہوں کے شور میں ثوبیہ درمیان کے کمرے کا دروازہ کھول کر —— دلہن کو نکال کر لے گئی —— وہ سہمی سہمی —— سی چلتی رہی —— پھر راہداری سے گذر کر اتو کے کمرے کی طرف جانا تھا —— ثوبیہ باہر نکلیں —— چاروں طرف عورتیں بچے —— لڑکیاں ہی نظر آئیں۔

"بڑا رش ہے —— بات کا بتنگڑ نہ بن جائے۔" ثوبیہ نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"تم فکر نہ کرو ثوبی —— سب بات مجھ پر چھوڑ دو ——!"

"بدنامی کے داغ کو کیسے مٹا سکو گی ——؟"

"میں شہاب کے نام کے لگے ہوئے ہر داغ کو اپنے سینے پر سجانا چاہتی ہوں۔!" عاطفہ نے دیدہ دلیری سے کہا۔

ثوبیہ لاجواب ہوگئی اور عاطفہ کا ہاتھ پکڑ کر راہداری کا کچھ ٹکڑا طے کیا ہی تھا ـــــ کہ امی مل گئیں ـــــ

"کہاں لے جا رہی ہو اسے ـــــ"؟

غسل خانے ـــــ ثوبیہ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اتنی دور کے غسل خانے میں لانے کی کیا ضرورت تھی ـــــ؟ زنانہ طرف کے غسل خانے کی طرف لے جاؤ ـــــ"! مسز آصف نے مشکوک نظروں سے کہا ـــــ "امی اب تو آچکی ہوں ـــــ!"

"عورتوں کے سامنے غسل خانے جانا کچھ معیوب سا لگتا ہے ـــــ" ماں نے کہا ـــــ خالہ جان پھر ـــــ!

"پھر واپس جاؤ ـــــ" مسز آصف نے قدرے رعب دار آواز میں کہا۔

چلو عاطفہ اور دونوں بادلِ نخواستہ واپس گھوم کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں ـــــ مسز آصف کے دل میں ایک نامعلوم سا خدشہ پیدا ہو چکا تھا۔ وہ یونہی آصف کے کمرے میں گئیں۔ تو دیکھا ـــــ شہاب سر جھکائے کسی گہری سوچ میں بیٹھا ہوا تھا ـــــ جہاں دیدہ نگاہیں پل بھر میں اس بات کی تہہ تک پہنچ گئیں ـــــ کہ یہاں کا غسل خانہ استعمال کرنے کا کیا مطلب تھا ـــــ؟

شادی کا گھر ـــــ سسرال والوں کی گہری نظریں ـــــ وہ دل ہی دل میں شکر ادا کرنے لگیں ـــــ کہ خدا نے ان کی لاج رکھ لی ـــــ

عاطفہ

شہاب نے اپنے سامنے مسز آصف کو دیکھا۔ تو محجوب سا ہو کر رہ گیا ـــــ :

"شہاب تم یہاں کیا کر رہے ہو"؟ مسز آصف نے تیکھی نظریں اس پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"امّی ـــــ میں ـــــ یہاں ـــــ کچھ ـــــ نہیں ـــــ کچھ بھی تو نہیں کرنے آیا ہوں ـــــ" شہاب ایکدم گھبرا سا گیا ـــــ

"جاؤ بیٹے تمہاری بہن کی شادی ہے ـــــ اس کے سسرال والے آئے ہوئے ہیں ـــــ تمہارا اس طرح چھپ کر بیٹھنا انہیں مشکوک بنا دے گا۔ عاطفہ کی عزت ـــــ تمہاری عزت ہے ـــــ بیٹے" مسز آصف نے لوہا گرم دیکھ کر ایسی چوٹ لگائی ـــــ کہ شہاب تلملا کر رہ گیا۔ اپنے جذبات پر اسے رونا آیا ـــــ مسز آصف ٹھیک ہی تو کہتی ہیں۔ اگر اس وقت عاطفہ پر کوئی بھی بدنامی کا دھبہ لگا۔ تو ساری زندگی کے لئے اس کی شرافت سر نہ اٹھا سکے گی۔ عزت کی چوٹ بڑی نامُراد ہوتی ہے۔ نظروں سے گرا ہوا انسان ساری زندگی نہیں اُٹھ سکتا۔ اعتماد کا شیشہ چور چور ہو جائے تو پیچھے کیا چیز باقی رہ جاتی ہے ـــــ اسے اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ ندامت سے سر جھکائے باہر نکل گیا۔ پیشانی پر ندامت کے ننھے ننھے سے قطرے نمودار ہونے لگے۔ دل میں شرم اور ندامت نے طوفان برپا کر دیا۔ اور مردانے کمرے میں

چلا گیا ۔۔۔ اپنی حالت وہ اس مجرم کی طرح سمجھنے لگا۔ جیسے چوری کرتے ہوئے موقع پر پکڑا جائے ۔۔۔ چہکتی ہوئی بلبل تڑپتی ۔۔۔ آنکھوں سے برسات برساتی ہوئی ۔۔۔ دھم سے اپنی جگہ پر دوبارہ آکر بیٹھ گئی ۔۔۔ شدت گریہ نے اس کا سارا میک اپ خراب کر دیا ۔۔۔ ثوبیہ سمجھا سمجھا کر تھکی ۔۔۔ مگر پاگل منوا کسی طرح بھی نہ مانا ۔۔۔ دولہا کو اندر لایا گیا۔ دلہن کے ساتھ بٹھانے کی تیاریاں شروع ...... اور رونمائی کی رسم ادا کی جانے والی تھی ۔۔۔ مگر عاطقہ کی ایک ہی ضد "کہ مجھے اگر دنیا کا کوئی مرد دلہن کے روپ میں دیکھے گا ۔۔۔ تو وہ سوائے شہاب کے اور کوئی نہ ہوگا ۔۔۔"

ثوبیہ سہم کر رہ گئی ۔۔۔ ضد بغاوت بھی بن سکتی ہے ۔۔۔ اور بغاوت انتقام پر بھی اتر سکتی ہے ۔۔۔ بیچاری ہمدرد لڑکی گھبرا گئی ۔۔۔ ایکدم ایک تجویز ذہن میں آئی ۔۔۔ کہ سلام کرائی کی رسم شروع ہے۔ شہاب کا کہیں نام و نشان نہیں ۔۔۔ اسے اس موقعہ کے بہانے یہاں لاکر عاطقہ کی ضد پوری کی جا سکتی ہے ۔۔۔ اس نے عاطقہ کے کان میں کچھ کہا، روتے ہوئے چہرے پر سکون کی لہریں بکھر گئیں ۔۔۔ بھیگی بھیگی پلکیں کانپنے لگیں ... چہرہ رو رو کر ایسا نکھر چکا تھا ۔۔۔ جیسے بارش کے بعد آسمان ۔۔۔ چمکنے لگتا ہے باہر سناٹا سا چھائی گئی ۔ دولہا پہلے سے بیٹھا تھا۔ دلہن کو لایا گیا۔ دھیرے دھیرے قدموں سے چلتی ہوئی خموشی سے ایسے بیٹھ

گئی ۔ جیسے وہ موم کی گڑیا ہو ؟

انجم صدقے پر صدقہ اتار رہی تھیں ۔۔ تمام لوگ اس کی ذہانت ۔۔ اس کی محبت پر رشک کر رہے تھے ۔ کہ بیٹے کی ایسی شاندار بری بنائی ہے کہ روپ نگر میں کوئی ایسی بری لے کر نہیں آیا ۔۔ ایک سے ایک بھاری جوڑا ۔۔ اور پھر ان پر شاندار کام ۔۔ زیورات کے سیٹ جدید طریق کے ۔۔ جسے ہر نئی نئی لڑکی خوشی سے پہن لے ۔ آرسی مصحف کے لئے بڑا سا آئینہ لایا جا چکا تھا ۔ مگر عاطفہ منہ پر اپنا سرخ ریشمی رومال رکھے ۔۔ جھکی بیٹھی تھی ۔۔ رسم شروع ہو چکی تھی ۔۔ مگر عاطفہ منہ پر سے رومال ہٹانے کے لئے ۔ گر تیار نہ تھی ۔۔ کامران اسے بھی اِک ادا سمجھا ۔ اور ایک میٹھی مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتا ہوا بولا ۔۔ میں کب سے رُخ زیبا کے دیدار کا پیاسا ہوں ۔ ۔ سرخ سرسراتے کپڑوں میں ایک ہلکی سی جنبش ہوئی اور رومال کو مضبوطی سے ہتھیلیوں پر پھیلا کر چہرے پر رکھ دیا ۔ کہ اتنے میں ثوبیہ سُرخ بھیگی بھیگی آنکھیں لئے ۔۔ دلہن کے قریب آگئی ۔ اور اس کے کان میں آہستہ سے کچھ کہا ۔

وہ عاطفہ کی ضد کو بخوبی جانتی تھی ۔۔ ثوبیہ باجی آپ ہی سفارش کر دیجئے ۔

کامران نے التجائیہ انداز میں کہا ۔

عاطفہ آنکھیں کھولو ۔۔ تمہارا دیوانہ آ گیا ۔" ثوبیہ نے درد سے کہا ۔

عاطفہ

عاطفہ کے ہاتھوں میں لرزش پیدا ہوئی — رومال خود بخود دامن میں جاگرا...... کامران آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ اور عاطفہ سامنے کی طرف پریشان پریشان سا شہاب — کھویا کھویا سا شہاب۔ چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی — ہونٹوں پر دبی ہو فریادیں — آنکھوں پر بے بسی اور حسرت کے مزاروں — کی جلتی ہوئی شمعیں......!

اور شہاب جسے تو ہیر ہزاروں قسمیں دیکر باغ کے کونے میں بیٹھے ہوئے اٹھاکر لائی۔ کامران کے پیچھے اسے کھڑا کر دیا — اور عاطفہ کے کان میں اس کے کھڑے ہونے کا زاویہ بتلا دیا — رومال سر سرایا — کامران کی دنیا میں ہلچل مچ گئی — وہ بے ساختہ — آئینے کی طرف جھکا۔ شہاب کی آنکھوں نے کیا دیکھا —؟ کیا محسوس کیا —؟ موسم بہار کی ایک آدھ کلی کھلی — شبنم کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھی — سرخ سرخ سے ریشمی کپڑوں ملبوس قیمتی زیورات پہنے — مانگ میں افشاں سجائے — چہرے پر آنسوؤں کی شمعیں جلائے مستور م آنکھوں میں حسرتوں۔ ناکامیوں۔ بربادیوں کی دھول اڑ رہی تھی۔ کھوئی کھوئی سی عاطفہ ہمیشہ سے کہیں زیادہ حسین نظر آرہی تھی۔ اچانک — شہاب کی نظر آئینے پر پڑی — ایک دم روح کو جھٹکا سا لگا — ہوش و حواس کو سنبھالا — اور مسکراتے ہوئے جیب سے ایک لفافہ نکال کر کامران کو سلام کرائی کے انعام میں دیا — اور دوسری جیب سے ایک خوبصورت مخملیں ڈبہ نکال کر عاطفہ کی طرف بڑھایا

عاطفہ:

"تمہارے لائق تو نہیں ــــــ مگر عزیب جان کر اسے ٹھکرانا نہیں ــ"

اس کی آواز رندھ گئی ــــ آنکھوں میں نمی سی تیر گئی ــــ اور وہ جلدی سے پیچھے کی طرف مڑا ــــ اور ہجوم میں گم ہو کر رہ گیا ــــ چاروں طرف سے لڑکیاں چلا رہی تھیں ــــ "ہائے اللہ بھیا نے کتنا خوبصورت تحفہ بہن کو دیا ہے"

"اصلی ہیروں کا ہے ــ" دوسری نے کہا۔

عاطفہ کامران کی قربت سے بے نیاز ــ سیٹ پر نظریں جمائے بیٹھی ہوئی تھی۔ دل کی حسرتوں کا جذبہ نقشہ شہاب نے کس چابکدستی سے کھینچا۔ عاطفہ کا دل چاہا ــــ کہ وہ اپنے پہنے ہوئے سارے زیورات صحن میں اٹھا اٹھا کر پھینک دے ــ اور صرف یہی سیٹ ــــ صرف یہی سیٹ پہن کر ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند سو جائے۔

لڑکیاں تنگ کر رہی تھیں۔ کہ کامران بھی سالے کا تحفہ دکھائے۔ کامران عاطفہ کی بدلتی ہوئی حالت گہرائی کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بڑی لاپرواہی سے لڑکیوں کی طرف ــ اس کا دیا ہوا تحفہ اچھالا۔

"لیجئے سرکار ــ! آپ کھول کر تسلی کر لیجئے ــــ کہ عزیب کیا دے سکتا ہے ــ؟"

لہجے کا طنز عاطفہ کے جگر کے آر پار ہو گیا ــــ اس نے بے لبی سے کامران کی طرف دیکھا...... جیسے پوچھ رہی ہو ــــ کہ تمہیں میرے شہاب کا مذاق اڑانے کا حق کس نے دیا ہے ــــ؟ مگر کامران عاطفہ کو متوجہ پا کر

عاطفہ

لڑکیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"ارے۔ اس میں تو اس کاغذ کے سوا کچھ بھی نہیں ۔۔۔؟"

"وہ غریب کا امتحان کس طرح ہوگا۔؟ دنیا کی نگاہ میں دھول جھونک گیا۔!"۔ کامران نے کٹتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بھیا شہاب دھوکہ کھا سکتا ہے۔ دھوکہ دے نہیں سکتا۔۔۔"

ثوبیہ نے بھیگی بھیگی پلکیں اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ارے ارے ۔۔۔ یہاں تو ہماری باجی بھی ان کی وکیل صفائی موجود ہیں ۔۔۔!" کامران نے بظاہر ہنستے ہوئے کہا۔ لاؤ نازنین یہ کاغذ مجھے دکھاؤ"

.... ثوبیہ نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"فیض نگر کی مل ۔۔۔ اور جام نگر کا ڈاک بنگلہ ۔۔۔ جو ابّو مرحوم نے میرے نام لکھا ۔۔۔ میں اسے باہوش وحواس اپنے پیارے لیکن بہت ہی عزیز، کامران ولد رضوان کے نام کر رہا ہوں ۔۔۔" اور ساتھ ہی ایک چھوٹا سا پرزہ نتھی تھا ۔۔۔!

عزیزہ کامران ۔ تمہیں دینے کے لئے اپنی جان سے قیمتی کوئی شئے نظر نہیں آتی ۔۔۔ مگر پھر سوچتا ہوں کہ غریبوں کی جان بھی اتنی ارزاں ہوگی ۔۔۔ جتنا ان کی عزت ہوتی ہے ۔ تہی دامن ہوں .... کچھ بھی تو نہیں دینے کے لئے ۔۔۔ اندھیرے میں امید کی کرن چمکی ۔ خدا ابو مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے ۔۔۔ آج ایک غریب کو سرخرو کر دیا ۔ (شہاب)

عاطفہ

جنگل کی آگ کی طرح شہاب کے تحفے کا چرچا ہر زبان پر ہونے لگا
فرحت نے شکست خوردہ کی نگاہوں سے بہن کی طرف دیکھا۔ اور بہن
نے ندامت سے آنکھیں جھکا لیں ——— ثوبیہ کی آنکھیں برسنے لگیں۔ عاطفہ بت
سی بن گئی ——— کامران کو اپنی شکست کا احساس اور ہونے لگا۔ کہ آخری
موڑ پر بھی وہ میرے منہ پر تھپڑ مار گیا ——— انجم نمناک آنکھوں سے سارے
ڈرامے کو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں ——— اس سارے ماحول میں شریک پہاڑی
لڑکی ایک تماشائی بنی سبھوں کو ٹک ٹک دیکھ رہی تھی ——— اور اسعد کی
بیوی زلیخا ——— کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی بہت کچھ سمجھ گئی...... وہ دونوں
اس قدر رنجیدہ اور اداس تھیں ——— دونوں سر جھکائے۔ ایک ہی بات
سوچ رہی تھیں۔

ایسے تنگ نظر ماحول میں یہ رہ کیوں رہا ہے ———؟

رسومات ختم ہو چکی تھیں ——— رخصتی رخصتی کا شور مچا ہوا تھا ———
سامان سے ٹرک کے ٹرک لاد کر چاند نگر جا رہے تھے۔ لوگوں کی نظریں حیرت
و استعجاب سے جہیز پر لگی ہوئی تھیں ——— ہر ماں کا دل دھڑک رہا ہے۔ جہیز
کے انباروں کو دیکھ کر کئی سوچیں ان کے ذہنوں میں ابھر رہی تھیں۔ کہ ساری زندگی
ہر خوشی کو قربان بھی کر دیں ——— تو اپنا سارا جہیز اکٹھا نہیں کر سکتیں ——— ایک
سرمایہ دار کی لڑکی ——— تو معاشرے میں اپنی دولت کی بنا پر مقام حاصل
کر لیتی ہے ——— مگر ایک درمیانے طبقے کی لڑکی ——— نہ تو اپنی سیرت

نہ اپنی صورت اور نہ ہی کسی اور قابلیت کی بنا پر سسرال میں اپنا مقام بنا سکتی ہے..... چوبیس گھنٹے طعنوں تشنوں میں گذر جاتے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے جس کا جی چاہا۔ ذلیل کر دیا۔ شوہر تو اسے بالکل موم کی گڑیا سمجھتا ہے۔ جو اس کی تلخ باتیں بھی سنے اسکے عزیز و اقارب کے جلتے ہوئے فقروں کے انگارے بھی اپنے سینے پر رکھتی جائے۔ ان کی نفرتوں کے تیروں کو سہمی ہوئی نظروں سے سنبھالتی جائے۔ کچھ نہ بولے۔ کچھ نہ کہے۔ خاموش رہے بے زبان بن جائے۔ تو پھر گذارا ہے۔ ورنہ علیحدگی کی دھمکی تو آج کل عام دی جا رہی ہے۔ جس نے اس دھمکی کو قبول کیا۔ وہ ہمیشہ ایک داغدار ماضی لیکر میکے بیٹھ جائے گی۔

اور جو اس دھمکی پر روح ذہن دل سبھوں کو مجروح کرتا رہا۔ وہ انشاءاللہ بہت جلد ملک کے کسی نہ کسی سنٹوریم کو آباد کرے گا۔ الوداعی دھنیں ـــــ لڑکی کو اس کے ماحول سے مخصوص انداز میں رخصت کر رہی تھیں۔ چنچل شوخ لڑکیاں مرجھا سی گئیں۔ افسردہ افسردہ سی وہ دلہن کو گھیرے ہوئے تھیں۔ بہت سی آنکھیں نم ناک ہو رہی تھیں ـــــ عاطقہ نے شہاب کو جب سے دیکھا تھا۔ اپنی آخری تمنا بھی پوری کر لی ـــ اب وہ اس خطرناک ارادے کی تکمیل کرنا چاہتی تھی جس کے لئے وہ خواب آور گولیاں لائی تھی۔ اس نے وہ شیشی اسونت

اپنے پرس میں ایک خوبصورت سے دستی رومال میں چھپا رکھی تھی۔ اس نے ثوبیہ کے کان میں کچھ کہا۔ وہ اسے اس کے کمرے تک لائی۔ پانی کا ایک گلاس منگوایا۔

"ٹھہرو عاطفہ ——— میں اس میں تھوڑا سا گلوکوز ملا دوں۔۔۔ رو رو کر تم نے اپنی بڑی حالت کر رکھی ہے۔ ؟"

ثوبی گلوکوز شاید ابّو کے کمرے کی الماری سے تمہیں ملے گا۔

عاطفہ اسے کمرے سے باہر بھجوانا چاہتی تھی۔ تاکہ وہ خموشی خموشی سے اپنے ارادے کی تکمیل کرے۔

ثوبیہ بیچاری خود غموں سے نڈھال ہو چکی تھی۔ درمیان کا دروازہ کھول کر خالو کے کمرے سے گلوکوز کا ڈبہ لانے کے لئے چلی گئی۔ عاطفہ نے موقع غنیمت جانا۔ جھٹ ننھی سی شیشی نکالی۔ ایک بار ہاتھ کانپ کر رہ گیا ——— خون کی گردش تیز ہو گئی ——— آنکھوں کے سامنے کئی بے بسی کے مزار ——— مٹی کے ڈھیر سے گھوم گئے۔ اسی حسرت سے اپنے سرخ کپڑوں کی طرف دیکھا ——— برستی ہوئی آنکھوں سے شیشی کھولی۔ ہتھیلی پر دس بارہ گولیاں رکھیں ——— اور یہ کہہ کر زبان پر رکھ لیں۔

شابی اگر غلطی تمہاری نہیں ——— تو کسی اور کی بھی نہ ہو سکے گی۔ اوپر سے پانی کا گلاس غٹا غٹ کر کے پی گئی ——— جلدی سے شیشی بند کی۔ اور شیشی کو اپنے ٹرنک کے کپڑوں کے نیچے چھپا دیا۔ اسنے اپنا صبر

گھومتا محسوس ہوا۔ اتنے میں ثوبیہ آگئی ــــ کہ گلوگوز نہیں ملا۔ عاطفہ نے آہستگی سے کہا ـــ" اب فکر نہ کرو ثوبی ـــــ ہر قسم کا اضطراب ختم ہو جائے گا۔"

" خدا کرے ـــ" ثوبیہ نے معصومیت سے کہا۔

دروازہ پیٹا جا رہا تھا ـــ عاطفہ نے حسرت و نامرادی سے سارے کمرے کا جائزہ لیا ـــ جس کے ساتھ اس کے حسین ماضی کی یادگاریں وابستہ تھیں ـــ اس کے صبیح رخساروں پر شبنم کے قطرے کانپ رہے تھے۔ دروازہ کھل چکا تھا ـــ مسز آصف، ثوبی کی امّی ـــ اس کی بھابی سب رو رو کر اسے نصیحتیں کر رہی تھیں ـــ باہر سے رخصتی کا شور بلند ہو رہا تھا۔ شہاب کو لایا گیا ـــ کہ وہ اس وقت باپ اور بھائی کے فرائض سنبھالے۔ شہاب کا سارا وجود کانپ رہا تھا۔ اس نے اسے کندھوں سے تھام کر کامران کی سجی ہوئی کار میں بٹھانے لگا ـــ تو وہ اس کے کندھوں پر سر ٹیک کر سسک سسک کر رو دی۔

اس نے دھندلی آنکھوں سے ایک بار پھر اپنے شہاب کو دیکھا ـــ شہاب اسے کامران کے پاس بٹھا کر جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور وہ بازوؤں میں چہرہ چھپا کر سسک پڑی۔ کامران نے ایک چلتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی ـــ اور لاپرواہی سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ تب شہنائی نے ایک دردناک دھن چھیڑ دی۔ کار آہستہ آہستہ

سر کنے لگی۔ مسز آصف پھوٹ پھوٹ کر رو دیں ـــــ ثوبیہ الگ سسک رہی تھی۔ شہاب تیزی سے اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ سارا ہنگامہ ساری گہما گہمی ایک دم سناٹے میں تبدیل ہو گئی

سارا راستہ عاطقہ بازوؤں میں منہ چھپائے بیٹھی رہی۔ کامران سگتے ذہن سے بہت کچھ سوچتا رہا۔ رضوان اور انجم تیزی سے اپنی کار ان سے آگے نکال کر گھر پہنچ چکے تھے۔

جب یہ لوگ گھر پہنچے ——— تو شام کا ملگجا اندھیرا چھا چکا تھا۔ ماحول پر عجب طرح کی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ ایک جھٹکے کے ساتھ کار رکی —— کامران لاپرواہی سے اترا۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا۔

"اتریئے آپ کا گھر آگیا ہے ...!" کامران نے کہا۔

عاطقہ کا دل بیٹھ رہا تھا۔ دماغ میں سنسناہٹ مچی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے کامران کی طرف دیکھا ——— وہ اُترنا چاہتی تھی۔ مگر اسے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے اس کے قدم من من کے ہوگئے ہوں۔ وہ لڑکھڑائے

لگی۔ اس سے پیشتر کہ وہ گر پڑے۔ کامران نے بڑی بے دردی سے اسے کندھوں سے پکڑا۔ اور سرگوشی کے انداز میں کہا محترمہ خود کو سنبھالئے۔ اپنا غم آپ اٹھانے سے بار ہلکا ہوگا۔"

دوسری طرف مکمل خاموشی۔

رضوان نے جلدی سے ایک صدقے کا بکرا ذبح کیا۔۔۔ انجم اور کامران کے سہارے سے اُسے اندر لایا گیا۔۔۔ شام ہو رہی تھی۔ مختصر سے لوگ تھے۔ عاطفہ کی طبیعت متلانے لگی۔۔ انجم اسے غسل خانے لے گئی۔ جہاں پیلی پیلی سی قے اسے آنے لگی۔۔۔۔ اسے اپنا دل ڈوبتا سا محسوس ہُوا۔

"غم کر کر کے تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔" انجم نے پیار سے اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر کو بلواؤں۔۔۔۔ تمہاری طبیعت زیادہ خراب نظر آ رہی ہے۔" انجم نے اس کے زرد چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے پھر کہا۔

"نہیں نہیں۔۔ امیّ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ ابھی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔" زرد ہوتی ہوئی عاطفہ کو جیسے کسی نے سنگین چبھو دی ہو۔

انجم اسے سہارا دیکر اس کے کمرے میں لے آئی۔

اس کی خواب گاہ...... اس کے ارمانوں کی سیج آج اس کے لئے قربان گاہ بن چکی تھی۔ یہ اجنبی اجنبی سا کمرہ.... یہ نیا نیا

سامان یہ شگفتہ سے نشیلے مہکتے ہوئے پھولوں کی سیج اسے کانٹوں سے بھری باڑ لگ رہی تھی۔ سرخ سرخ سے کپڑے اس کے ارمانوں کے خون میں رنگے نظر آرہے تھے۔ اسنے دیوانوں کی طرح ہر چیز کو دیکھا۔ اور چکراتے ہوئے سر کو مسہری سے ٹیک دیا کافی دیر وہ اسی طرح آنکھیں بند کئے لیٹی رہی۔ اور اسے ذرا سی اونگ آگئی ۔۔۔ کہ دھیرے دھیرے قدموں کی چاپ سنکر اسے دھیرے سے مستورم آنکھیں کھول دیں۔ یادوں کی دھڑکن آواز بن گئی۔

اس کا شہاب۔ سنہری اچکن پہنے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے دھیرے دھیرے قدموں سے آرہا ہے۔ ٹیوب لائیٹیں کی جگمگاتی روشنی میں وہ بالکل پرستان کا شہزادہ لگ رہا ہے۔

عاطفہ سنبھل گئی ۔۔۔ اپنا گھونگھٹ اور گہرا کر لیا۔ حنائی سفید ہاتھوں کو گھٹنوں کے گرد ہالہ سا بنا کر بیٹھ گئی۔ اُبٹن۔ مہندی۔ سنٹ اور کنوارے جسم کی مہکتی ہوئی نشیلی خوشبو نے کمرے میں ایک پراسرار خوابناک سا تاثر چھوڑا ہوا تھا ۔۔۔ اس نے سرخ زرتار دوپٹے کی اوٹ میں دیکھا۔

کہ وہ اپنی شیروانی کے بٹن کھول رہا ہے۔ پھولوں کے ہار اس نے بے دردی سے زمین پر دے مارے ۔۔۔ شیروانی کو پلنگ کی پائینتی کی طرف پھینکا ۔۔۔ اپنے سہرے کے پھولوں کو نوچ ڈالا ۔۔۔ عاطفہ

سہم گئی۔ خوابوں کے شیش محل چکنا چور ہو گئے —— خوابوں کی دنیا سے وہ حقیقت کی طرف لوٹ آئی۔

یہ شہاب نہیں —— کامران ہے —— اس کا شوہر۔ اس کا مجازی خدا —— شہاب تو کہیں دور اندھیروں میں دریچہ کھولے۔ کہنیاں ٹکائے —— سگریٹ پہ سگریٹ پھونک کر اپنا دلِ جلاتا ہوگا۔ اور اس بے وفا کو یاد کر کے اپنی قسمت کو کوستا ہوگا۔ اچانک ایک کرخت سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"محترمہ ... انتظار کرنے کی معافی چاہتا ہوں —— تم شریعت کی رو سے میری بیوی ضرور بن چکی ہو —— اور دنیا کی نگاہ میں میں تمہارا شوہر ضرور بن چکا ہوں —— مگر محترمہ —— اپنی تلخ نوائی پر معذرت نہیں کرنا چاہتا —— تمہارے اور میرے درمیان ہمیشہ اجنبیت اور بے نیازی کی دیوار حائل رہے گی۔ مجھے تم سے ذرا بھی لگاؤ نہیں —— والدین کا اصرار تھا —— بزرگوں کا قول تھا —— نبھا دیا —— تمہارے میرے راستے آج سے الگ ہیں —— تم خودمختار رہو —— اور میں کسی کی نگاہِ لطفِ کرم کا محتاج نہیں ہے"۔ اتنا کہہ کر کامران بیزاری سے اپنی مسہری پر لیٹ گیا —— اور اپنے سر تک کمبل کھینچا۔ اور کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی ——

عاطفہ کا سانس اوپر کا اوپر نیچے کا نیچے —— اسے نیم بے ہوشی

کے عالم میں ایسا معلوم ہوا ــــ جیسے منکر نکیر نے اسے پٹخ کر گرا دیا ہے۔ اور اس کے نازک احساس کا شیشہ چکنا چور کر دیا ہو۔ اسے اپنا حلق سوکھتا ہوا محسوس ہوا ــــ سینے میں دم گھٹتا محسوس ہوا۔ ٹیوب لائٹیں بجھا دی گئی تھیں۔ مارے پیاس کے ــــ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی ــــ آہستہ آہستہ اپنے پلنگ سے اتری ــــ اور چھوٹی تپائی کو تلاش کرنے لگیں ــــ جس پر انجم امّی۔ بلوریں صراحی میں پانی رکھ کر گئی تھیں۔ سر تو پہلے ہی چکرا رہا تھا۔ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارنے لگی۔ کہ اچانک پاؤں کی ٹھوکر سے تپائی الٹ گئی ــــ اور صراحی ایک چھناکے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر آ رہی ــــ!

کامران نے ناگواری سے ٹیبل لیمپ جلا دیا۔

"محترمہ کیوں تباہی پر تلی ہوئی ہیں ــــ؟"

"میں نے جان بوجھ کر نہیں توڑی ــــ؟"

"ویسے آپ جان بوجھ کر توڑنے کی عادی ہیں ــــ میری امّی مرحومہ کی قیمتی نشانی تم نے تباہ و برباد کر دی ــــ اب دیکھئے میرے گھر کی اور کیا کیا چیز تمہارے ہاتھوں برباد ہوتی ہے"، کامران نے سلگتے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں ــــ"؟

"اتنی مشکل زبان تو نہیں جسے سمجھ نہ سکیں۔"

اور عاطقہ کو بہت پہلے کا ایک واقعہ ایکدم یاد آگیا۔ جب کامران سے اس کا قیمتی گلدان ٹوٹا تھا ـــــ تو اس نے اس کا یہی حشر کیا تھا ـــــ جو وہ آج اس کا کر رہا ہے ـــــ اس کی آنکھیں پھر سے جھلملانے لگیں۔ اور وہ تڑپتے ہوئے اپنے بستر پر آگئی۔ اور کروٹ لیکر سسکنے لگی۔

"اے۔ محترمہ یہ رونا دھونا چھوڑیئے۔ میں نے صبح نوکری پر جانا ہے۔ کام والا آدمی ہوں ـــــ اگر اب ایک آواز بھی سنائی دی ـــــ تو میں اپنا بوریہ بستر لیکر یہاں سے جانے پر مجبور ہو جاؤں گا"۔ کامران نے بناوٹی رُعب سے آواز بناتے ہوئے کہا۔

حالانکہ اس وقت مجبور عاطقہ اسے ہمیشہ کی طرح بہت ہی پیاری لگی۔ جی چاہا کہ سارے گِلے شکوے ختم کر کے دونوں ہمیشہ کے لیئے ایک ہو جائیں۔ مگر عاطقہ کے رویّے نے اسے سخت رہنے پر مجبور رکھا۔

"نہیں نہیں یہاں سے نہ جایئے گا ـــــ میں کیا جواب دوں گی۔ میں بالکل نہیں روؤں گی ـــــ بالکل نہیں ـــــ!" اور کامران کو محسوس ہوا۔ جیسے وہ اپنے منہ پہ ہاتھ رکھ کر اپنی سسکیوں کو دبانے کی ناکام کوشش کر رہی ہیں۔

تلخ تلخ واقعات کے دوران زندگی کی ایک قیمتی رات گزر گئی۔ عاطقہ

کے ننھے ننھے خراٹے اس بات کے شاہد تھے ـــ کہ وہ سو گئی ہے۔ ایکبار کامران نے ٹیبل لیمپ جلا کر بھی دیکھا۔ سرخ سرخ رنگ کے کپڑوں میں ملبوس مانگ میں بکھری بکھری سی افشاں جس کے زرد چہرے کو تابناں کئے ہوئے تھے۔ موٹی موٹی سی آنکھیں۔ بھاری بھاری سے پپوٹے۔ اور بھیگے بھیگے سے رخسار ـــ رو رو کر رخسار گہرے سرخ ہو رہے تھے۔ ہونٹوں پر لگی ہوئی سرخی جو اتر بھی چکی تھی۔ بال بکھر کر تکیے پر پھیلے ہوئے تھے۔ سارا زیور سرہانے رکھا ہوا تھا۔ مہکی مہکی سی خوشبوؤں میں لپٹی وہ سو رہی تھی۔

عاطفہ ـــ! اسوقت تم خوابوں کے جزیرے میں اپنے خیالوں کے شہزادے کے ساتھ محو گلگشت ہو ـــ اور میں بدنصیب نیند سے کوسوں دور ـــ عاطفہ میں قسم کھاتا ہوں۔ کہ میں اسوقت تک تمہارے جسم کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ جب تک مجھے تمہاری محبت نہ مل جائے چاہے اس کے لئے ایک عمر ہی کیوں نہ گذر جائے ـــ!

اسنے ایک دلدوز آہ بھری ـــ بھرپور نظر دل سے اپنی محبوبہ کو دیکھا جسے بدلنے کے لئے اسے یہ نفسیاتی طریقہ اپنانا پڑا ! ـــ کہ جتنی نفرت دوں گا۔ اتنی اس کی آتش شوق بھڑکے گی۔ اور ایک دن اس نفرت کے لاوے سے محبت کا گلزار پھوٹے گا۔ جس میں کبھی خزاں کا گذر نہ ہوگا۔ حسین تصور کو لئے وہ لیمپ بجھا کر لیٹ گیا ـــ اور صبح کے موذن کی آواز سن کر

عاطفہ

وہ آہستہ سے کمرے کا دروازہ بھیڑ کر باہر نکل گیا۔

منہ اندھیرے ہی عاطفہ کی آنکھ کھل گئی ---- دماغ کو قدرے سکون محسوس ہوا۔ وہ آنکھیں کھولے --- اپنے چاروں طرف حیرت و استعجاب سے دیکھ رہی تھی۔ یہ کمرہ اس کا تو نہیں --- اس نے اپنے سرخ سلوٹوں والے جوڑے کی طرف دیکھا --- تو اسے یاد آیا --- کہ اس کی تو شادی ہو گئی تھی۔ الوداع ہونے کے وقت تو اس نے خواب آور گولیاں کھائی تھیں۔ اس جان لیوا دکھ سے کہیں زیادہ بہتر تھا۔ کہ ہمیشہ کی گہری نیند سو جاؤں۔

تو کیا گولیاں بے اثر ثابت ہوئیں --- !

میں شہاب کو ہمیشہ کے لئے کھو چکی --- !

کامران میرا شوہر بن جائے گا۔

ٹپ ٹپ شبنمی ستارے اس کی آنکھوں سے ٹوٹنے لگے۔ اس نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے پھر اپنے کمرے کا جائزہ لیا --- ساتھ والی مسہری خالی تھی --- اور پھر ایک دم رات کی کچھ باتیں یاد آ گئیں ---

"تمہارے میرے راستے آج سے الگ ہیں --- !"

"تمہارے میرے درمیان ہمیشہ اجنبیت کی دیواریں ہمیشہ حائل رہیں گی۔"

"اب اگر رونے کی آواز سنائی دی --- تو میں کمرہ چھوڑ کر چلا جاؤں گا"

عاطفہ

عورت کی شکست — نسوانیت کی توہین — وہ گھٹنوں میں سر دیئے روتی رہی — کہ دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔

انجم اسے لینے آئی تھی

"کیسی طبیعت ہے اب میری رانی کی —؟"

"بہتر ہوں امی —" عاطفہ نے بوجھل پلکوں کو جھکاتے ہوئے کہا۔

"آؤ پہلے تمہیں ٹھیک ٹھاک کر لوں — پھر جلدی سے ناشتہ کر لیں — کیونکہ آج دعوت ولیمہ ہے — اور ابھی تھوڑی دیر تک تمہارے میکے والے بھی آیا چاہتے ہیں —" انجم نے پیار سے اس کے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

دعوت ولیمہ — میکے والے — شہاب کا سامنا وہ کیونکر کر سکے گی یہ سب کچھ سوچ کر وہ پھر رونے لگی — انجم اسے تسلیاں دینے لگی۔ اس بیچاری کو کیا معلوم کہ وہ کون کونسی آگ میں سلگ رہی ہے —؟

انجم نے اسے بڑا پیارا تربوزی رنگ کا سلمے ستارے کا جوڑا پہنایا — یہ شہاب کا پسندیدہ رنگ تھا — اسی کا دیا ہوا دلِ زخمی کا سیٹ پہنا — انجم نے بہت کوشش کی کہ کچھ زیورات اور پہن لے۔ مگر اس نے خاموشی سے انکار کر دیا — ہلکے ہلکے سے، میک اپ میں اس کا سوگوار حسن دمک اٹھا — بھیگی بھیگی پلکیں اور جھک گئیں — نشیلی آنکھوں سے دل کی گہری چوٹ صاف نظر

عاطفہ

آ رہی تھی ـــــ ناشتے کی میز پر سب کامران کے منتظر تھے۔ رضوان ہنس ہنس کر انجم سے باتیں کر رہے تھے۔

"انجم دیکھو میرے گھر چاند اتر آیا ـ"

"واقعی میری بہو چاند سے کم نہیں۔"

"آج سعدیہ زندہ ہوتی ـ تو خوشی سے پاگل ہو جاتی ۔"

"کتنی چاہ سے انہوں نے یہ رشتہ اپنے بھائی سے مانگا تھا ـ" انجم نے عاطفہ کے کرن والے دوپٹے کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔قسمت کی بات ہے انجم ـــــ عاطفہ کی تقدیر یہی لکھی ہوئی تھی ـ" رضوان نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا

تقدیر کا لکھا ـــــ مقدر کے انمٹ حروف ـــــ عاطفہ کی آنکھیں پھر جھلملانے لگیں ـــــ کہ عین اسی لمحے کامران نے اپنے ہاتھ سے کمرے کا پردہ سرکایا ـــــ

"کھئی آ بھی جلو ـــــ سارا ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے ـــــ" رضوان نے کہا ـــــ کامران نے دزدیدہ سی نگاہ عاطفہ پر ڈالی ـــــ نہ لوزی نارنگ کے کپڑوں میں اس کا شہابی رنگ اور نکھر رہا تھا ـــــ ماتھے پر کرن والا دوپٹہ اس کے حسن کو اپنے ہالے میں لئے ہوئے تھا۔اس کی مخصوص خوشبو نے ساری فضا کو مہکا رکھا تھا ـــــ وہ مسکراتا ہوا اس کے سامنے والی کرسی پر آ بیٹھا ـــــ

بے نیازی سے وہ اپنی انگوٹھی سے کھیل رہی تھی ـــــ اچانک اس کی نگاہیں اس کی انگوٹھی پر ٹھٹھک کر رہ گئیں۔ پھر اس نے جلتے ہوئے انداز میں اس کی طرف ایک سلگتی نگاہ دوڑائی

دل کی شکل کا زیور ـــــ جس پر باقاعدہ تیر کا نشان ـــــ اور قطرۂ خون کو ظاہر کرنے کے لئے سرخ نگینوں سے کام لیا گیا تھا۔

اس کا ذہن سلگ اٹھا ـــــ شہاب نے کس عیاری سے عاطفہ کو ساری زندگی جلانے کا تحفہ دیا ـــــ اس کی نفرت تو اسے ہمیشہ کے لئے اس سے دور لے جائے گی ـــــ اور یہ شہاب کی یاد میں موم کی طرح گھلتی رہے گی ـــــ محترم فرماتے تھے ـــــ کہ میرا اس کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں تھا ـــــ!

انجم نے چائے کی پیالی بڑھائی ـــــ

تو اس نے آہستہ سے کہا ـــــ "امی میں باہر سے چائے پی چکا ہوں جب یہ چائے پی لیں۔ تو انھیں کہیئے کہ دو منٹ کے لئے میری بات آکر سن جائیں ـــــ!"

"کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں ماں بیٹوں میں ـــــ!"

"آپ کے بتانے کی بات نہیں ـــــ"! انجم نے بھی چھیڑتے ہوئے کہا ـــــ "تھوڑی سی حلوہ پوری ہی کھا لو ـــــ؟"

"نہیں امی بس ـــــ!" انہیں دیکھ کر ساری بھوک ختم ہو گئی۔

عاطفہ

اُسی لمحے ــــ! بھیگی بھیگی پلکوں میں جنبش ہوئی ـــــ اور اس نے اس پر بڑی بیگانہ سی نظریں ڈالیں ـــــــ اور پھر ایکدم جھکا دیں۔ کامران ایک طنزیہ سی مسکراہٹ لئے کھڑا ہوگیا ـــ وہ بدستور سر جھکائے بیٹھی رہی ــــ وہ تیز تیز قدموں سے باہر چلا گیا ـــــــ اور تب عاطقہ نے ایک سرد آہ بھری۔ اور خالی چائے پی کر بیٹھ گئی ـــــ رضوان بھی جا چکے تھے ـــ انجم نے سرگوشی کی۔

"تمہیں کامران بلا ـ رہے تھے ــ!"

"کیا کام ہے انہیں مجھ سے ـــ؟" اس نے کٹتے ہوئے لہجے سے کہا۔

"مجھے تو کچھ نہیں تبلایا ــ؟ انجم نے معصُومیت سے کہا۔"

ایک زہریلا ستم اس کے ہونٹوں پر لہرایا ـــــ اور وہ آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ اس نے ایک ہاتھ سے ریشمی پردہ ہٹایا ــ تو کامران بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔

"آپ نے مجھے کیسے یاد فرمایا ــ؟" عاطقہ نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا ـــ؟"

"مجھُ سے ـــ؟"

"جی ـــــ!"

"فرمایئے ــ!"

"یہ زیور پھر نہ میں تمہیں پہنے دیکھوں ـــ؟"

"آپ کون ہوتے ہیں مجھے ٹوکنے والے"! بپھری ہوئی عورت جاگ اٹھی۔"

"تمہارا شوہر!"

"صرف شریعت کی حدود تک۔ آپ کے اور میرے درمیان ہمیشہ اجنبیت اور بے نیازی رہے گی۔ کیا رات کے فقرے بھول گئے آپ"

عاطقہ نے شعلہ بار نظروں کو اٹھاتے ہوئے کہا!

اور کامران کو زندگی میں پہلی بار احساس ہوا۔ کہ وہ شکست کھا چکا ہے۔

"تمہیں اس گھر میں رہ کر میرے حکموں پر چلنا ہوگا۔؟"

"کس حق کی بنا پر؟" عاطقہ نے برجستہ کہا۔

"جس حق کی بنا پر تم نے ساری دنیا کے سامنے ہاں کی تھی۔" کامران نے بھی غصے سے کانپتے ہوئے کہا!

اور عاطقہ چوٹ کھا کر رہ گئی۔

"اگر تم نے آج کے بعد یہ زیور پہنا۔ تو میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دوں گا۔" کامران کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اور وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا باہر چلا گیا۔

عاطقہ کے کانوں میں بار بار یہ فقرا گونجتا رہا۔

اس کا دل خوف سے کانپنے لگا۔۔۔ اس نے لرزیدہ ہاتھوں سے اپنا

سارا زیور اتارا ۔۔۔ اسے جھلملاتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اور یکبارگی اس نے سینے سے لگا کر سسک سسک کر رو دی ۔۔ شابی یہ دنیا والے ہر ستم کر دیکھیں ۔۔۔ مگر تمہاری یاد کو تو کوئی طاقت میرے سینے سے جُدا نہ کر سکے گی۔

رونے سے کچھ دل کا بوجھ ہلکا ہوا۔۔۔ سارے زیور کو نہایت عزت واحترام سے دوبارہ اس کے ڈبے میں بند کیا۔ اور اپنے اٹیچی کیس کے ایک کونے میں رکھ دیا۔ رونے سے سارا میک اپ خراب ہو گیا تھا۔۔ آنکھیں شدت گریہ سے سست سرخ ہو رہی تھیں۔ گھٹنوں میں سر دیئے وہ وہ اپنی قسمت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کہ کیسے یہ طویل سفر کٹے گا۔ باہر خاصہ ہنگامہ مچا ہوا تھا۔۔ شور شار میں اپنے میکے والوں کی آوازیں بھی سنائی دیں ۔۔۔ عاطفہ کا دم گھٹنے لگا۔۔۔ بسیار کوشش کے باوجود بھی وہ اٹھ نہ سکی ۔۔۔ سب سے پہلے ثوبیہ بھاگتی ہوئی آئی اور عاطفہ کے گلے لگ گئی۔ درد کو درد سمجھتا ہے ۔۔۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ حمیدا۔ تبسم نسرین۔ شمہ۔ فردوس اور بہت سی سہیلیاں اس کے گرد کھڑی اسے حیرت واستعجاب سے دیکھ رہی تھیں ۔۔۔ کہ اتنے میں انجم۔ مسز آصف۔ ان کی ہمشیرہ۔ ان کی بھابی اور دوسری خواتین کو ساتھ لیکر کمرے میں آگئیں۔

"میری بے بی رو کیوں رہی ہے ۔۔؟" فرحت نے تڑپتے ہوئے کہا اپنی سہیلیوں کو دیکھ کر یونہی دل بھر آیا ہوگا۔۔" ثوبیہ کی امی نے آگے بڑھتے

ہوئے کہا۔

"اے باجی ـــ یاد ہے۔ جس روز میرا ولیمہ تھا ـــ اسی طرح رو رو کر میں پاگل ہوتی جارہی تھی ـــ اور آپ لوگ حیران تھے ـــ" مسز آصف کی بھابی نے ہنستے ہوئے اپنا زمانہ یاد کرتے ہوئے کہا ـــ

فرحت نے دھڑکتے ہوئے دل سے اپنی بچی کا مرجھایا ہوا چہرہ اونچا کیا ـــ یکبارگی ـــ عاطقہ ماں کے سینے سے جالگی ـــ!

"امّی جی ـــ ہائے امی جی ـــ" کہہ کر وہ پھر سسک پڑی ـــ

"اے ہے ـــ فرحت ـــ یہ بدشگونی کیوں کر رہی ہو ـــ خدا نہ بچی کو رلائے ـــ"! ثوبیہ کی امّی نے فرحت کو ہٹاتے ہوئے کہا ـــ

"ایک ہی دن میں پھول سی بچی مرجھا کر رہ گئی ـــ" فرحت نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ـــ!

"سب لڑکیاں شروع میں ایسا ہی کرتی ہیں ـــ پھر خود بخود بہل جاتی ہیں ـــ" تبسم کی امّی نے کہا ـــ!

انجم نے عاطقہ کے کان میں کچھ کہا ـــ اور وہ قدرے سنبھل گئی ـــ

انجم عورتوں کو دوسرے کمرے میں لے آئی ـــ سہیلیاں ڈھولک پہ اپنی شوخ آواز کا جادو جگانے لگیں۔ عاطقہ اور ثوبیہ سرگوشی میں باتیں کرنے لگیں۔ عاطقہ نے پوچھا۔؟

"ثوبی شہاب آئے ہیں۔"

"نہیں — !"

"کیوں — !" عاطفہ کی آواز میں درد بھر آیا — !

"کہتے تھے . . . . کہ عاطفہ کو دُعا دے دینا — کہ جہاں بھی رہو خوش و خرم رہو — "

"تم انہیں منا کر لے آتیں — اکیلے میں اور گھبرائیں گے — "

"نہیں آئے اچھا ہی ہوا — "

"وہ کیوں — !"

"عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتا — خواہ مخواہ کی رسوائی — کل سے نوان کی حالت ایسی ہو گئی ہے — جیسے کوئی دیوانہ ہو — !"

عاطفہ کی آنکھوں سے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر دامن میں گرنے لگے — اور تب ہی تبسم نے آ کر اطلاع دی — !

عاطفہ آپ کے سُسر آخر کار شہاب بھائی کو منا کر لے ہی آئے نا — !

"کیا سچ مچ آ گئے ہیں — ؟"

"ٹھہرو میں جا کر دیکھتی ہوں — " ثوبیہ نے ایک دم کھڑے ہو کر کہا "تھوڑی دیر کے بعد آ کر اس نے واقعی خوشخبری سنائی — کہ شہاب آ گئے ہیں — مرجھایا ہوا پھول ایکدم کھل کر رہ گیا — سوگوار سوگوار سی لڑکی اپنے قیامت خیز حسن میں کسی اپسرا سے کم نظر نہیں آ رہی تھی — ثوبیہ نے اصرار کر کے منہ ہاتھ دوبارہ دھلایا — سنہری رنگ کے کپڑے پہنائے — مگر بسیار

کوشش کے باوجود ـــــ عاطفہ نے کسی قسم کے زیور پہننے سے انکار کر دیا۔ یہ اطلاع انجم کو بھی ملی ـــــ اور اس نے صدقے واری ہو کر اسے منا لیا۔ کہ اس میں ان کی عزت کا سوال ہے۔ ورنہ لوگ کہیں گے۔ کہ کہیں سے مانگے کا زیور لائے تھے۔ جو راتوں رات واپس کر دیا۔ ناگواری نے اس کے اپنے اوپر یہ بوجھ لادا ـــــ صبح کی تلخ کلامی ابھی تک اس کے کانوں میں تلخی اور کڑواہٹ گھول رہی تھی۔ اگر شہاب کا دیا ہوا سیٹ پہننے کی اجازت نہیں ـــــ تو کوئی اور زیور پہننے کی بھی ضرورت نہیں۔

رنگ و بو کے جھلملاتے سیلاب میں ہر کوئی اپنی اپنی دُنیا میں مست تھا۔ لوگوں کا ہجوم ـــــ مہمانوں کی چہل پہل۔ زرق برق لباس کی چمک کھنکتے ہوئے قہقہوں کا شور اور مبارکباد کی صدائیں ـــــ برتنوں کے کھنکنے کا ہلکا ہلکا سا ساز بج رہا تھا۔ وہاں کامران شہاب کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھ کر کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کہ ایک دم وہ کسی اور بات کا تماشہ دیکھنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آؤ شہاب ...... اپنی بہن کو تو چل کر دیکھ لو ـــــ اس نے تو رو رو کر اپنا بُرا حال کر رکھا ہے۔ !"

لمحے بھر کے لئے شہاب کا ایک رنگ آیا ـــــ اور ایک گیا ـــــ مگر خود کو سنبھال گیا ـــــ اور دبی ہوئی آواز میں کہا۔

"ابھی تو بہت عورتیں ہوں گی ـــــ پھر جا کر دیکھ لوں گا ـــــ !"

"عورتیں تو رات تک بھی نہیں ہلیں گی۔"! کامران نے تیز نگاہیں اس پر

گاڑھتے ہوئے کہا۔

"ابھی تو امّی اور بہنوں کے آجانے کی وجہ سے کچھ دل بہل گیا ہوگا۔"

شہاب نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری اور بات ہے ۔۔۔!"

شہاب کامران کی چبھتی ہوئی باتوں کا مفہوم صاف سمجھتا تھا۔ زیادہ تکرار مناسب نہ سمجھی ۔۔۔ اور اس کے پیچھے پیچھے دل میں سینکڑوں طوفان کو چھپائے ۔۔۔ ایک اضطرابی کیفیت کو لئے چلا جا رہا تھا۔ ہاتھوں میں رعشہ طاری تھا۔ آنکھوں سے صاف خوف و ہراس کے سائے کانپتے محسوس ہو رہے تھے۔

عاطفہ کو اطلاع مل گئی تھی ۔۔۔ کہ شہاب اندر آ رہا ہے کہاں اسے دیکھنے کی بیقراری ۔۔۔ اور کہاں اس کا دماغ ایکدم سُن ہونے لگا تھا ۔۔۔ کہ وہ کن آنکھوں سے اسے دیکھے گی ۔۔۔ کس دل سے اس پر نگاہ دوڑائے گی ۔۔۔ دل مجرم سا بنا بیٹھا تھا ۔۔۔ جس جس نے پردہ کرنا تھا کیا ۔۔۔ کامران نے کھنکھارتے ہوئے کہا ۔۔۔ "بھئی تمہارا بھائی سلام کے لئے آیا ہے ۔۔۔"

عاطفہ کا شہابی رنگ ایکدم زرد پڑ گیا۔ متورم نگاہیں زمین بوس ہو گئیں۔ شہاب لڑکھڑاتے قدموں سے اندر آیا۔ سنہری کپڑوں میں ملبوس شہزادی ۔۔۔ اپنے پیا کے دیس کی رانی بنی ہوئی سر جھکائے عاطفہ

بیٹھی تھی۔ اس کا دل اتنے زور سے دھڑکا ـــ جیسے ابھی اچھل کر حلق تک آجائے گا۔ اس نے محسوس کیا۔ کامران بڑی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا ـــ ایک دم سنبھل گیا ـــ مضبوط قدموں سے آگے بڑھا اور اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے آہستہ سے بولا ـــ

"عطی ـــ خدا تمہیں یہ نئی زندگی مبارک کرے ـــ رو کر اس زندگی کا مقابلہ نہیں ہوسکتا۔"

عاطفہ کی سسکیوں سے فضا پھر نم ناک ہوگئی ـــ اس کی اپنی آنکھیں بھی جھلملانے لگیں۔ اس سے پیشتر کہ اس کی مردانگی کو شکست ہوتی۔ تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا ـــ کمزور دل کی لڑکیاں بھی سسکنے لگیں ـــ اور کامران دل میں پیچ وتاب کھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ یہ دیکھ کر کہ عاطفہ نے اس کا زیور اتار دیا ہے۔ کچھ مطمئن سا ہوگیا ـــ!

دونوں بے نیازی سے اپنی زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ بظاہر تو دونوں ایک ہی کمرے کے مکین تھے۔ مگر اجنبیت کی اونچی اونچی دیواریں دونوں کے درمیان حائل تھیں۔ کبھی کبھار کسی مسئلے پر دو چار منٹ کے لئے بات چیت کر لی —— تو کر لی —— ورنہ مکمل خاموشی —— کامران اپنی مسہری پر لیٹا —— کوئی اخبار یا رسالہ پڑھتا رہتا —— اور عاطفہ خاموشی سے نٹنگ کرتی رہتی۔ یا اپنی کسی قمیض پر کوئی پھول کاڑھتی رہتی۔ کامران کتاب کی اوٹ سے اس کے زرد زرد چہرے کو بغور دیکھتا رہتا۔ اس کے دل میں پرانا پیار جاگ اٹھتا —— اس کا جی چاہتا ان سب باتوں کو نظر انداز کر کے وہ صلح کرے —— اور وہ دونوں اچھے دوستوں کی طرح ایک ہو جائیں —— صبح و شام میں رنگینی پیدا ہو جائے —— وہ اس جمود کو توڑنے کی کوشش بھی کرتا۔ تو عاطفہ سرد سا جواب دیکر منہ دوسری

طرف کر کے لیٹ جاتی ـــــ کامران سوچتا کا سوچتا رہ گیا ـــ کہ کب تک یہ تلخی رہے گی ـــ

دونوں کبھی کبھار پکچر دیکھنے چلے جاتے وہاں بھی عاطقہ بالکل سرد بے جان گڑیا کی طرح بیٹھی رہتی ـــ کبھی کبھار اس کی کسی بات کا جواب ہوں یا ہاں ہیں دیکر ..... اسے خموش کر دیتی ـــ اگر وہ پکچر کے بارے میں رائے دریافت کرتا ـــ تو ایک سپاٹ سا جواب ملتا ـ

"مجھے فلموں سے کوئی دلچسپی نہیں ـ"

اور کامران گم سُم سا ہو کر رہ جاتا ـ

کبھی سیر کے لئے تیار کرتا ـــ اوّل تو وہ جانے کے لئے رضامند نہ ہوتی ـــ اور اگر ہو بھی جاتی ـــ تو بالکل سیدھے سادے کپڑوں میں ـــ

اس پر وہ جل اٹھتا ـــ

"عطی کیا تمہارے پاس کوئی اچھا کپڑا نہیں ـــ ؟"

"ان کو کیا ہوا ہے ـــ ؟"

"یہ پہننے کے لائق نہیں" ـــ وہ کہتا ـ

"جسم ڈھانپنا ہے ـــ مجھے کپڑوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ـــ !"

"تمہیں کسی چیز سے دلچسپی بھی رہی ہے ـــ ؟" وہ تلملا کر کہتا ـ

وہ نہایت معصومیت سے نفی میں سر ہلا دیتی ـــ اور کامران کا چڑھا

ہوا پارہ اپنے آپ پر گر جاتا۔

وہ اکثر ماں کے گھر جانے سے بھی کتراتی ــ مہینوں گذر جاتے اور وہ جانے کا نام نہ لیتی۔ انجم اور رضوان کامران کو ڈانٹتے ــ کہ وہ اسے نہیں چھوڑتا ہوگا ــ اور کامران عاطفہ کی طرف دیکھ کر کہتا۔

”مجھے دیکھ کر یہ ساری دُنیا کو بھول چکی ہے ــ!“

اور تب عاطفہ کا رنگ ایک دم زرد ہو جاتا ــ

ایک دن کامران کا عزیز دوست احمد انگلینڈ سے بیرسٹری کی ڈگری لے کر لوٹا ــ تو اس کے والدین نے سارے شہر کے معززین کو شاندار دعوت دی۔ جس میں بیگم کامران اور کامران کو بھی مدعو کیا گیا ــ!

”چلو گی نا ــ اعطی ــ“! کامران کا لہجہ ایکدم نرم پڑ گیا۔ اور عاطفہ ”عطی“ کا لفظ سن کر سُن ہو کر رہ گئی ــ اس نے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا ــ!

”میرا جانا کوئی ضروری نہیں ــ!“

”احمد کا اصرار ہے ــ کہ تم اپنی بیوی کو لیکر ضرور آؤ ــ“

”تو لے جائیے اپنی بیوی کو ــ!“

عاطفہ کا طنز سن کر کامران کٹ کر رہ گیا ــ!

”تمہیں ضرور جانا ہوگا ــ!“

عاطفہ

"حکم ہے —"! عاطفہ کی آواز کانپ کر رہ گئی۔

"التجا ہے —"!

"چلوں گی —"! وہ اس کی پُردرد آواز پہ تڑپ کر رہ گیا۔ اس نے بیقرار نظروں سے اس کی طرف دیکھا — مگر یہ نظریں جھکائے — انگوٹھے سے قالین کو کرید رہی تھی۔

"کوئی اپنا بہت پیارا سا جوڑا پہننا —"! وہ اس کے قریب جھکتے ہوئے بولا۔ اور عاطفہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔

"یہ شرط نہیں مانوں گی —"! اس نے سوگوار سی آواز میں کہا۔

"التجا ہے — شرط نہیں —" یہ کہہ کر وہ ہلکی ہلکی سیٹیوں کی دھن پر کوئی دلنشیں سا گیت گنگنانے لگا۔

عاطفہ نے دزدیدہ سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا — اور خاموشی سے سر جُھکا لیا۔

اور شام کو وہ بہت ہلکے سے زرد رنگ کی ساڑھی پہ کالی جرسی پہنے — سوگوار سی نظر آرہی تھی — ہلکے ہلکے میک اپ میں اس کا سوگوار حُسن خاصا نکھر سا آیا تھا — کالے قیمتی پتھروں کا اس نے ہلکا سا سیٹ پہنا — سفید سی نازک کلائی میں ہیروں سے مرصع رسٹ واچ باندھی — اور اپنے دراز سے سیاہ بالوں کی دو چوٹیوں کی شکل میں اپنی کمر پر ناگن کی طرح بل ڈال کر چھوڑ دیا — اپنا مخصوص سینٹ لگا کر

اس نے ایک نظر آئینے پر ڈالی ۔ ایسا محسوس ہوا ۔۔۔ کہ کوئی خزاں رسیدہ پجارن بھٹکتی بھٹکتی ۔۔۔ یہاں نکل آئی ہے ۔

کامران اپنے سرمئی سوٹ میں سرخ ٹائی لگائے ۔ دل کش انداز میں مسکراتا ہوا ۔ اس طرف آنکلا ۔ زرد زرد سی ساڑھی میں اس کا چہرہ خاصہ کمزور نظر آرہا تھا ۔ اس کی ساری خوشی یکسر غائب ہوگئی ۔ اتنی شاندار محفل میں جانے والا یہ لباس نہیں ۔۔۔!

"آپ نے میری پسند مانگی تھی ۔۔!"

"عطی ..... خدا کے لئے خزاؤں سے لوٹ آؤ ۔۔۔ بہاریں اب بھی تمہاری منتظر ہیں ۔" کامران کی آواز لرزیدہ سی ہوگئی ۔

"آٹھ ماہ سے میں بہاروں سے ہی کھیل رہی ہوں ۔۔!" عاطفہ کی آنکھوں میں کالی گھٹاؤں کے سے سائے لرز کر رہ گئے ۔

"او عطی ۔۔۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ۔۔!"

"قصور تو میرے مقدر کا ہے ۔۔۔ میں تو کسی کو دوش نہیں دیتی ۔"

عاطفہ نے محسوس کیا ۔ کہ کامران کو اپنے رویّے پر ندامت سی محسوس ہونے لگی ۔ لیکن وہ بے نیاز سی ہوکر ۔۔۔ اپنے اٹیچی میں سے رومال تلاش کرنے لگی ۔۔! کہ اتنے میں کسی نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بھاری سی آواز میں کہا ۔!

"کیا آج تم میری پسند کا لباس نہیں پہن سکو گی ۔۔؟"

"آپ کے گھر رہ کر بھی انکار کیسے کر سکتی ہوں ۔؟" درد کے ساتھ چھپا ہوا طنز کامران نے محسوس کیا ۔!

"یہ تمہارا گھر ہے عطی ۔" کامران نے محجوب ہو کر کہا۔

"میرا گھر ۔۔ میرا گھر نہیں ۔۔۔ میرا کوئی گھر نہیں ۔" اس نے دریچے کے شیشوں پر نظریں جماتے ہوئے دکھ سے کہا ۔

"جب تم اپنے احساس میں اسے کوئی مقام دے لو گی ۔ تو پھر یہ تمہارا ہو گا ۔"

عاطفہ لاجواب ہو کر رہ گئی ۔۔۔ اسے احساس تھا ۔ کہ اس کا اپنا رویّہ ان آٹھ مہینوں سے بالکل بیگانوں کی طرح ہے ۔ وہ کوششوں کے باوجود اسے کوئی درجہ دینے کو تیار نہ تھی ۔ کبھی کبھی اس کا رویّہ اس قدر پرشفقت و پُر محبّت ہو جاتا ۔۔۔ کہ وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ۔۔۔ اور کبھی کبھی اتنا اکھڑ ۔۔۔ اور بے نیاز ہو جاتا کہ وہ اس کے مسلسل جمود سے اکتا کر اپنی دکھی زندگی میں ڈوب جاتی ۔

کامران نے اس کے لئے فیروزی رنگ کی بنارسی کی ساڑھی نکالی اس سے ملتے جلتے رنگ کا بلاؤز نکالا ۔۔۔ اور آہستہ سے اس کے سامنے پھیلاتا ہوا بولا ۔۔!

"میری خاطر یہ پہن لو گی ۔۔؟"

"ایسے بھڑک دار کپڑے پہننے کا فائدہ ۔۔"

"میری خوشی کی خاطر —— جسے بچپن سے کوئی خوشی راس نہ آئی۔ ماں کی مامتا نہ مل سکی۔ بھائی کا پیار نہ مل سکا —— گھر کا سکون نہ مل سکا بیوی کی چاہت سے کوسوں دور رہا —— میرے جیسا کون دنیا میں بدنصیب ہوگا —!" کامران کی آواز شکست خوردہ سی ہوکر کانپ رہی تھی —— اور اسی لہجے عاطفہ کو اس سے ہمدردی پیدا ہوگئی۔ وہ دکھ سے کھڑی ہوگئی —— ساڑھی لی اور غسل خانے میں جاکر زرد کپڑے اتار کر یہ شوخ و تیز رنگ کی ساڑھی پہن لی —— اس کے ساتھ ہی شوخ رنگ کا میک اپ بھی کیا —— گہرے رنگ کی لپ اسٹک بھی لگائی —— کامران کے کہنے پر لمبے بالوں کا جوڑا بھی بنایا۔ وہ اسے بڑی محویت اور اپنا ہیت سے دیکھ رہا تھا۔ جب وہ بالکل تیار ہوگئی —— تو کامران نے ستائش آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ——!

"آج بھری محفل میں میری عطی کے حسن کا مقابلہ کوئی نہ کر سکے گا ——!"

عاطفہ نے بڑے سوگوار انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ اور پھر سر جھکا لیا —— کامران اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا —— اس کا جی چاہا —— وہ بچپن کی حدود میں پھر داخل ہو جائے۔ کٹی کے بعد صلح کرے —— اور اپنی عطی کے گلے میں پیار سے باہیں ڈال کر —— اور آہستہ

عاطفہ

سے سرگوشی کرتے ہوئے کہے۔

"عطی اب تو ناراض نہیں۔۔۔!"

مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔۔۔۔۔ سوچ ہی سوچ تھی۔

"عطی تم نے کوئی زیور نہیں پہنا۔ وہ کالا پتھروں کا سیٹ کیونکر اتار دیا ہے۔۔۔" اس کی میچنگ زرد کپڑوں کے ساتھ تھی۔

"میرے ساتھ بازار تک چلو گی۔۔۔؟"

"کیس لیئے۔۔۔؟"

"میری۔۔۔ خوشی کے لیئے۔۔!"

"اگر انکار کر دوں۔۔۔!"

"تو مجبور نہ کروں گا۔۔!"

عاطفہ خموشی سے مسہری پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔۔۔!

اٹھو عطی شاپنگ کے لیئے چلو۔۔۔۔ اس نے اس کے کندھوں پر آہستہ سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔۔!

عاطفہ نے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی الیکٹ واچ کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔۔۔!

"کھانے کا وقت تو ہو چلا ہے۔!"

"چلو پھر۔۔۔!"

دونوں آہستہ آہستہ قدموں سے باہر نکلے۔ کامران نے ٹیکسی

کو ہاتھ دیکر روکا۔۔۔ دونوں بیٹھ گئے۔!

"صرافہ بازار۔" کامران نے آہستہ سے کہا۔!

عاطفہ شیشے پہ نظریں جمائے بے نیاز سی بیٹھی ہوئی تھی۔ کہ ایکدم وہ چونک سی گئی۔۔۔ شہاب اپنے ساتھ ایک خوبصورت سی لڑکی کو بٹھائے بڑی تیز رفتاری سے کار چلائے گذر رہا تھا۔ اسے شک محسوس ہوا۔۔۔ کہ یہ محض اس کا خیال تھا۔ مگر چلتی کار کا نمبر پڑھ کر اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ کہ یہ شہاب ہی تھا۔

کون اس کے ساتھ بیٹھ سکتا ہے۔۔؟

ثوبیہ تو نہیں ہو سکتی۔۔؟

کیا یہ اسے فراموش کر چکا ہے۔۔؟

اتنا تو بے تکلف وہ کبھی کسی سے نہیں ہوا۔۔؟

کار صرافہ بازار کے نکڑ پہ جا کر رُکی۔

"اترو عاطفہ۔"

اور عاطفہ کو جیسے کسی نے زبردستی خواب سے جگا دیا۔

"احمد کی کوٹھی آ چکی ہے۔؟" اُسنے کھوئے کھوئے انداز میں پوچھا

"تم اُترو تو سہی۔!"

عاطفہ کی ساڑھی جوتوں میں پھنس گئی۔۔۔ اور اس کا پاؤں الجھنے لگا کامران نے اپنا ٹھنڈا ٹھنڈا سا ہاتھ اسی کی طرف بڑھا دیا۔ اور وہ بے

جان سی اس کا سہارا لیکر اُتر آئی ۔ کامران نے ٹیکسی کا بل ادا کیا اور وہ دونوں دھیرے دھیرے ایک بڑی سی جگمگاتی دوکان کے سامنے جا کر رُک گئے ——!

”اس کی کیا ضرورت تھی ——؟“

”بعض باتیں بے ضرورت بھی کی جاتی ہیں ——؟“

کامران نے اپنی پسند کا ایک خوبصورت سیٹ خریدا —— اس کے اصرار پر وہیں عاطفہ کو پہنا پڑا —— بات وہ کامران سے کر رہی تھی۔ اور خیال اس کا شہاب کی طرف تھا۔ احمد کی کوٹھی آج دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی —— خوبصورت شامیانے لگے ہوئے تھے۔ رنگ برنگی قمقمے —— عجب بہار دکھا رہے تھے۔ کھنکتے ہوئے قہقہوں سے فضا میں ارتعاش پیدا ہو رہا تھا —— بجھی بجھی سی عاطفہ ویران ویران سی نظروں سے خلا میں تک رہی تھی۔ اور لوگ بڑی محویت اور حریفانہ نظروں سے بیگم کامران کو دیکھ رہے تھے —— احمد تو بڑی بے تکلفی سے آگے بڑھا —— اور ہاتھ ملانے کے لئے گرمجوشی سے اپنا مضبوط ہاتھ آگے بڑھایا۔

”آپ سے مل کر خوشی ہوئی ——!“

عاطفہ نے اس کے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے نظر انداز کر دیا —— اور وہ کھسیانہ سا ہو کر اور باتیں کرنے لگا۔ مگر وہ سوائے ہوں یا ہاں

کے کچھ بھی تو نہ کہہ سکی ـــ احمد ہنستے ہوتے بولا۔"

" کامران ۔ بھابی کچھ خشک مزاج لگتی ہیں ۔!"

" یہ کسی سے بھی بے تکلف نہیں ہوتیں ۔" کامران نے جلتے ہوئے انداز سے عاطفہ کی طرف دیکھا ـــ اور کہا۔

" تم سے بھی نہیں ــــ" احمد نے چوٹ کرتے ہوئے کہا۔

" ارے میری بات چھوڑو ـــ!" کامران نے اپنی شکست کا احساس کرتے ہوئے فوراً بات بدلتے ہوئے کہا ۔"

" ویسے خوش نصیب تم بہت ہو ـــ"

" کِس لحاظ سے ـــــ؟"

" شکل وصورت میں یکتا ـــ کامنی ـــ خموش سی یہ لڑکی کسی خوابوں کے جزیرے کی شہزادی تو نہیں ـــ؟"

" ارے ارے انگلینڈ کی آب وہوا نے تمہیں شعروشاعری بھی سکھادی ۔ کامران نے ہنستے ہوئے کہا۔

عاطفہ ان کی باتوں سے بے نیاز ہوکر موتیا کے پھولوں کے قریب کھڑی ایک ہی بات سوچ رہی تھی ۔ کہ شہاب کے ساتھ کونا ہو سکتا ہے ـــــ؟

کھوئی کھوئی سی عاطفہ نے بمشکل تمام اپنا وقت گذارا ۔ جب احمد انہیں الوداع کہنے کے لئے آیا ـــ تو اس نے معنی خیز نظروں

عاطفہ

سے عاطفہ سے پوچھا۔؟ پھر کب ملیں گی۔؟ ارے بھئی کامران انہیں کوئی سوسائٹی دو نا۔!" دوست یہ خموش فطرت لڑکی۔ تنہائی میں بہت خوش رہتی ہے۔"

کامران نے عاطفہ کو کار میں بٹھا کر آہستگی سے کہا۔

"کچھ تمہاری کمزوری ہو گی ۔۔ کہ تم اس کی تنہائی نہ توڑ سکے" احمر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"فطرت بدل جائے ۔۔ تو پھر کیا چاہیئے ۔۔؟"

"چوٹ کھائے نظر آتے ہو ۔۔!"

"ہاں تیرِ نظر کا گھائل ضرور ہوں ۔!"

عاطفہ دھندلائی دھندلائی سی نظروں سے شیشے کے اُس پار دیکھ رہی تھی۔ کامران بھی آ کر پاس بیٹھ گیا۔ مگر تب بھی اُس کی محویت نہ ٹوٹی ۔!

ٹیکسی روانہ ہو چکی تھی۔ کامران نے دھیرے سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا "عطی طبیعت خراب ہے کیا ۔؟"

"مجھے آپ کا یہ دوست بالکل پسند نہیں آیا ۔؟"

"اوہو ۔۔ وہ ذرا شوخ طبیعت کا مالک ہے۔"

"آئندہ میں اس کے ہاں بالکل نہیں جاؤں گی ۔"! عاطفہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا ۔!

"جیسے تمہاری مرضی ۔۔۔ عطی آج ساری محفل میں تم جگمگا رہی تھیں ۔۔۔ مگر تمہاری افسردگی نے ان حسنِ جہاں سوز کو سوگوار بنا دیا تھا ۔۔۔ سب مجھ سے تمہاری افسردگی کی وجہ پوچھتے تھے ۔۔۔ بھلا میں کسی کو کیا بتاتا ۔۔۔ ؟ کہ جس ہستی کو تم میری بیوی سمجھ رہے ہو ۔۔۔ اس نے تو آج آٹھ ماہ سے مجھ سے بات کرنا بھی گوارہ نہ سمجھا ۔۔۔!" کامران کا لہجہ سوگوار سا ہو گیا۔

عاطفہ سرد بے جان خاموشی سے بیٹھی رہی ۔۔۔ ان کا مکان آ چکا تھا۔

کامران نے ٹیکسی والے کو پیسے دیئے ۔۔۔ دروازہ بند تھا۔ شہاب نے آ کر کھولا ۔۔۔ عاطفہ ۔۔۔ فیروزی رنگ کی بنارسی ساڑھی میں شوخ میک اپ کئے ۔۔۔ قیمتی سا زیور کا سیٹ پہنے ۔۔۔ ہاتھوں پر ساڑھی کا پلو اُٹھائے قیامت خیز انداز میں کھڑی تھی ۔۔۔ شہاب سناٹے میں رہ گیا ۔۔۔ جس ہستی کے لئے وہ اپنی جان گنوا رہا تھا ۔۔۔ جس کی خاطر وہ تنہائی کا زہر پی رہا تھا ۔۔۔ جس کی خاطر اس نے اپنی راتوں کا چین اور دن کا آرام گنوایا جس نے زندگی بھر ساتھ رہنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ آج وہ اس کے سکھ کی دنیا میں آگ لگا کر کس غرور سے اس کے سامنے تن کر کھڑی تھی۔

"ہیلو شہاب ۔۔۔!" عاطفہ نے مصنوعی انداز میں کہا۔

"ہیلو ۔۔۔" کہہ کر اس کی آواز سی کانپ کر رہ گئی۔

"آپ کی دعا سے جی رہا ہوں ۔۔۔" شہاب نے پرزور آواز میں جواب

عاطفہ

دیا۔

عاطفہ تیز تیز سے قدم اٹھاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شہاب اور کامران پیچھے پیچھے آرہے تھے ــــ انجم نے تبلایا۔ کہ شہاب عاطفہ کو لینے آئے ہیں۔ امی کچھ ان کی اداس ہیں ـــ!

"امی کیا سبھی اداس ہوں گے ــــ اور پھر ہمارا گھر بھی تو سونا سونا ہو جائے گا ــ"! کامران نے ہلکی سی طنز کرتے ہوئے کہا ــ!

"گھر تو واقعی ہمارا ابھی سونا ہو چکا ہے ۔"! شہاب نے آہستگی سے کہا ــــ چلو عاطفہ سے پوچھ لیتے ہیں ــــ اگر وہ کہے گی ــــ تو چلی جائے ـ! "

"کیا عاطفہ جانے سے انکار کر سکتی ہے ــ"؟ شہاب نے حیرت سے پوچھا۔

"اب تو اس کا بھی یہاں دل لگ چکا ہے ــ"! کامران نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

عاطفہ بے نیازی سے اپنے پلنگ کے سرہانے سر ٹکائے آنکھوں کے سامنے رسالہ رکھے لیٹی ہوئی تھی ــــ وہ دونوں آکر بیٹھ گئے۔ مگر عاطفہ کی اجنبیت اور بے نیازی میں کوئی فرق نہ آیا ــ!

"عطی۔ شہاب تمہیں لینے آئے ہیں ــــ؟"

"کیوں ــــ؟ عاطفہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"کیا لڑکیاں اپنے والدین کا گھر بھول جایا کرتی ہیں —" شہاب نے دِل کے درد کو دوسرے انداز میں سموتے ہوئے کہا۔

"شہاب صاحب میں گھر تو گھر — اپنے آپ کو بھول چکی ہوں۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ کہ کبھی میرا بھی کوئی گھر تھا —!"

"یہ تو تمہارا گھر ہے ناعطی —" شہاب نے چوٹ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں بے شک یہ میرا گھر ہے — میرا اپنا گھر —" عاطفہ کے لہجے میں زہر بھرا ہوا تھا —!

"خدا تمہیں اپنے ہی گھر میں خوش رکھے —!"

"مجھے اب دُعاؤں کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ شہاب صاحب!"

شہاب کا دم گھٹنے لگا — ایکدم اتنی نفرت ہو جائے گی اسے — ایکدم وہ اتنی بدل جائے گی — اس کا تو اس کے وہم و گمان بھی نہ تھا۔

"تو پھر مجھے اجازت ہے —" اس نے دِل برداشتہ لہجے سے پوچھا۔ "نہیں نہیں میں نہیں جانے دوں گا —" کامران یکبارگی بول اُٹھا — اتی حضور کیا کہیں گی — آج کی رات تمہیں رکنا ہوگا۔ صبح چلے جانا —!"

شہاب جانے پر مصر تھا — مگر کامران کے خلوص کے آگے اس کی ایک نہ چل سکی — کامران نے محسوس کیا — کہ عاطفہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی ہے — جیسے بے رحم موجوں نے ساحل پہ لا پٹخا ہو

وہ سر منہ لپیٹے ــــ کچھ سوچ رہی تھی ــــ کامران نے اسے تین چار بار پکارا بھی ــــ مگر ہر بار ناکامی نے اس کا منہ چڑایا ــــ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں جاننا چاہتا تھا ــــ ازدواجی زندگی کی اس شدید بربادی کا اسے علم نہیں تھا ۔ کہ ایک عورت کا ارادہ اتنا خطرناک بھی ہو سکتا ہے ۔ ابھی اس کی آنکھ بمشکل لگی ہی تھی ــــ کہ اسے دروازہ کھولنے کی آواز سنائی دی ــــ اس نے اندھیرے میں دیکھا ۔ کہ ایک سایہ باہر کی طرف نکل رہا ہے ۔ فوراً اس کی نگاہ عاطفہ کی مسہری کی طرف گئی ۔ مسہری خالی تھی ــــ وہ کافی دیر تک اس کی آمد کا خیال کرتا رہا ــــ کہ غسل خانے گئی ہوگی ۔ اسے اتنی دیر میں آجانا چاہیئے ــــ مرد تو بہت شکی مزاج ہوتا ہے ۔ جوں جوں دیر ہوتی گئی ــــ اس کا شک پختہ یقین میں بدلتا گیا ۔ وہ بھی اپنے بستر سے اٹھا ۔ غسل خانے کا دروازہ کھلا ہوا ۔ اس کی نگاہوں نے شہاب کے کمرے کا طواف بھی کیا ــــ وہ بھی اندھیرے میں بند نظر آیا ــــ وہ برآمدے سے دبے دبے قدموں سے گذر رہا تھا ــــ کہ اچانک موتیا کی بیلوں کے پاس اسے دو سائے نظر آئے ۔ اس نے اپنے آپ کو ایک ستون کے پیچھے کر لیا ۔ آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں ۔ عاطفہ سسکیاں بھر رہی تھی ــــ اور کہہ رہی تھی

"شہاب خدا کے لئے یہاں تو میرا پیچھا چھوڑ دو ــــ مجھے زندگی بھر کا روگ دیکر پوچھتے ہو ــــ کہ میرا کیا قصور ہے ۔!"

عاطفہ

"علی مجھے تو امی نے مجبور کر کے بھیجا تھا — ورنہ میں کبھی نہ آتا — !"

"امی سے کہہ دو — کہ علی مر گئی ہے — اب تو اس کا پیچھا چھوڑ دو — !"

"میں تمہارا ایک ایک پیغام پہنچا دوں گا — اب تم جاؤ — خدا کے لئے — چلی جاؤ — کوئی جاگ گیا — تو ایک قیامت آ جائے گی"

"یہاں تو جو قیامت آئے گی — سو آئے گی — مجھے اتنا بتلا دو — کہ کل تمہاری موٹر میں کون عورت تھی — ؟"

"تمہیں اس سے کیا — ؟" شہاب نے بیزاری سے کہا — !

مجھے اس سے کیوں نہیں — ؟ میری دنیا میں آگ لگا کر تم سکون سے رہ سکو گے — ؟"

"عاطفہ ہوش میں آؤ — اس وقت تمہیں یہ باتیں زیب نہیں دیتیں — سب کچھ بھول جاؤ — ماضی کو کھونے والے — حال کو برباد کر دیتے ہیں — !"

"حال تو برباد ہو ہی رہا ہے — !"

"عاطفہ ہوش میں آؤ — !"

"ہوش ہونہہ — شکریہ مجھے کسی مشورے کی ضرورت نہیں — !" عاطفہ کا لہجہ ایکدم زہریلا ہو گیا۔

"میں کل جا رہا ہوں۔ !"

"جاؤ میں کیا کروں ۔۔۔ ؟"

"تم نہیں جاؤ گی ۔۔۔ ؟"

"نہیں ۔ نہیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ !"

"اچھا میں صبح ہوتے ہی چلا جاؤں گا ۔۔۔ !"

"جاؤ مگر پھر کبھی نہ آنا ۔۔۔ !"

"ایسا ہی ہوگا ۔۔۔" ! شہاب کی آواز لڑکھڑا سی گئی ۔۔۔ !

وہ بوجھل بوجھل قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا ۔۔۔ اور عاطفہ وہیں سر جھکائے سسکیاں لیتی رہی ۔۔۔ کامران اندھیرے میں کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا ۔۔۔ شہاب اپنے کمرے میں پہنچ گیا تب وہ بھی سنسناتے دماغ کے ساتھ اپنے کمرے میں آیا۔ ملگجے اندھیرے میں لیٹا وہ سوچتا رہا ۔۔۔ کہ یہ ڈرامہ کب تک کھیلا جاتا رہے گا۔ اور وہ خموش تماشائی کی طرح کب تک دیکھتا رہے گا۔ کافی دیر گزرنے کے بعد عاطفہ کمرے میں آئی ۔۔۔ پہلے وہ بے چینی سے کروٹیں لیتی رہی۔ پھر کمبل اوڑھے سسکیاں لیتی رہی ۔۔۔ صبح کافی دیر سے ہو چکی تھی ۔۔۔ دونوں جاگ چکے تھے ۔۔۔ مگر اپنی اپنی جگہ خاموشی سے لیٹے ہوئے تھے ۔۔۔ کہ اتنے میں انجم نے آکر آہستہ سے دروازہ بڑھایا ۔۔۔ !

"خیر تو ہے۔ دونوں۔ کیوں اتنی دیر تک لیٹے ہوئے ہو ۔۔۔ ؟"

کامران تو فوراً کمبل اتار کر ـــــ اٹھ کھڑا ہوا ـــــ اور غسل خانے کی سمت نکل گیا۔ مگر عاطفہ متورم آنکھوں کو بمشکل کھولتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"عاطفہ کیسی طبیعت ہے ـــ؟" انجم نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"شہاب سو رہے ہیں ـــ!" آواز میں بے پناہ سوز بھر آیا ـــ!

وہ تو صبح ہوتے ہی چلے گئے تھے۔ کہ میں کامران اور عاطفہ سے مل چکا ہوں ـــ!

"وہ چلے گئے ـــــ"! بے ساختہ وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"تم ساتھ کیوں نہیں گئیں ـــ؟"

"امی بس ـــــ"! وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکی۔

سارا دن کامران اور عاطفہ ایک دوسرے سے کھچے کھچے رہے۔ کامران کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر جانے وہ کن مصلحتوں کے تحت خاموش رہا ـــــ عاطفہ پر پھر اداسی اپنا غلبہ جما چکی تھی ـــــ رنگت سوکھے پتوں کی طرح زرد ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں دنیا جہاں کی ویرانی چھائی ہوئی تھی ـــــ دن بڑے ہی اداس گذر رہے تھے ـــــ مسز آصف عاطفہ کو خود ملنے آ چکی تھیں۔ عاطفہ کی بدلتی ہوئی حالت دیکھ کر بہت چاہا۔ کہ اسے چند دنوں کے لئے گھر لے جائے مگر اس نے صاف انکار کر دیا ـــــ ایک دن اس نے باتوں باتوں میں ماں سے کہا ـــــ کہ وہ شہاب کی کہیں شادی کر دیں ـــــ تاکہ اس کا بھی گھر آباد ہو جائے ـــ! یہ انکشاف سن کر وہ بھونچکا سی گئی۔ کہ خالہ

اپنی بیٹی ثوبیہ کا رشتہ اُسے دے رہی ہیں۔ مگر شہاب انکار پہ انکار کیئے جا رہا ہے ـــــ کہ اس نے فی الحال شادی کے بارے میں سوچا تک نہیں ـــــ !

عاطفہ کے دل کو جانے کیوں ٹھیس سی لگی۔ کہ اسی خالہ کی بدولت امّی بھرپور نفرت اسے دینے پہ مجبور ہو گئیں۔ شہاب کے حق میں قدم قدم پہ کانٹے بونے والی یہی ہستی تھیں ـــــ اب کس نظریئے کے تحت اس کمتر انسان کو اپنی بیٹی کا رشتہ دے رہی ہیں۔ وہ دُنیا والوں کی چالاکی پہ حیران ہو کر رہ گئی ـــــ !

کہ اُن کے قول و فعل میں کتنا فرق ہے۔ ؟

حالات گذر رہے تھے۔ ۔ ۔ بڑی خموشی سے بڑی اُداسی سے، اور دونوں اپنی اپنی جگہ پھر بے نیازی ——— اور اجنبیت کی دیواریں بڑھائے زندگی کی دُکھی گاڑی کو کھینچ رہے تھے۔ جو مطلب کی بات کرنی ہو ——— تو دونوں ایک دوسرے سے کر لیتے۔ ۔ ۔ ورنہ ایک خاموشی ——— رضوان کی صحت بھی کچھ خراب رہنے لگی۔ ۔ ۔ دم کشی کی تکلیف ہونے لگی۔ ۔ ۔ انجم کی خدمت دو چند ہو گئی ——— ایک طرف بہو کے آنے کے باوجود وہ اسے مسلسل آرام دے رہی تھی ——— دوسری طرف رضوان کی بیماری نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ۔ ۔ جو چراغ محبت اس نے خاموشی سے اپنے دل کے نہاں خانے میں جلایا ہوا تھا ——— وہ اسے اپنے خون کا آخری قطرہ دے کر بھی جلانا چاہتی تھی۔ ۔ ۔ ساری ساری رات وہ اس کی پٹی سے بیٹھی رہتی۔ کامران نے بھی دنیا جہان کے ڈاکٹروں کو لا لا کر دکھایا۔ مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی ———

اس وقت ایک فرض شناس سچی محبت کرنے والی ہستی پاکیزہ سا دل لئے۔۔۔ چہرے پر تقدس کا نور لئے۔۔۔۔۔۔ وہ خدائے بزرگ و برتر کے سامنے اپنے رضوان کی زندگی کی دعا مانگتی نظر آتی۔۔۔ منت کے روزے رکھ رکھ کر وہ سوکھ کر کانٹا ہو چکی تھی۔۔۔۔ رضوان اس کی حالت کو بخوبی سمجھتا تھا۔۔۔ کہ انجم نے کون سے بھرم کی خاطر اپنی پہاڑ سی زندگی تنہا کاٹ دی۔۔۔ وہ محبت کی اس پجارن کی دل کی گہرائیوں سے قدر کرتا تھا۔۔۔ اس نے تو اپنی ہر ممکن کوشش کر دیکھی۔ کہ کسی طرح انجم اس کی ہو جائے ——— مگر اس کا ایک ہی اصرار ——— کہ وہ سعدیہ باجی کی جگہ ——— لینا سوچ بھی نہیں سکتی۔۔۔ جو مقام اس کا ہے۔۔۔ اسی پر رہ کر ——— اپنے خلوص کو نبھائے چلے جائے گی۔۔۔ حالات بگڑتے دیکھ کر رضوان نے اپنا وصیت نامہ لکھوایا۔۔۔ اور یہ بھی وصیت کر دی کہ اس کے مرنے کے بعد اسے کھولا جائے۔۔۔

اس روز انجم سارا دن چپکے چپکے روتی رہی ——— اس کے دل پر جیسے کسی نے منوں بوجھ لاد دیا۔۔۔ بھیگی بھیگی پلکوں سے وہ اس گھر کے در و دیوار کو تکتی ——— !! کہ وہ کیا تھی ——— ؟ کون سے جذبات لے کر وہ اس گھر میں آئی ؟ اور اب اس کی حالت۔۔۔ کیا ہے ——— اور اگر خدانخواستہ رضوان کو کچھ ہو گیا ——— تو پھر اس کی اس گھر میں کیا پوزیشن ہو گی ——— ؟ اس کی نظروں میں دنیا اندھیر سی نظر آ رہی تھی۔۔۔ ایک طرف انجم اپنی آگ میں جل رہی تھی ——— اور دوسری طرف عاطقہ۔۔۔ خاموشی سے گیلی لکڑی

کی طرح سُلگ رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ایسی حالات میں کسی پرائیویٹ سکول کے افتتاح کا فنکشن آ گیا۔ جس میں مسز کامران اور مسٹر کامران کو مہمانِ خصوصی کے طور پر بلایا گیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ کامران نے لاپرواہی سے کارڈ لا کر عاطفہ کے سامنے پھینک دیا۔ ۔ ۔

"کل شام کو چار بجے تک تیار رہنا"

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"دورے پر۔ ۔ ۔ ۔!"

"جانا ضروری ہے؟"

"دورے پر۔ ۔ ۔ ۔!" کامران نے ایک مبہم سی امید کے سہارے پوچھا

"نہیں فنکشن پر۔ ۔ ۔ ۔!" ایک سپاٹ سا جواب ملا۔ ۔ ۔ ۔

اور دکھ کی بہت سی پرچھائیاں اس کے چہرے پر لہرا کر رہ گئیں۔ ۔ ۔ ۔

"عاطفہ خدا کے لئے تم اپنا راستہ جدا کر لو۔ تاکہ تمہاری خاموش زندگی کے سمندر پر کسی قسم کی ہلچل یا پریشانی کی شوریدہ لہریں نہ اُبھر سکیں۔ دنیا والے تو تمہیں بیگم کامران سمجھ کر جھنجھوڑتے رہیں گے۔ پریشان کرتے رہیں گے۔ ۔ ۔ تو کیوں ظاہر نہیں کر دیتیں ——— کہ تم عاطفہ ہو۔ ۔ ۔ مسز کامران نہیں۔ ۔ ۔ کامران تو تمہارے نزدیک ایک بے جان سے انسان کا نام ہے جس کی کوئی تمنا نہیں۔ کوئی آرزو نہیں۔ ۔ ۔ ۔ اسے سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی کچھ کہنے کا حق حاصل نہیں۔ ۔ ۔ ۔ وہ گونگا بن کر رہ رہا ہے۔ اور اندھا بن کر جی رہا۔ ۔ ۔ "کہتے کہتے ایک دم اس کی آواز شدتِ جذبات سے رندھ

کر رہ گئی۔ وہ غسلخانے میں فوراً ہی چلا گیا ——— نہا دھو کر بغیر کچھ کھائے پیئے چلا گیا۔۔۔ عاطفہ سر جھکائے سوچتی رہ گئی ——— کہ کامران بہت عظیم ہے۔ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی وہ کتنی عظمت سے اسے چانس پہ چانس دیئے جا رہا ہے۔ جب اس کا دل جلتا ہے۔ تو اس کے منہ سے جلے کٹے فقرے نکلتے ہیں۔ آج بھی اس نے جل کر یہ فقرے کہے تھے۔۔۔ وہ اپنی جگہ سچا ہے۔ کب تک ان حالات کا مقابلہ کرتا رہے گا۔۔۔ کب تک اس ظلم کو برداشت کرتا رہے گا۔۔۔ یہ محض اس کی شرافت تھی۔۔۔ کہ وہ اس بوجھ کو سنبھالتا آرہا ہے۔ آج بھی اس نے کتنے دکھ سے یہ کہا تھا "کہ تم کیوں ظاہر نہیں کر دیتیں کہ تم صرف عاطفہ ہو۔۔۔ مسز کامران نہیں۔۔۔!"

اگلے روز وہ سفید بنارسی ساڑھی پہنے۔۔۔ بالکل زرد زرد سا مرجھایا چہرہ لئے سکول کے فنکشن میں جانے کے لئے بالکل تیار بیٹھی تھی کہ۔۔۔ کامران آ گیا۔۔۔ زرد زرد سی عاطفہ کو اس نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا سفید ساڑھی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں دنیا جہان کا درد سمٹ آیا۔۔۔

"تیار ہو ——— !"

"ہوں ——— !"

"چلو میں جیپ لایا ہوں !"

"امی گاڑی کے متعلق کہہ رہی تھیں۔ کہ آپ آکر لے جائیں !"

"عاطفہ مجھے تم نہ مل سکیں۔۔۔ تو میں تمہاری چیزوں کو کیا کروں ؟"

"عاطقہ زرد ہونے لگی ـــــــ اس کے پاس کوئی ایسے الفاظ نہیں تھے۔ کہ وہ بدنصیب کامران کو تسلی دے سکتی۔۔۔۔

وہ فنکشن پر وقت پر پہنچ گئے۔۔۔ سفید بنارسی ساڑھی کے ساتھ اسی رنگ کا سوئیٹر اور اس پر شہاب کے پسندیدہ پھول۔۔۔ موتیا کی ایک کلی لگائے کانوں میں موتیا کے پھول پہنے۔۔۔ خود بھی موتیا کی ایک کلی دکھائی دے رہی تھی مہمان خصوصی کامران تھا۔۔۔ بجھا بجھا سا کامران آج عاطقہ کے دل میں سویا ہوا درد جگا رہا تھا۔۔۔ وہ کھوئی کھوئی سی خلاؤں میں اس شکست کے اسباب ڈھونڈ رہی تھی۔۔۔ جس نے ایک ہی در میں تین روحوں کو کرب بخشا۔۔ تینوں اپنی اپنی جگہ بے چین ہیں۔۔۔ تینوں ایک چھپی آگ میں جل رہے تھے۔۔۔۔

ہلکا پھلکا سا پروگرام شروع ہو چکا تھا۔۔۔ کہ اتنے میں عاطقہ کے نتھنوں میں مخصوص سگریٹ کا دھواں سا محسوس ہوا۔۔۔۔ اس نے بے نیازی سے اپنی گردن کو ہلکا سا خم دیا۔۔۔ تو وہ شہاب تھا۔۔۔ شہاب کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کے ساتھ ایک خوبصورت سی پہاڑی لڑکی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ اور عاطقہ کو پہچاننے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔ کہ یہ وہی لڑکی ہے۔ جو اس روز اس نے شہاب کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھی تھی۔۔۔ لڑکی اپنے مخصوص لباس میں اک دلنواز سی مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجائے پروگرام میں کھوئی سی بیٹھی ہوئی تھی۔ اور شہاب بھی بظاہر بڑا خوش خوش سا نظر آ رہا تھا۔ عاطقہ کے ذہن میں پھر لاوا سا پکنے لگا۔۔۔ شہاب کے ساتھ وہ زندگی میں کسی بھی لڑکی کا تصور

برداشت نہیں کرسکتی تھی۔۔۔ چہ جائیکہ وہ ایک لڑکی کو آنکھوں سے دیکھ کر چپکی بیٹھی رہے۔۔۔ اس کی آنکھیں شدتِ غم سے سلگنے لگیں۔۔۔ شہاب کن انکھیوں سے اس کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہا تھا۔ اور یہ سوچنے میں اسے ذرا بھی دیر نہ لگی۔۔۔ کہ اس روز بھڑکیلے کپڑوں میں محض اس کا ظاہری روپ تھا۔۔۔ ورنہ یہ بھی اسی دکھوں کی آگ میں سلگ رہی ہے۔ جس میں وہ جل رہا ہے عاطفہ کو سلگتا چھوڑ کر اس نے پہاڑی لڑکی کو آہستہ سے کچھ کہا۔۔۔ اور وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔۔ اس سے پیشتر کہ وہ باہر نکلتے۔۔۔ عاطفہ زخمی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی ان سے پہلے باہر نکل گئی۔۔۔ اسٹیج پر بیٹھا ہوا کامران نے یہ سب منظر دیکھ رہا تھا۔۔۔ عاطفہ کی اس حرکت پر کھیا اس کا خون کھول کر رہ گیا اسے اپنی عزت کی ہتک کا اتنا شدید احساس ہوا۔۔۔ کہ وہ پاگل ہوا اٹھا۔۔۔ اور طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔ اور ایک ایسے دروازے سے باہر نکلا۔۔۔ جہاں سے وہ عاطفہ کا بخوبی پیچھا کر سکتا تھا۔۔۔ جوش و جذبات سے اس کے دل پر ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔۔۔ انتقام کی آگ میں وہ جل رہا تھا۔۔۔ اپنی عزت سر بازار نہیں لٹا سکتا تھا۔ آج اس کے ہاتھوں یا تو عاطفہ کا خون ہو جائے گا، یا شہاب کا۔۔۔ لمبا سا میدان بالکل سنسان پڑا تھا۔ چاروں طرف کیلے کے اونچے اونچے درخت خاموش کھڑے۔۔۔ اس وقت کا انتظار کر رہے تھے۔۔۔ جس کا سین خود بخود ڈراپ ہونے والا تھا۔۔۔ کامران نے شعلہ بار نظروں سے حدِ نظر ہر چیز کو بغور دیکھا۔۔۔ ایک اونچے سے

سیمنٹ کے بنچ پر اسے کوئی بیٹھا نظر آیا۔۔۔ مگر۔۔۔ وہ تو تنہا تھا۔۔ کامران دبے قدموں اس تک پہنچا۔۔۔ مگر اسے یہ دیکھ کر شدید صدمہ پہنچا۔۔۔ کہ یہ اس کا شکار نہیں تھا۔۔۔ بلکہ وہی پہاڑی لڑکی تھی۔۔۔ جو ابھی کچھ دیر قبل اس اس کے ساتھ ہال میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے دل میں اور شکوک بڑھ گئے۔۔۔ اس اس نے آہستگی سے پوچھا۔۔۔

"شہاب کہاں گیا ہے؟

"خان۔۔۔" شیریں نے معصومیت سے پوچھا۔

"ہاں وہی۔۔۔!

"اس طرف گئے ہیں" شیریں نے انگلی سے سامنے درختوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اور کامران لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس طرف چلا گیا۔۔۔ عاطفہ کے زور زور سے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔۔۔

"خبردار ـــــ اگر میں تمہارے منہ سے اپنی محبت کا ایک لفظ بھی سنوں۔۔۔"

"مگر عاطفہ سنو تو۔۔۔!

"تم دغاباز ہو ـــــ فریبی ہو ـــــ مکار ہو۔۔ بھولی بھالی لڑکیوں کو پھانسنا تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے!"

"سب کچھ کہہ لو ـــــ لیکن میری وفا پر الزام نہ دو ـــــ!"

"شرم نہیں آتی . . . اپنے منہ سے لفظ وفا نکالتے ہوئے۔ تم وفا کو کیا جانو ——— ؟"

"ساری عمر کی ریاضت کو پل بھر میں برباد نہ کرو . . . عظمیٰ . . . !"

"بڑے آئے ریاضت کرنے والے . . . منہ پر کسی اور کی محبت کا دم بھرنا ——— اور دل میں کسی اور بسانا ——— یہ تم مردوں کا عام شیوہ ہے . . . بیچاری پہاڑی لڑکی کیا جانے . . . کہ یہ گل تم کہیں اور بھی کھلا چکے ہو ——— !"

"عظمیٰ ——— ! خدا کے لئے مجھے الزام نہ دو ——— تم سرمایہ داروں کو صرف دولت سے بھرے ہوئے پلڑوں کی ضرورت ہے . . . تم کسی کے نازک آبگینوں کو کیا سمجھو ——— دولت تمہارا ایمان ——— دولت تمہارا ضمیر . . . دولت تمہارا سکون ہے . . . مجھے بے چین کر کے تم بھی کبھی چین نہ پا سکو گی . . . سکون کو ترسو گی . . . سکون تمہیں میسر نہ آئے گا . . . ساری زندگی ایک اذیت ناک کرب میں مبتلا رہو گی . . . راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنی موت کی دعائیں مانگو گی ——— مگر موت بھی تم سے کوسوں دور بھاگے گی . . . ."

شہاب کا ذہن باغی ہو چکا تھا . . . مدتوں کا بند لاوا . . . بددعاؤں کے روپ میں بہہ نکلا . . . صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا . . . آنکھوں میں شعلوں کی لپک . . . الفاظ میں ناکامیٔ محبت کی تلخی . . . اور

چہرے پر تمام تر حسرتوں کا خون سمٹ آیا۔۔۔۔

"تم سسکوگی۔۔۔۔ تڑپوگی۔۔۔۔ روؤگی۔۔۔۔ مگر کوئی بھی تم پر ترس نہ کھائے گا۔۔۔۔!"

"شابی خدا کے لئے میری پوجا کے پھولوں کو نہ روندو۔۔۔!" عاطفہ نے بے بسی سے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"اپنی پوجا کے پھولوں کو تم خود ہی اپنے ہاتھوں سے مسل کر پھینک چکی ہو۔۔۔ اب اور کیا چاہتی ہو ——!"

"شابی میری عمر بھر کی پوجا برباد ہو گئی۔ تمہارے نام کی مالا جپا کرتی تھی۔ آج تم نے اس مالا کا ایک ایک دانہ بکھیر دیا۔۔۔۔!" عاطفہ کی آنکھیں درد و سوز سے جھلملانے لگیں۔۔۔۔

"مالا تم نے پروئی۔۔۔۔ موتی میں نے اپنے خلوص و محبت کے لا کر دیئے۔۔۔۔ مگر دھاگہ اس کچے رشتے سے بھی کمزور تھا۔۔۔ جو غرض اور لالچ سے مل کر کاتا گیا۔۔۔۔ تمہارے والد مرحوم نے مجھے ایک نوکر سمجھ کر پالا تھا۔۔۔ اور نوکروں سے بدتر سلوک مجھ سے کیا گیا۔"

"شابی میرے مرے ہوئے باپ کو الزام نہ دو۔۔۔۔!"

"آج تو میں ساری دنیا کو چیخ چیخ کر سناؤں گا۔۔۔ کہ امارت اور غربت کے درمیان ایک گہری خلیج حائل ہے۔۔۔۔۔ جسے اگر کوئی پار کرنے کی کوشش کرے گا تو اس کا وہی حشر ہو گا جو میرا ہوا۔۔۔۔

میری تنخواہ کا معاوضہ ——— جو آپ کے ابا مرحوم ——— اور امی محترمہ نے مجھ پر ترس کھا کر ——— وصیت نامے میں تحریر فرمایا تھا... وہ میں اپنے وکیل کی معرفت تمہاری دی ہوئی بھیک واپس تمہارے دامن میں ڈال چکا ہوں.... امیر کبھی بھی خلوص نیّت سے بھیک نہیں دیتا.. بھیک سے زیادہ اس میں شہرت کی ہوس پوشیدہ ہوتی ہے... اور میں اس شہرت پر لعنت بھیجتا ہوں.... جو غریب کو نشانہ بنا کر حاصل کی جائے.... عاطفہ... تمہارے اور امیؔ کے درمیان جو آخری بات چیت ہوئی تھی وہ میں سب سُن چکا تھا... اپنا اپنا ظرف ہے۔ تمہاری شادی سے بہت پہلے غائب ہو جاتا ——— مگر میں تنگ نظر نہیں تھا... کم ظرف نہیں تھا... تمہارے دیئے ہوئے قیمتی کپڑوں میں ایک غریب سا مجبور دل دھڑک کر یہی کہتا تھا... کہ نمک حلالی کا وقت آ گیا ہے۔ اپنے قیمتی اور پاکیزہ خون کو شرمسار مت کرتا... سو میں نے... وہ سب کچھ کیا جو مجھے کرنا چاہیئے تھا... اب میں محترمہ امیؔ صاحبہ کو مطلع کر آیا ہوں... کہ وہ اپنا کاروبار اپنے معزز داماد کو سونپیں ——— اور نالی کے کیڑے کو دوبارہ گندے پانی میں پھینک دیں تاکہ وہ پُرسکون تو ہو جائے ——— مطمئن تو ہو جائے ——— اس کی ابدی خلش تو دور ہو جائے... اور للّٰلہ... کبھی کسی کمتر انسان کو ایسا اعزاز نہ بخشیے... جس سے اس کی روح ایک بند ڈبے میں سسکتی

عاطفہ

کراہتی رہ جاتی ہے۔ اُجلے کپڑے پہننے سے تفرقے دور نہیں ہو جاتے۔۔۔۔
مسٹر کامران صاحب!"

"خدا کے لئے شاہی۔۔۔خاموش ہو جاؤ۔۔۔ میں اپنی محبت کی بھیک
تم سے مانگتی ہوں۔۔۔۔!" عاطفہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کے سوتے پھوٹ
پڑے۔۔۔۔

"مسٹر کامران زندگی بھر تو میں بھیک مانگتا رہا۔۔۔جنم جنم سے
بھیک مانگنا میرا مقدر بن چکا تھا۔۔۔مگر اب یہ بھکاری بھی اس لائق
ہو گیا ہے ——— کہ کوئی اس سے بھیک مانگے۔۔۔۔ہ کوئی اس سے
بھیک مانگے۔۔۔۔!" یہ کہہ کر وہ وحشیانہ انداز میں قہقہے لگانے لگا۔

"شاہی۔۔۔تم آج کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

"مسٹر کامران حقیقت بڑی کڑوی ہوتی ہے!" اس نے زہر خند ہنسی
ہنستے ہوئے کہا۔

"میں مانتی ہوں کہ تم اپنی دکھوں کی آگ میں جل رہے ہو۔ مگر اس میں
میرا کیا قصور۔۔۔؟"

"آج سے سب دکھوں کی آگ بجھا کر۔۔۔میں اسی روشنی سے
اپنی زندگی کو منور کر رہا ہوں۔۔۔!"

"مطلب ———؟"

"وہ تو واضح ہے ———؟"

عاطفہ

"یعنی ———— ؟"

"میں پہاڑی لڑکی سے شادی کر رہا ہوں۔ ۔ ۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کوٹھی بنگلوں۔ ۔ ۔ کاروں۔ ۔ ۔ کو خیر باد کہہ رہا ہوں۔ ۔ ۔ جنہوں نے میری آزاد روح کو ایک عذاب میں گرفتار کر رکھا تھا۔ ۔ ۔ دنیا بھر کی محرومیاں میرا مقدر بن چکی تھیں۔ ۔ ۔ میں آج اپنے گرد خود اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے اس جال کو تار تار کرنا چاہتا ہوں۔ ۔ ۔!"

"بس شابی۔ ۔ ۔ اور کچھ مت بولو۔ ۔ ۔ خدا تمہیں نئی زندگی مبارک کرے۔ ۔ ۔ میں بھی پُرسکون ہو کر کامران کی وفادار رہ سکوں۔ ۔ ۔ محبت نہ دے سکی۔ ۔ ۔ ذہنی رفاقت نہ دے سکی۔ ۔ ۔ ایک وفادار دوست بن کر ہی اس کی زندگی میں شامل ہو جاؤں۔ ۔ ۔ آج تقریباً ایک برس سے میں خود بھٹک رہی ہوں۔ ۔ ۔ تم اپنی زندگی کو کسی کی روشنی سے منور کر لو۔ ۔ ۔ تو مجھے بھی سکون مل جائے۔ ۔ ۔ میں تو تمہیں کچھ بھی نہ دے سکی۔ ۔ ۔ خدا کرے یہ پہاڑی لڑکی اپنی محبت سے تمہارے ذہن کا ہر زخم مٹا دے۔ ۔ ۔ اور تم شاد و آباد رہ کر سب کچھ بھول جاؤ۔ ۔ ۔ سب کچھ بھول جاؤ۔ ۔ ۔!"

عاطفہ نے اپنے آنسو پونچھے۔ ۔ ۔ اور چہرے پر حسرتوں کے دیپ جلائے آہستہ آہستہ قدموں سے پیچھے کی طرف مڑ گئی۔ ۔ ۔ شہاب بیدردی سے سگریٹ پیتا رہا۔ ۔ ۔ کامران یہ سب کچھ سنتا رہا۔ ۔ ۔ عاطفہ اس کے پاس سے نیم بیہوشی کے عالم میں گذر گئی۔ ۔ ۔ اس کا سارا وجود کانپ رہا تھا۔ ۔ ۔ چہرہ سب آنسوؤں

سے تر تھا۔۔۔ رنگت بالکل سفید ہو رہی تھی۔۔۔ جتنے غصے کے ساتھ کامران آیا تھا۔۔۔ وہ غصہ ان بد قسمتوں کی گفتگو سن کر ماند پڑ چکا تھا۔۔۔ جس آگ کو وہ اپنے دماغ میں سلگا کر لایا تھا۔۔۔ بے بسی اور محرومی کی خاک نے اس آگ کو بجھا کر رکھ دیا۔۔۔۔

دونوں جس آگ میں جل رہے تھے۔۔۔ کامران بھی اسی آگ میں سلگ رہا تھا۔ وہ بھی بچپن سے عاطقہ کا حسین تصور ذہن میں بسائے ہوئے تھا۔۔۔ گردش حالات نے قریب کر کے بھی اسے اتنی دور کر دیا۔۔۔ کہ وہ کچھ نہ سوچ سکا شہاب جو کچھ کہہ رہا تھا۔۔۔ وہ ایک لفظ بھی غلط نہیں تھا۔۔۔ کامران اپنے خاندان کے حالات کو بخوبی سمجھتا تھا۔۔۔ کہ کن واقعات کی بنا پر شہاب جیسے وجیہہ ——— اور پُر وقار شخصیت کو ٹھکرایا گیا۔۔۔ شادی کے دن اس نے ماموں ابا کی وصیت کو اس کے منہ پر مار کر یہ واضح کر دیا۔۔۔ کہ وہ دولت کا پجاری نہیں۔۔۔!!

وہ ایک دوسرے راستے سے نکل کر عاطقہ سے پہلے گھر پہنچ گیا۔۔۔ عاطقہ ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔۔۔ کامران اس کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا۔۔۔ اس لئے۔۔۔ پریشان ذہن کو سکون دینے کے لئے شہر سے باہر ایک ٹیکسی رکوا کر اس میں بیٹھ گیا۔۔۔

ان کھلی فضاؤں نے بھی اسے قرار نہ بخشا۔۔۔ ان حسین نظاروں سے بھی وہ لطف اندوز نہ ہو سکا۔۔۔ جو اپنا دامن پھیلائے اس کے استقبال کے لئے

موجود تھے . . . ڈوبتے سورج کا دلکش نظارہ . . . مغربی سمت پر قرمزی رنگ جس میں ہلکی ہلکی سرخی بھی پھیلی ہوئی تھی . . . نارنجی رنگ میں ڈوبے ہوئے بادل ایک حسین منظر کشی کر رہے تھے . . . اسے کوئی خوشی نہ دے سکے . . . اور وہ پریشان ذہن لئے دوبارہ شہر آ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا —— کہ عاطقہ پر اس گفتگو کا کیا ردِ عمل ہو گا —— ! کیا اس تلخ واقعہ کے بعد بھی وہ اپنے دل میں شہاب کی محبت روشن کر سکے گی —— ؟ ؟ اس کا رویہ اب کیا ہونا چاہیئے . . . بہت سی باتوں نے اس کی پریشانی میں مزید اضافہ کر دیا . . . جب وہ گھر پہنچا . . . تو شام کا ملگجا اندھیرا پھیل چکا تھا . . گہرے گہرے سرمئی بادل گھر گھر کر آ رہے تھے . . . مغربی حصے کی طرف نارنجی رنگ نے سرمئی رنگ میں ایک عجیب سا نکھار پیدا کر دیا تھا . . . انجم کی زبانی معلوم ہوا کہ آج ابو کی طبیعت پہلے سے بہتر ہے۔ قدرے پریشانی میں کمی ہوئی . . . اپنے کمرے میں آیا . . . تو عاطقہ اپنی مسہری پر لیٹی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی . . . سوچی سوچی سی آنکھوں میں دنیا جہان کا غم چھپائے وہ رسالہ قدرے اونچا کئے بیٹھی ہوئی تھی . . . کامران نے کپڑے بدلے . . . اور اپنی مسہری پر لیٹنے ہی والا تھا . . . کہ ایک آواز سنائی دی۔

”کھانا نہیں کھائیں گے —— ؟“

”نہیں . . . !“

”کیوں —— ؟“

"بھوک نہیں ———؟"

"اپنی صحت کا خیال رکھیئے ....!" ایک لرزیدہ سی آواز سنائی دی۔

"اور تم ———!" کامران کا دل خوشی سے دھڑک اٹھا۔

"میں تو اپنی صحت کھو چکی ہوں .... اب کیا صحت کا خیال رکھوں!"

"کیا میری خاطر! عاطقہ تم اپنی صحت دوبارہ پانے کی کوشش نہیں کر سکتیں؟"

کامران نے پُر امید انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کی خاطر ———!" اور اس کی آنکھیں پھر سے ڈبڈبا آئیں۔

"ہاں میری خاطر ———!" کامران نے دھڑکتے دل کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"کامران بہت کوشش کروں گی ——— اپنے آپ کو بدلنے کے لئے ... تمہیں کچھ دیر اور ——— تکلیف دہ لمحات کو سہنا پڑے گا ... سب کچھ بدل جاتا ہے۔ انسان بھی بدل جاتے ہیں ... مگر آہستہ آہستہ ....!"

عاطقہ نے تھکے تھکے انداز میں لرزیدہ سی آواز میں کہا۔ اور تب کامران کی دنیا میں بہار آئی .... آشاؤں کے دیپ روشن ہو گئے ——— گزرے ہوئے سارے تلخ واقعات بھول سے گئے ... اور وہ عاطقہ کی مسہری پر آ کر آہستہ سے بیٹھ گیا .... اس نے اس کے ننھے ننھے سے سفید مرمریں ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر ہلکے سے دبایا ... ہاتھ برف کی طرح سرد ہو رہے تھے۔

"عطی ——— میں ساری زندگی انتظار کرتا رہوں گا۔۔۔ جب تک کہ میری خوشیاں نہ لوٹ آئیں۔۔۔ میں مانتا ہوں۔۔۔ کہ ماضی کی ایک قیمتی سرمایہ ہوتا ہے۔۔۔ مگر حال سے سمجھوتہ کرنے والے۔۔۔ ماضی کی تلخیوں کو بھولنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔۔۔ شہاب اپنے حالات و اقعات کی قید میں جکڑا ہوا ہے۔۔۔ تم اپنی جگہ مجبور ہو ——— اور میری تو سب سے الگ کیفیت ہے۔۔۔ تم تو ایک دوسرے سے کچھ کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکتے ہو۔۔۔ میں کس سے کہوں۔۔۔ کیا کہوں ——— ؟ اپنی عطی کی سختیوں کو سہنے کا تو اب میں عادی بن چکا ہوں۔۔۔ تم میرے پاس ہو ——— دکھ کے ساگر میں ڈوب ڈوب کر ابھرتا ہوں۔۔۔ کہ اپنے پیار کو خوش نہ رکھ سکا۔۔۔ مجبور ہوں کہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔۔۔" کامران نے گوشۂ چشم سے دیکھا۔۔۔ کہ عاطفہ پریشانی کے عالم میں ہونٹ کاٹ رہی ہے۔۔۔ اس کے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔۔۔ رنگت ایک دم اُڑ چکی تھی۔۔۔ کامران نے سراسیمہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔۔۔

اور یکبارگی۔۔۔ وہ اس کے کندھوں سے لگی۔۔۔ بے بسی۔۔۔ مجبوری۔۔۔ اور دلی خلش کو چھپائے زار و قطار رو رہی تھی۔۔۔

اتنی قربت۔۔۔ تو وہ ایک برس میں ایک گھڑی بھی نہ دے سکی۔۔۔ اس کے مہکتے سانسوں۔۔۔ اس کی لطیف قربت نے کامران کو سحر زدہ کر دیا۔۔۔ اور وہ اس کی زلفوں کو سنوارنے لگا۔۔۔

"کامی مجھے معاف کر دو ——— میں شاید تمہیں کچھ بھی نہ دے سکوں گی۔ ۔ ۔ ۔" عاطقہ ایک بار پھر سے سبکنے لگی۔ ۔ ۔ ۔

"جانِ کامی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم مجھے کچھ نہ دو ——— بس خوش رہا کرو۔ ۔ "

کامران نے دھڑکتے دل سے اس کی نازک سی ٹھوڑی اپنی انگلی سے اونچا کرتے ہوئے کہا۔ ۔ ۔ ۔

"رہو گی نا۔ ۔ ۔ ۔" اس نے اس کی نظروں میں نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔ ۔

"ہاں !" عاطقہ نے آنکھوں کو جھکاتے ہوئے کہا۔ ۔ اس سے قبل۔ ۔ ۔ کہ کامران خوشی میں جھول کر۔ ۔ ۔ ۔ اسے اپنے سینے سے لگا لیتا۔ ۔ ۔ کہ عاطقہ سرد سرد سے جسم کو لئے ایک دم کھڑی ہو گئی۔ ۔ ۔ ۔

"میں تمہارے لئے کھانا لا رہی ہوں۔ ۔ ۔ ۔" لطیف احساسات پر جیسے کسی نے بھاری پتھر پھینک دیا ہو۔ ۔ ۔ کامران تو آج ساری رات خوشی سے بھوکا سو سکتا تھا۔ ۔ ۔ کہ اس کی غلطی کے خیالات میں کچھ تو ارتعاش پیدا ہوا۔ ۔ ۔ کچھ تو جمود ٹوٹا۔ ۔ ۔ کچھ تو رویّہ بدلا۔ ۔ ۔ ۔

عاطقہ ہلکے نیلے لباس میں بالکل ایک آسمانی حُور نظر آ رہی تھی۔ ۔ سفید سفید سے پاؤں اس نے کالی باریک سے سٹریپ والی چپل پہنی۔ ۔ ۔ اور آہستہ سے پردہ ہٹا کر باہر نکل گئی۔ ۔ ۔ ۔

دل نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے اس کے ساتھ دو لقمے کھائے۔ ۔ ۔ کھانے کے دوران کامران نے پوچھا۔ ۔ ۔

"عطی تم کھانا ٹھیک طرح سے نہیں کھا رہی ہو۔۔۔!"

"کامی۔۔۔ میرے سر میں چکر سا ہے۔۔۔۔۔ اس لئے دل نہیں چاہ رہا۔۔۔۔!"

"کافی بناؤں ——؟"

"نہیں اب رہنے دو۔۔۔ پھر سہی۔۔۔!"

کھانا کھانے کے بعد۔۔۔ عاطقہ باہر برتن رکھنے گئی۔۔۔ تو کامران سوچنے لگا۔۔۔ کہ یہ ایک سال کی مدت میں بہت کمزور ہو گئی ہے۔۔۔ کل صبح اُٹھتے ہی کسی اچھے سے ڈاکٹر کو دکھا کر کوئی مشورہ لوں گا۔۔۔ تاکہ اس کی گمشدہ صحت بحال ہو سکے۔۔۔ عاطقہ بجھی بجھی سی آکر اپنی مسہری پر لیٹ گئی۔

"سر دبا دوں۔۔۔!"

"نہیں نہیں اب سو جاؤ۔۔۔!" عاطقہ کے لہجے میں ایک دم بیزاری سی جھلک اُٹھی۔

اور عاطقہ نے بڑھ کر سوئچ آف کر دیا۔۔۔ اور کمرے میں ایک دم اندھیرا سا چھا گیا۔۔۔

کامران نے دیکھا وہ سر تک اپنے چاکلیٹی کمبل کو کھینچ رہی تھی۔۔۔ اور تب اس نے دکھ سے سوچا۔۔۔ "کہ عاطقہ اپنے بس میں نہیں۔۔۔" اور وہ بھی اس اندھیرے میں اپنے دکھ کے ساگر میں ڈوبنے کے لئے سگریٹ کا سہارا ڈھونڈ بیٹھا —— جب سے عاطقہ کی بے رُخی بڑھتی رہی۔۔۔

کامران نے بھی سگریٹ پینے میں کمال حاصل کر لیا تھا۔ . . سارا کمرہ سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ . . رات کی خاموشی میں کامران کے سینے سے ہلکی ہلکی کھانسی کی آواز اس تاریکی اور خاموشی کو توڑتی رہی . . . عاطقہ اپنے کمبل میں چپکے چپکے روتی رہی شہاب کا ایک ایک فقرہ . . . اس کے کانوں میں سیسہ اُنڈیلتا رہا۔ . . دل پر غموں کے تودے سے پڑے نظر آئے . . . وہ کس دل سے شہاب کی روشنی کو دیکھے گی . . . وہ کون خوش نصیب ہو گی ——— جو اس کے شہاب کی دنیا کو جگمگائے گی . . . ساری رات سوچتے ڈوبتے اور روتے میں گذر گئی . . .

اور وہاں . . . جب بوجھل قدموں سے شہاب شیریں کے پاس آیا . . . تو یہ سن کر سکتے میں رہ گیا ——— کہ کامران ان کی تلاش میں وہاں تک پہنچا تھا۔ اپنی کم ظرفی پر وہ خود کو پھٹکارنے لگا . . . اسے اپنی ذات سے نفرت ہو گئی . . . جو عاطقہ کی زندگی میں جان بوجھ کر آگ لگا رہا ہے . . . اگر کوئی بات بھی کامران نے سن لی . . . تو وہ کسی قیمت پر عاطقہ کو اپنے گھر نہیں رکھے گا . . ایک شادی شدہ مرد کبھی یہ تصور بھی اپنے ذہن میں نہیں لا سکتا . . . کہ اس کی منکوحہ اس کی زندگی میں کسی اور سے ملے . . . خود چاہے . . . وہ دس عورتوں سے ملتا رہے . . . اس کی کوئی پابندی نہیں . . . . اس کی کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا . . . اس کے راستے میں آنے والا پتھروں کی طرح ٹھوکر مار کر دوسری طرف کیا جا سکتا ہے . . . شہاب کا دماغ سنسنانے لگا . . . معصوم سی عاطقہ پر اسے بے حد ترس آنے لگا . . . کہ وہ کس کس طریقے سے اسے جلائے گا . . . اگر کامران نے اسے گھر

سے نکال دیا ۔ ۔ ۔ یا کوئی شدید رنجش یا ناراضگی پیدا ہوگئی ——— تو ساری عمر کے لئے اس کی زندگی برباد کرنے کا وہ واحد ذمہ دار ہوگا ——— !! عاطقہ کی صدائیں التجائیں صدائے بازگشت بن کر اس کا ذہن بے قابو کرنے لگیں ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ شیریں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہنے لگا ۔ ۔ ۔ ۔

" شیریں میں اب کبھی شہر نہیں جاؤں گا ۔ ۔ ۔ ۔ شیریں میں کون سامنہ لے کر جاؤں ۔ ۔ ۔ آج میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی محبت کی توہین کر دی ۔ — اس کے سکون کا گلہ اپنے ہاتھوں سے کاٹ ڈالا ——— اس کی خوشیوں کو میں نے خود آگ لگا دی ۔ ۔ ۔ ۔ شیریں مجھے اپنے گھر لے چلو ——— کسی ایسی جگہ ——— جہاں مجھے کوئی جانا پہچانا چہرہ نہ نظر آئے ۔ ۔ ۔ میں کسی کے سامنے اپنا شرمسار چہرہ نہیں کر سکتا ۔ کیا ہونے والا ہے ——— ؟ میرا دل ڈوب رہا ہے ۔ ۔ ۔ وہ کہہ رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ اور شیریں حیرانی سے اس کا چہرہ تک رہی تھی ۔ ۔ ۔ اس نے آج تک اتنا پریشان شہاب کو نہیں دیکھا تھا ۔

" شیریں کیا تم بھی مجھے ساتھ لے جانے میں ہچکچا رہی ہو ۔ ۔ ۔ شیریں میں خود دھرتی کا بوجھ ہوں ۔ ۔ ۔ مجھ سے میرا سایہ دور بھاگتا ہے ۔ تمہیں بھی مجھ سے دور ہی رہنا چاہیئے ——— !"

" خان ۔ ۔ ۔ پریشان مت ہو ۔ ۔ ۔ میں پہاڑی لڑکی ہوں ۔ ۔ ۔ ہمارے خلوص میں پہاڑ جیسی بلندی ——— اور عظمت ہے ۔ ۔ ۔ اگر تمہیں یہ دنیا والے دکھ دیتے ہیں ۔ ۔ ۔ تو میں تمہارے سارے دکھ سمیٹ لوں گی ۔ ۔ ۔ !"

شیریں کی آواز میں بھرپور صداقت کی چاشنی صاف جھلک رہی تھی۔ ۔ ۔ شیریں نے اس کا ہاتھ تھاما۔ ۔ ۔ اور آہستہ آہستہ اسے موٹر کے قریب لائی۔ ۔ ۔

"شیریں۔ ۔ ۔ یہی امیروں کے جال ہیں۔ ۔ ۔ جس میں وہ تہی دامنوں کو گرفتار کر دیتے ہیں ــــــ میرا جی چاہتا ہے۔ ۔ ۔ کہ میں موٹر کو آگ لگا دوں ــــــ اور اس کے پٹرول کو خود پر چھڑک کر خودکشی کر لوں۔ ۔ ۔ زندگی بھر جلنے سے کہیں بہتر ہے ــــــ کہ ایک بار جل کر خاک ہو جاؤں۔ ۔ ۔!"

"ابھی تو تم چلو ــــــ میرے گھر۔ ۔ ۔ پھر کل آ کر اپنی موٹر واپس کر دینا"

"میں اس میں نہیں جاؤں گا۔ ۔ ۔ نہیں جاؤں گا ــــــ!"

"پیدل کیسے میرے گاؤں تک جاؤ گے ــــــ!"

"کسی اور سواری کا بندوبست کر لیں گے ــــــ!"

"یہ موٹر تو امانت ہے۔ اسے اس کی جگہ پر پہنچانا تمہارا فرض ہے!"

"او شیریں۔ ۔ ۔ میں کس کس امانت کو سنبھالتا پھروں۔ ۔ ۔"

اور شیریں کے کہنے پر وہ موٹر میں بیٹھ تو گیا ــــــ مگر اتنی تیزی سے وہ گاڑی چلا رہا تھا ــــــ کہ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ ۔ ۔ کہ آج یہ حد سے زیادہ پیئے ہوا ہے ــــــ اپنے ہوش و حواس میں نہیں۔ ۔ ۔ کئی بار حادثہ ہوتے ہوتے بچا۔ شیریں اسے اپنے گاؤں کی طرف لئے جا رہی تھی۔ شہر سے دور ہوتے ہی شہاب نے پوری رفتار سے گاڑی چھوڑ دی۔ ۔ ۔ اونچے اونچے پہاڑوں کے درمیان خاصا گھنا جنگل آ گیا۔ ۔ ۔

"بس تھوڑی دور جا کر میرا گاؤں آنے والا ہے"! شیریں نے آہستگی سے کہا...

شیریں نے دیکھا کہ شہاب کا سارا منہ پسینے پسینے ہو چکا تھا.... وہ ونڈ سکرین پر نظریں جمائے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ اتنے میں موٹر ایک جھٹکے سے رک گئی. بہت کوشش کے باوجود بھی... وہ موٹر آگے بڑھانے میں ناکام رہا.... دروازہ کھولا... نیچے اترا... مگر بے سود.... پٹرول تو ابھی ختم نہیں ہوا تھا مگر جانے گاڑی میں کون سا نقص تھا کہ اس کا انجن سٹارٹ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ شیریں دیکھ رہی تھی... کہ شام کے سائے بڑھ رہے تھے۔ اور موٹر نے آگے جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ گھر میں سب ہی اس کے منتظر ہوں گے۔ روز روز وہ کب تک بہانے بناتی رہے گی.... وہ بھی شہاب کے پیچھے اُتر آئی....

"خان اسے یہیں رہنے دو ——— تم پریشان بہت ہو... یہ ٹھیک نہیں ہو گی ———"! شیریں نے معصومیت سے کہا۔

"اتنا گھنا جنگل ——— اور رات سر پہ آ رہی ہے... اسے ٹھیک ہونا چاہیئے"! شہاب نے کمر سیدھی کرتے ہوئے کہا۔

"اس پہاڑی کے اس پار ہمارے گھر ہیں....!"

"تم اتنی دور سے کام کرنے کے لئے آیا کرتی تھیں....؟" شہاب نے پریشان پریشان سی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"سڑکوں سے آنے جانے میں راستہ لمبا ہو جاتا ہے. ہم تو پہاڑوں کے اوپر سے آسانی سے آ جاتے ہیں۔ اور اس طرح ہمارا راستہ بھی چھوٹا ہو جاتا ہے...

ہمارے گھروں سے آپ کا ڈاک بنگلہ زیادہ دور نہیں۔۔۔" شیریں نے میٹھی مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے کہا۔

"شیریں ——— شام ہو رہی ہے تم گھر جاؤ!"

"اور تم۔۔۔!"

"میں نہیں جاؤں گا!"

"اچھا نہیں لگتا ———!" (کیوں)

"کیوں اچھا نہیں لگتا ———؟"

"تمہارے گھر والے اعتراض کریں گے۔۔۔!"

"نہیں۔۔۔ ہم لوگ ایسے نہیں۔۔۔ میرے چچا کو مجھ پر بہت بھروسہ ہے!"

شیریں کے لہجے میں چٹان کی سی مضبوطی جھلک رہی تھی۔

"شیریں میں اس وقت نہیں جاؤں گا۔ ——— بہت پریشان ہوں۔۔۔ کسی سے بات بھی نہ کر سکوں گا۔ صبح ہوتے ہی آجاؤں گا ———!"

"رات اس جنگل میں گزارو گے ———؟"

"تم بھی تو جنگل میں رہتی ہو ———؟"

"میں تو گھر میں رہتی ہوں ———!"

"میرا بھی گھر ہے ———!"

"کہاں ———؟ شیریں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ابھی بتلاتا ہوں۔۔۔" یہ کہہ کر وہ ایک درخت کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔۔

اپنے رومال سے تھوڑی سی جگہ صاف کی۔ . . ایک پتھر اُٹھا کر لایا۔ . . اپنا کوٹ اتار کر نیچے بچھایا۔ . "یہ رہا میرا گھر . . . ! خانماں بربادوں کا یہ گھر کسی سے برا ہے"۔ شہاب نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"نہیں خان میں آپ کو یہاں نہیں سونے دوں گی ــــــــــ؟"

"کیوں ــــــــــ کیا ہے اس جگہ کو ــــــــــ؟"

"جنگل . . . . جنگلی درندے . . . . کیڑے مکوڑے سانپ بچھو وغیرہ اور بہت سی بدروحیں بھی تو رات کے وقت آوارہ پھرتی ہیں . . . . "شیریں کا دل ایک بار پھر درد سے بھر آیا . . . کہ وہ کسی کی ہمدردیاں نہیں لینا چاہتا . . . کسی کے پیار کا نشہ اب اسے بدمست نہیں کر سکتا ــــــــــ اب وہ اتنا بڑا دھوکہ کھانے کے بعد ــــــــــ مزید دھوکہ کھانے کے لئے قطعی تیار نہیں . . . .

"کیا سوچ رہے ہو خان ــــــــــ؟" شیریں نے سوچتے شہاب کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"یہی . . . کہ میں اتنا خوش نصیب نہیں . . . کہ تمہارے جنگل کے درندے کیڑے مکوڑے سانپ بچھو اور بدروحیں مجھے اپنا مہمان سمجھیں . . . ." شہاب نے ایک دل فگار آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"خان اُٹھو ــــــــــ گھر چلو ــــــــــ!"

"شیریں میرا ٹھکانہ آج رات یہی ہو گا۔ خدا کے لئے مجھے تنہا چھوڑ دو!" شہاب کا لہجہ ایک دم بیزاری ظاہر کرنے لگا . . .

شیریں جانتی تھی۔۔۔ کہ شہاب کی ضد کے آگے کوئی بات نہیں چل سکتی۔۔۔ تکرار بے سود ہے۔۔۔ اپنے مہمان کو ایسی جگہ بیٹھا دیکھ کر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے کانپتی آواز میں کہا۔۔۔

"اچھا میں گھر سے کوئی بستر لاتی ہوں ———!"

"شیریں مجھے آج اس زمین پر سو لینے دو۔ جس کا سینہ مجھے ابدی سکون بخشے گا۔ کل بھی اسی میں سونا ہے ——— آج سو لینے میں کیا ہے؟ بستر لاؤ گی تب بھی میں نہیں سو سکوں گا۔۔۔!"

"اچھا کھانا تو لاؤں ———؟"

"او شیریں! آج تو ایسا تلخ کھانا کھایا ہے۔۔۔ کہ زندگی کی ساری بھوک مٹ کر رہ گئی۔۔۔!"

"خان آپ کی ہر بات نہیں مانی جائے گی۔ میں کھانا جا کر لاتی ہوں۔۔۔!"

یہ کہہ کر شیریں لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی پہاڑی پر چڑھنے لگی۔۔۔ شہاب کے منہ سے ایک دلدوز آہ نکلی۔۔۔ اور اسی پتھر پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔۔۔ دماغ تو پہلے ہی سلگ رہا تھا۔۔۔ تنہائی اور مہیب سناٹے میں جنگلی جانوروں اور پرندوں کی آوازوں میں عاطقہ کی بھری بھری آوازیں سنائی دینے لگیں۔۔۔

"شابی! میں تم سے اپنی محبت کی بھیک مانگتی ہوں۔۔۔ خدا کے لئے اور کچھ نہ کہو۔۔۔ عمر بھر کی پوجا ——— نام کی مالا جپنا۔۔۔ پرندوں درندوں کی آوازوں میں بھی یہی پکار تھی۔۔۔ کہ تم نے عاطقہ کے ساتھ زیادتی کی۔۔۔

وہ تو تمہیں پوچھتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ تم نے یہ کیا کیا ——— ؟؟ اگر عاطقہ برباد ہوگئی تو ۔ ۔ ۔ ۔ تم ——— اور صرف تم ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی بربادی کے ذمہ دار ہو گے ۔ ۔ ۔ ۔ صدائے بازگشت نے اس کی بیقراری اور بے چینی میں اور اضافہ کر دیا ذہن کچھ پہلے سے پراگندہ تھا ۔ ۔ ۔ ۔ گزری ہوئی باتوں نے اسے مزید پریشان کر دیا رات کی تاریکی بڑھنے لگی ۔ ۔ ۔ ۔ وہ بیقراری سے زمین پر لوٹنے لگا ۔ ۔ ۔ ۔ دل کی آگ نے اس کے وجود کو آتش کدہ بنا دیا ۔ ۔ ۔ کہ اچانک کسی چیز کے سرسرانے کی آواز سی سنائی دی ۔ اندھیرے میں دو سرخ سرخ سی چمکتی آنکھیں دکھائی دیں ۔ ۔ ۔ ۔ شہاب کے سارے جسم میں خوف کی جھرجھری سی آ گئی ——— اس سے پیشتر کہ وہ سنبھلتا ۔ ۔ ۔ اسے اپنی کلائی پر سوئیاں سی چبھنے لگیں ۔ ۔ ۔ وہی ہاتھ بے حس سا ہونے لگا ۔ سارے سر میں ہلکے ہلکے چکر آنے لگے ۔ ۔ ۔ ۔ آنکھیں بوجھل ہونے لگیں ۔ ۔ ۔ سارا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا ۔ ۔ ۔ خون کی گردش تیز ہونے لگی ۔ ۔ ۔ عجیب سا خمار چھانے لگا ۔ ۔ شہاب نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا ۔ ۔ ۔ ۔

” دوست سامنے تو ۔ ۔ ۔ ۔ آ جاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے محسن کو ۔ ۔ ۔ جی بھر کے ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھ لوں ۔ ۔ ۔ ۔ جس نے مجھے ذہنی اذیت ۔ ۔ ۔ ۔ دلی خلش ۔ ۔ ۔ ۔ اور عمر بھر کی تڑپ سے ۔ ۔ ۔ نجات دلا دی ۔ ۔ ۔ ۔ “

سرسراہٹ غائب ہو چکی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ شہاب پسینے سے تر بتر خمار کی حالت میں بے سدھ لیٹا ہوا تھا کہ دور سے شیریں ایک مشعل لئے بڑی تیزی سے بھاگی چلی آ رہی تھی ۔ ۔ ۔ ایک ہاتھ میں کھانے کی پوٹلی ۔ ۔ ۔ ۔ کندھے پہ پانی کی بوتل ۔ ۔ ۔ ۔

اور بغل میں بستر کی ایک چادر...اتنا سامان اٹھانے کے باوجود اس کے قدم تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگے....

اندھیرے میں ایک بیقرار آواز ابھری....

"خان سو رہے ہو....؟"

"خان.... نیند آگئی.... اتنا کہہ کر اس نے مشعل کی روشنی اس کے چہرے پر ڈالی....

شہابی چہرہ پسینے سے تر بتر....آنکھوں میں ایک شرابی کی سی کیفیت شیریں کا رواں رواں برچھیاں بن گیا....اس نے شہاب کو بیقراری سے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا——

"خان کچھ تو بتلاؤ—— کہ کیا ہوا——؟ اس زہریلی فضا نے تمہیں کس طرح بے سُدھ کر دیا۔ خان... کچھ تو بولو...تم تو میرے مہمان ہو... اس جنگل کے مہمان تھے....کس ظالم نے اپنی مہمان نوازی کو توڑا...مجھے دو لفظ کہہ دو... میں اس ظالم کو پاتال کی گہرائیوں سے ڈھونڈ کر لاؤں گی...اور اسے اس جرم کی ایسی سزا دوں گی...کہ رہتی دنیا تک اس کی نسلیں یاد کریں گی؛...شیریں سسک سسک کر بیقراری سے اسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھ رہی تھی....شہاب کچھ کہنا چاہتا تھا مگر زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی.... دماغ میں عجیب قسم کی ہلچل مچی ہوئی تھی.... غنودگی—— اور خمار... میں صرف ایک دُھندلا سا عکس دیکھ رہا تھا... اس کی بیقراری اس کی تڑپ اس کی بے چینی... محسوس کر رہا تھا...مگر بولنے

کی طاقت سلب ہو چکی تھی.... کہ اچانک شیریں کی نگاہ اس کی سفید کلائی پر پڑی...
ایک نیلے سے رنگ کا نشان پھیلتا جا رہا تھا.... اور اس کی رنگت سیاہی مائل ہوتی جا
رہی تھی.... وہ فوراً صورتِ حال کو پہچان گئی.... اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے
درخت کے تنے کی طرف دیکھا.... جہاں صرف ایک لکیر اس حادثے کی یاد تازہ کر رہی تھی
ایک دم اس کا دماغ جاگا.... بچپن سے جنگلوں میں پلنے والے.... جنگلی درندوں
کیڑے مکوڑوں.... اور سانپ بچھو سے کھیلنا خوب جانتے ہیں.... اُسے صرف
کاٹنا آتا ہے.... بغیر کسی تاخیر کے.... اس نے اپنے مقدس ہونٹوں کو اس نشان
پر رکھ دیا.... اور ہلکے ہلکے چوسنے لگی.... شہاب کے دماغ کی دھند چھٹنے لگی...
ہونٹوں کا گرم لمس ہونے لگا.... مشعل کی روشنی میں شیریں کا کانپتا تڑپتا.... زرد ہوتا
ہوا چہرہ نظر آنے لگا۔ اس کے سرخ رخساروں پر پسینے کے قطرے اس طرح نچھاور
ہونے لگے.... جس طرح گلاب کی سرخ پنکھڑیوں پر شبنم کے قطرے.... شہاب
کی آنکھیں کھل گئیں.... شیریں بھیگے ہوئے بالوں کو سمیٹتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی...
اور ایک لمحے کا توقف کئے بغیر.... اُلٹے قدموں سے بھاگتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی
ہلکا ہلکا سا نشہ اب بھی شہاب کے دماغ میں محسوس ہو رہا تھا.... وہ اُٹھ بیٹھا...
ادھر ادھر نگاہ دوڑائی.... کھانے کی پوٹلی.... پانی کی بوتل.... اور ایک
بڑی سی چادر.... اس کے قدموں میں پڑی ہوئی تھی.... اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا
کہ یہ کیا قصہ ہے ———— ؟ ایک جنون.... پھر سے جاگا.... اور وہ بھاگتا
ہوا اپنی کار کی طرف بڑھا.... اس نے بڑی بیدردی سے ایکسل دبایا....

اور ایک شدید جھٹکے کے ساتھ ہی کار سٹارٹ ہو گئی۔۔۔۔ وہ اپنی پوری طاقت سے تیز رفتاری کا نیا ریکارڈ قائم کر رہا تھا۔۔۔۔ کالے کالے پہاڑ خاموشی سے اس دیوانے کی حرکت کو دیکھ رہے تھے۔۔۔۔ لمبے لمبے درختوں کے سائے۔۔۔ سڑکوں کے موڑ۔۔۔ تنگ و تاریک راستے اس دیوانے کو خود بخود راستہ دے رہے تھے۔۔۔۔ شہر کی آبادی دور سے نظر آ رہی تھی۔۔۔۔ ایسا محسوس ہوتا تھا۔۔۔ شہر کی روشنیوں کو دیکھ کر۔۔۔ جیسے کوئی پریم پجارن اپنے دیوتا کے انتظار میں اپنی محبت کے دیئے روشن کیے۔۔۔ اس کی راہوں کو جگمگا رہی ہے۔۔۔۔ ایک کار تیزی سے ان روشنیوں کو چھوڑتی ہوئی۔۔۔ اپنے اُجڑے آشیانے کی طرف بڑھ رہی تھی۔۔۔۔ جس کے دل کی روشنی بُجھ چکی ہو ——— وہ ان روشنیوں سے کیا متاثر ہو گا۔۔۔۔

"آصف ولا" کی عظیم الشان عمارت اس کی نظر کے سامنے تھی۔۔۔ گیٹ بند ہو چکا تھا۔۔۔ اس نے وحشیانہ انداز میں زور زور سے ہارن دینے شروع کر دیئے۔۔۔ کہ فضلو بابا اپنی کوٹھری سے آنکھیں ملتے ہوئے۔۔۔ تیز تیز قدموں سے بھاگتے ہوئے گیٹ تک پہنچے۔۔۔ گیٹ کا تالا کھولا۔۔۔۔ اور اس کے دونوں پٹ وا کر دیئے۔۔۔۔

ہیڈ لائٹس کی روشنی میں فضلو بابا نے شہاب کی عجیب سی کیفیت دیکھی۔ جس بچے کو اس نے بچپن سے دیکھا ——— اس کی ساری جوانی دیکھی۔۔۔۔ مگر ایسی کیفیت آج تک اس کی نظر سے نہیں گزری۔۔۔۔ بابا کے ذہن میں ایک ہی خیال تھا۔۔۔ اور وہ یہ ——— کہ اتنی رات گئے۔۔۔۔ سوائے

ایک شرابی کے اور کون کر سکتا ہے۔۔۔ بابا کو کیا معلوم ——— ؟ کہ آج کون سی شراب کی تیز ابیت اس کے خون میں سرایت کر چکی ہے۔۔۔ بن پئے وہ سرور ملا کہ سارے غم خود بخود فراموش ہو گئے۔۔۔ زندگی کی ساری تلخیاں۔۔۔ اس کڑوے نشے میں اس طرح گھل مل گئیں۔۔۔ جس طرح چائے میں شکر۔۔۔

گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے۔۔۔ وہ بہکے بہکے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگے۔۔۔ بوڑھے بابا کا دل ایک دم نفرت سے بھر گیا اور وہ آہستگی سے بڑبڑایا۔۔۔

"ساری شرافت ان بہکتے قدموں تلے روند دی۔۔۔ میں تو تمہیں دیوتا سمجھتا تھا۔۔۔ مگر تم ایک بزدل انسان ہی نکلے۔۔۔!" وہ سر جھکائے اپنی کوٹھری میں چلے گئے۔۔۔

گرتا پڑتا۔۔۔ شہاب اپنے کمرے میں بمشکل تمام پہنچا۔۔۔ کمرے کے سامان کی بے ترتیبی اس بات کو صاف ظاہر کر رہی تھی۔۔۔ کہ اس گھر میں اس مسکین کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔۔۔ کوئی اس کے کمرے میں اپنا وقت ضائع کرنے کے لئے تیار نہیں۔۔۔ شہاب نے وحشیانہ انداز میں سارے کمرے کا جائزہ لیا۔۔۔

گھومتے سر کے ساتھ۔۔۔ پھر سے سارے واقعات پردۂ سکرین کی طرح اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔۔۔ اگر عاطقہ کو اس کے شوہر نے نکال دیا تو اس وقت اس کی پوزیشن کیا ہو گی ——— دنیا والے اس کے منہ پر تھوکیں گے۔۔۔ کہ ساری عمر جس تھالی میں کھایا ——— اسی میں چھید کر دیا

عاطقہ

سُلگتے ؛ ہن کے ساتھ اور لڑکھڑاتے قدموں سے وہ اُٹھا۔۔ اپنا اٹیچی کھولا، کچھ سامان نکالا۔۔۔ کہ اس ماحول سے جتنی جلدی ہو سکے۔۔۔ نکل جائے۔۔۔ تاکہ بعد کے تلخ واقعات اسے دیکھنے نہ پڑیں۔۔۔ کپڑوں کے نیچے سے ایک گلابی اون کا چھوٹا سا موزہ اُچھل کر باہر گر پڑا۔۔۔

ہونہہ!۔۔۔ سب خواب۔۔۔ سب بے حقیقت باتیں ہیں۔۔۔؛ کہ اچانک اس کی نگاہ خواب آور گولیوں کی اس شیشی پر پڑی۔۔۔ جو وہ عاطقہ کے کمرے سے لایا تھا۔۔۔ اور ایک دوسری شیشی میں ڈال کر اس راز کو چھپا گیا۔۔۔ اس نے بے خودی میں وہ گولیاں نکال کر اپنی ہتھیلی پر پھیلا دیں۔۔۔ اور ایک ٹکٹکی جمائے انہیں دیکھتا رہا۔۔۔ باریک باریک سی سفید گولیاں اس کی ہتھیلی پر پھیلتی۔۔۔۔ سُکڑتی رہیں۔۔۔ عاطقہ کا وجود ایک سرخ لباس میں نظر آنے لگا۔۔۔ اس کی مانگ میں افشاں کی چمک۔۔۔ آنکھوں میں حسرتوں کی جوت جلائے اپنے بھیانک انجام کو سوچتے ہوئے کسی گہری سوچ میں مستغرق نظر آئی۔۔۔

شہاب کا وجود لرزنے لگا۔۔۔ اس کے بھیانک انجام کو خود ہی ایک خوشگوار موڑ دے کر بھی وہ بے سکون ہی رہا۔۔۔ وہ مرنا چاہتی تھی۔۔۔ وہ اسے مرنے کہاں دیتا۔۔۔ اب وہ زندان میں تڑپ رہی ہے۔۔۔ تو اسے تڑپنے سے روکا جا رہا ہے۔۔۔ وہ ازدواجی زندگی کا بھرم نبھانا چاہتی ہے تو اسے سرِراہ لا کر اتنا ذلیل کر دیا۔۔۔ کہ وہ دوبارہ اپنے شوہر کا سامنا نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔

یہی گولیاں۔۔۔۔ جو اسے ابدی سکون دینا چاہتی تھیں۔۔۔۔ ایک ظالم کے ہتھے چڑھ کر اسے ہمیشہ کی بے سکونی اور خلش دے گئیں۔۔۔۔ اب یہی گولیاں اس ظالم کو اپنے کیے کی سزا دینے کے لئے اس کی ہتھیلی پر مچل رہی تھیں۔۔۔۔ زہر کی چوٹ کھا کر بھی۔۔۔ وہ ظالم تڑپنے سسکنے کے لئے زندہ ہے۔۔۔۔ یہی اس کے گناہوں کی کڑی سزا ہے۔۔۔۔ اب دوسرے زہر کو کھا کر بھی۔۔۔۔ وہ پرُسکون ہو گا ——— یا نہیں۔۔۔۔

دماغ میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔۔۔۔ ایک آندھی سی اٹھی ہوئی تھی۔۔۔ ہر طرف بگولوں۔۔۔۔ اور گرد کے طوفان اس کی زندگی کے نشاں کو مٹانے کے لئے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔۔۔۔ ذہن پر دھند سی چھانے لگی۔۔۔ عاطقہ کا بے بس چہرہ۔۔۔۔ غمگین۔۔۔۔ سدا کی پرُنم آنکھیں۔۔۔۔ شیریں کا بھیگا بھیگا سا چہرہ چڑھی ہوئی آنکھیں۔۔۔۔ کانپتا سا وجود۔۔۔ زرد زرد سی رنگت لامتناہی سوچوں کا غبار بڑھتا گیا۔۔۔۔ عاطقہ کا وجود ——— شیریں میں مدغم ہونے لگا، اور شیریں کا عاطقہ میں۔۔۔۔ دونوں اس کی طرف بڑھنے لگیں۔۔۔۔ دونوں کے ہاتھ اس کے گریبان کی طرف بڑھے۔۔۔۔ اور شہاب نے بھری ہتھیلی کی گولیاں اپنے گلے میں اتار دیں۔۔۔۔ سائے دھندلے ہونے لگے۔۔۔۔ بگولوں اور گرد کے طوفان سمٹنے لگے۔۔۔۔

٭

عاطفہ کے سرہانے کامران بیٹھا ۔ ۔ ۔ بڑی اپنائیت سے اس کی مہکتی زلفوں کو سنوار رہا تھا ۔ ۔ ۔ سوئی سوئی عاطفہ ایک دم چونکی ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے حیرت سے اپنی پلکیں اُٹھائیں ۔ ۔ ۔ ۔

اپنے تصور پر خود ہی افسردہ ہو گئی ۔ ۔ ۔ ۔ وہاں تو کوئی اور تھا ۔ ۔ ۔ کامران ۔ ۔ ۔ اس کا شوہر ۔ ۔ ۔ افسردہ آنکھوں میں گہری سوچوں کا غبار تھا ۔ ۔ ۔ ۔

"عطی طبیعت خراب ہے ۔ ۔ ۔ کچھ ماتھا گرم سا محسوس ہو رہا ہے!"
کامران نے اس کے مہکتے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔

"سر میں چکر ہے ۔ ۔ ۔ اور کچھ طبیعت خراب ہے اور بوجھل سی محسوس ہو رہی ہے!"

"سوچیں چھوڑ دو ——— خوش رہا کرو ۔ ۔ زیادہ سوچ بچار

ذہن پر بوجھ ڈالتے ہیں.... ! کامران کی آواز لرزنے لگی۔

"کوشش تو بہت کرتی ہوں.... مگر یہ پیچھا نہیں چھوڑتیں...!"

عاطفہ کی آواز میں بیچارگی تڑپنے لگی۔

"اپنے آپ کو مصروف رکھا کرو.... میں کچھ دن کے لئے چھٹی لے رہا ہوں

تمہیں کسی تفریحی شہر میں لے جاؤں گا.... تاکہ تمہارے ذہن کا بوجھ اس

شہر کے حسین

نظارے... زندگی کی ... گہما گہمیاں دیکھ کر دور ہو سکے....

چلو گی.... عطی...." کامران نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے اپنی انگلی

رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں کسی نئے دیس میں! عاطفہ نے پلکیں جھکائے جواب دیا..

"اُٹھو...... ذرا نیم گرم پانی سے غسل کرو.... طبیعت بحال ہو جائے گی۔

میں آج ہی چھٹی کی درخواست دے رہا ہوں.... اور کل پرسوں تک ہم اس گھٹے

ہوئے ماحول سے فرار ہو جائیں گے.... جہاں میری عطی —— مجھ سے

قریب ہوتے ہوئے بھی سینکڑوں کوس دور رہی.... خدا کرے نیا ماحول

نیا شہر میری زندگی میں بہار کی رعنائیاں لے کر آئے.... تمہاری زلفوں کی مہکتی

ہوئی شاموں میں میں.... اپنی زندگی کا ہر دکھ بھول جاؤں...." اتنا کہہ کر

کامران بے خود ہو کر جھکا —— اور بے خودی میں اس کی مہکتی زلفوں کو

ہلکے سے بوسہ دے کر کھڑا ہو گیا....

"میں ذرا باورچی خانے تک جا رہا ہوں ——— !"

"کیوں ——— ؟"

"تمہارے غسل کے لئے پانی مل سکے گا یا نہیں ۔۔۔۔ ؟"

"نہیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ میں خود جا کر معلوم کر لوں گی ۔۔۔۔ اب دفتر کے لئے تیار ہو جائیں ——— میری وجہ سے دیر ہو رہی ہے" عاطفہ نے ایک دم اُٹھتے ہوئے کہا ۔

"سُن لو جی ——— آج میں دفتر نہیں جاؤں گا ——— !" کامران نے انوکھی مسرّت سے سرشار ہوتے ہوئے کہا ۔

"یہ کیا بات ہوئی" عاطفہ نے حیرانی سے پوچھا ۔

"تم نہیں سمجھ سکو گی ۔۔۔ کہ آج میں کتنا خوش ہوں ۔۔۔ !" اتنا کہہ کر کامران نے اُسے کندھوں سے تھام کر اپنے قریب کر لیا ۔۔۔

عاطفہ تڑپی ۔۔۔ اور بازوؤں کے حلقے میں سے نکل کر باورچی خانے میں چلی گئی ۔۔۔ پانی گرم تھا ۔۔۔۔ نیم گرم سے غسل کیا ۔۔۔۔ مگر طبیعت کی کسلمندی پھر بھی نہ گئی ۔۔۔۔ اُداس اُداس شہابی چہرہ دمک رہا تھا ۔۔۔ کامران اس کے وارڈروب کو کھولے ڈھیر سارے کپڑوں کو پھیلائے اس کے لئے کسی انوکھے جوڑے کا انتخاب کر رہا تھا ۔۔۔

ہلکے زرد رنگ کا لباس پہنے ۔۔۔ گیلے بالوں کو تولیئے سے لپیٹے وہ اپنے کمرے میں آ گئی ۔۔۔ ڈھیر سارے کپڑے مسہری پر بکھرے ہوئے دیکھ

کر بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔۔۔۔

"یہ کیا کر رہے ہیں ———؟"

کامران نے پلٹ کر دیکھا۔۔۔۔ بے چین نظریں مچلنے لگیں۔۔۔ زرد رنگ کے لباس میں ہمیشہ سے کہیں زیادہ عاطقہ اسے پیاری لگی۔۔۔۔ بھیگے بھیگے بالوں کو وہ اپنی پشت پہ پھیلا چکی تھی۔۔۔۔ اس کا شہابی رنگ آج زیادہ ہی دمک رہا تھا۔۔۔ کامران کے ہاتھ میں آتشی رنگ کا ایک خوبصورت جوڑا تھا۔۔۔ اسے وہیں مسہری پہ رکھ کر۔۔۔۔ اس کے قریب آگیا۔۔۔۔ عاطقہ نے پل بھر کے لئے اپنی نظریں اٹھائیں۔۔۔۔ کامران کی تڑپتی نگاہوں کا سامنا نہ کرتے ہوئے جھٹ اپنی پلکیں جُھکا دیں۔

"پانی گرم تھا نا ———؟" کامران کی آواز میں لغزش سی سنائی دی۔

"ہو نہہ۔۔۔۔!"

"طبیعت کچھ بحال ہوئی ———؟"

"محسوس تو نہیں ہو رہی ———!" عاطقہ نے بے دلی سے کہا۔

"عطی۔۔۔۔ تم جب بھی غسل کرتی رہیں۔۔۔ میں تمہیں دیکھ کر بے چین ہو جاتا رہا۔۔۔۔ بعض حسن بھیگنے سے کتنے قیامت خیز ہو جاتے ہیں۔۔۔ یہ بھیگی بھیگی زلفیں۔۔۔۔ یہ نکھرا نکھرا سا رنگ۔۔۔۔ مجھے اس بارش کے بعد آسمان کی رنگت کا احساس دلاتا ہے جو کہیں زیادہ نکھر جاتا ہے۔۔۔ اور یہ بھیگی بھیگی پلکیں۔۔۔ نشیلی آنکھوں کو چُھپائے۔۔۔ مجھے اکثر بے چین رکھا کرتی تھیں۔۔۔ عطی!

مجھ سے کیوں دور رہیں۔ ۔ ۔ میں تمہیں آج یہ حقیقت بتا رہا ہوں کہ میں تمہیں پوجنے کی حد تک چاہتا رہا۔ ۔ ۔ میرا دوسرا عمل بالکل جھوٹ۔ ۔ ۔ مذاق دکھاوا تھا۔ ۔ ۔ میں نفرتوں کے بیج بو کر تمہاری محبت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ۔ ۔ ورنہ خدا گواہ ہے۔ ۔ ۔ کہ تمہیں دکھ دے کر۔ ۔ ۔ تمہیں افسردہ کر کے میں بھی ساری رات کروٹیں بدلتا رہتا۔ ۔ ۔ دل تو چاہتا تھا۔ ۔ ۔ کہ ان حدود کو توڑ کر۔ ۔ ۔ جو تم نے اپنے گرد پھیلا رکھی ہیں۔ ۔ ۔ تمہیں اپنے قریب کر لوں۔ ۔ ۔ اور تڑپ کر کہوں۔ ۔ ۔ عطی تم تو خود محبّت کرتی ہو۔ ۔ ۔ محبّت کی بے چینی کو بخوبی سمجھتی ہو۔ اہل دل تو بڑے پُردرد ہوتے ہیں۔ ۔ ۔ تم اگر مجھے محبت نہیں دے سکتیں، تو خلوص ہی دے دو ——— اپنی ہمدردیاں ہی بخش دو۔ ۔ ۔ دو میٹھے بولوں سے بھی یہ ترسا ہوا دل بہل سکتا ہے۔ ۔ ۔" کامران اس کے بھیگے بالوں کو اپنے سینے سے لگائے بولے جا رہا تھا۔ ۔ ۔

عاطقہ کانپنے لگی۔ ۔ ۔ اور آہستہ سے مسہری پہ بیٹھ گئی۔ ۔ ۔ کامران کی صاف باتوں کا اس کے پاس کیا جواب ہو سکتا تھا۔ ۔ ۔ وہ خود کو مجرم سمجھنے لگی۔ ۔ ۔ رنگت ایک دم زرد پڑ گئی۔ ۔ ۔

"طبیعت خراب ہو رہی ہے عطی! "کہہ دو جی!۔ ۔ ۔ کیونکہ آج ڈیڑھ برس سے میں یہی دیکھ رہا ہوں۔ ۔ ۔ کہ تم عین اس وقت اپنی طبیعت کی خرابی کا اعلان کر دیتی ہو۔ ۔ ۔ جب ایک بیقرار دل تڑپ کر تمہارے قدموں میں جُھکنے کے لیے بیتاب ہوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب بھی میری وارفتگی بڑھی۔ ۔ ۔

تمہارا نازک مگر سنگدل، احساس سرکش ہو گیا اور تم ہر جگہ ایک جھٹکے..... ایک ٹھوکر سے یہ کہہ کر.....

"کہ میری طبیعت خراب ہے..... اپنا سنہری کمبل اوڑھ کر منہ دوسری طرف کر کے لیٹ جاتی رہیں..... عطی! مرد کے پاس صرف ایک غرور نام کی چیز ہوتی ہے..... جس سے وہ صنفِ نازک پر حاوی رہتا ہے..... اگر وہ غرور ہی چکنا چور ہو جائے..... تو مرد کے پاس کیا رہ جاتا ہے..... میں تمہیں اپنی کسی بھی طاقت سے نہ جیت سکا عطی.....!

تم جیت گئیں — تمہارا پیار جیت گیا..... میں ہار مان گیا......"

میں ہار مان گیا..." .. اتنا کہہ کر ایک سنجیدہ باوقار معزز انسان اس کی گود میں سر رکھے بچوں کی طرح پھوٹ کر رو رہا تھا.....

عاطفہ کی آنکھوں سے بے تحاشہ آنسوؤں کے قطرے گرنے لگے..... اور کامران کا چہرہ بھگونے لگے..... اس کے دل میں عجیب و غریب قسم کا درد جاگ اٹھا..... اس کا ایک ہی فقرہ اسے یاد رہا۔ "کہ اہل دل تو بڑے پر درد ہوتے ہیں....."!

عاطفہ کی برستی ہوئی آنکھوں نے کامران کے سلگتے ہوئے شعلے کو سرد کر دیا اس نے سرخ سرخ سی آنکھوں سے عاطفہ کی طرف دیکھا..... اور آہستہ سے کہا.....

"عطی..... میری زیادتی ہے..... تم اپنی جگہ مجبور ہو —

میں اپنی جگہ مجبور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ‘‘ !

’’ نہیں کامران یہ میرا فرض تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو میں بھولی ہوئی تھی ۔ ۔ ۔ ‘‘

عاطقہ نے ندامت سے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔

’’ بعض فرض دل کی گہرائیوں سے ادا کئے جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ بعض انتہائی مجبوری کے عالم میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمہیں کونسے فرض کو نبھانا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ‘‘ کامران نے چوٹ کرتے ہوئے کہا ۔ فرض بہر حال فرض ہوتا ہے ۔ آج سے اس فرض میں کوئی کوتاہی نہیں ہو گی ! اگر تم مجھے یہ فرض میرے تڑپنے رونے کی بھیک میں دے رہی ہو ۔ ۔ ۔ تو غلطی ہیں مجبوری کا فرض تمہیں واپس لوٹا دوں گا ۔ ۔ ۔ ۔ میری محبت کی شمع تمہیں پگھلا نہ سکی ۔ ۔ ۔ ۔ میرا خلوص تمہیں جھکا نہ سکا ۔ ۔ ۔ ۔ تو میں زبردستی کا قائل نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر اس اصول پر کاربند نہ ہوتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو آج ڈیڑھ برس سے تم میرے ظلم و ستم کا نشانہ بن چکی ہوتیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

نہیں نہیں کامران ایسی بات نہ سوچئے ۔ ۔ ۔ ۔ ‘‘ اتنا کہہ کر عاطقہ نے اپنے سفید سفید نازک ہاتھ اسکے لبوں پر رکھتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ’’ میں تمہارے اخلاق ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صبر اور اعلےٰ ظرفی کی معتقد ہو چکی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ کئی بار دل کو سمجھایا دماغ کو سمجھوتے کے لئے تیار کیا ۔ ۔ ۔ ۔ مگر پھر میرے احساس کی کوئی کرچی ایسی چبھتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ میں دل و دماغ کو تڑپتا چھوڑ کر ۔ ۔ ۔ بے حس سی ہو جاتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ! عاطقہ کا چہرہ درد

سے بالکل سفید سا ہو گیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ اور کامران اسے مسلسل تکے جا رہا تھا۔

" عطی کیا یہ تم سچ کہہ رہی ہو۔ ؟"

" اسکا یہ مطلب ہوا کہ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ۔ ؟"

" نہیں نہیں ایسی بات نہیں ۔ غلط مت سوچو ۔ ۔ ۔ !"

" آپ ہی تو مجبور کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !"

" پھر لفظ مجبور تمہارے لبوں پر آ گیا ۔ ۔ ۔" عطی خدا کے لئے مجھ پر ترس نہ کھاؤ مجھے ہمدردی کی بھیک مت دو ۔ ۔ ۔ ۔ جب مجھے کوئی ہمدردی کر دیکھتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ یا رحم کی بھیک میری جھولی میں ڈالنا چاہتا ہے ۔ تو میرا احساس زخمی ناگن کی طرح تڑپ اٹھتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس وقت میری کیا حالت ہوتی ہے عطی وہ تم نہ سمجھ سکو گی ۔ ۔ ۔ ۔ "کامران پھر سے سر کو پٹخنے لگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

عورت کی محبت کو آج تک کوئی نہ سمجھ سکا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی نفرت کو زمانہ فوراً سمجھ جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر اس کے خلوص وفا کو پہچاننے میں کیوں ہچکچاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ شاید انہیں یقین نہیں آ سکتا کہ مرد کے مقابلے میں ایک کمزور ترین ہستی اٹوٹ طریقے سے پیار نبھا سکتی ہے ۔ ؟ اس پیار کو نبھانے کے لئے وہ دنیا کی ہر طاقت سے ٹکرانے کی قدرت پیدا کر لیتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر اس محبت کو سمجھنے والا ایک بھی مخلص مل جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو وہ اسکے خلوص کی قدر دان ہو کر دل سے اس کے سامنے جھک جاتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ جو اس کے درد کو سمجھ نو سکا

. . . ایک گونگے انسان کے جذبۂ تشکر کو آپ کیسے سمجھ سکیں گے . . . ؟؟ جب تک آپ کی نگاہ میں وسعت نہ ہو . . . . آنکھ بینا ہو تو گونگے کا جذبۂ خلوص آپ اس کی آنکھوں سے پڑھ سکتے ہیں . . . . . . عورت کا مطالعہ کرنا ہو . . . تو آپ اس کے کسی بھی فعل سے اس کا خلوص کو جانچ نہ سکیں گے . . . . وہ اپنے فرائض دل کی گہرائیوں . . . . یا بحالت مجبوری کچھ اس تندہی سے کرتی کرتی ہے . . . . . کہ بڑے سے بڑا عقلمند بھی اسے سمجھ نہیں پاتا اور بعض اوقات ایک چھوٹا سا حساس انسان اس کی آنکھوں کی گہرائی میں ڈوب کر خلوص کے وہ موتی چن لیتا ہے . . . . . جسے حاصل کرنے کے لیے عمر بھر کی ریاضت درکار ہے . . . کچھ یہی حال کامران کا تھا . . . . کہ وہ آخر تک عاطفہ کو سمجھ نہ سکا . . . . بے شک عورت زندگی میں ایک بار . . . . . صرف ایک بار . . . . . . اپنے دل کے کواڑ . . . . کسی کے لئے آہستگی سے کھولتی ہے . . . . پھر چاہے عمر بھر . . . . کوئی اس کواڑ پر زور زور سے دستک دیتا رہے وہ دوبارہ نہیں کھل سکتے . . . ہاں کوئی مخلص اپنے سچے خلوص سے پھر ان بند کواڑوں کو کھولنے میں کامیاب ہو سکتا ہے . . . . بشرطیکہ . . . . . . آہستگی . . . . ملائمت . . . خلوص . . . . . اور اپنائیت سے دستک دی جائے . . . . . . پہلی جگہ مخصوص ہو چکی ہے دوسرا آنے والا وہ مسند تو نہیں پا سکتا . . . . ہاں بیٹھنے کی جگہ ضرور مل جائے گی . . . . . اور میرے خیال میں اتنا ہی احساس خوشی دے سکتا ہے . . . . کہ اس جگہ داخل ہونے . . . . . یا بیٹھنے کی اجازت تو مل گئی ہے . . . .

اب یہ بعد میں آنے والے کا اختیاری فعل ہے۔۔۔ کہ وہ پہلی جگہ سے کتنی قریبی جگہ حاصل کر سکتا ہے۔۔۔۔۔ اور اس کے لئے اسے خلوص کی کتنی گہرائیوں میں غوطہ زن ہونا پڑے گا۔۔۔۔۔۔

عاطقہ نے کامران کے آنسو پونچھے۔۔۔۔۔ اور ایک عزم سے کہا۔۔۔

"کامران۔۔۔۔۔ عاطقہ سے اب آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔

"کیا واقعی ؟ میں اتنا خوش نصیب ہوں۔۔۔۔۔!"

"اگر نہیں تھے تو اب ہیں۔۔۔۔ کہہ کر عاطقہ کھڑی ہو گئی

کہاں جا رہی ہو" ؟

"ناشتہ لینے۔۔۔۔!"

"پگلی آج ناشتے کی کیا ضرورت ؟ روح کو تازگی مل گئی۔۔۔ ذہن کو سکون مل گیا۔۔۔۔ پیٹ اپنی بھوک بھول گیا۔۔۔۔۔!" کامران نے ملائمت سے کہا "بھئی ہمیں تو بھوک لگی ہے۔۔۔۔!" کہہ کر عاطقہ باہر چلی گئی۔۔۔۔۔ کامران بے خودی میں اسکے کپڑوں کو سینے سے لگائے انوکھی سی لذت میں ڈوب رہا تھا۔۔۔ ہر طرف عاطقہ کی مخصوص خوشبو سحر جگا رہی تھی۔۔۔ کامران نے دیکھا۔۔۔ عاطقہ ہاتھوں میں ٹرے لئے ایک مدھم سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لئے کمرے میں داخل ہو رہی تھی

دونوں نے بڑے خوشگوار موڈ میں ناشتہ کیا۔۔۔۔ ناشتہ کرنے کے بعد۔۔۔۔۔ کامران نے آہستگی سے کہا۔۔۔

"عطی۔۔۔۔ وہ شادی والا سرخ جوڑا تو آج پہن کر دکھاؤ۔۔۔!"

"ہش کیسی بے تکی باتیں کر رہے ہیں — !" عاطفہ نے منہ پر انگلی رکھتے ہوئے پیار سے ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا۔ "اس میں بھلا بے تکے پن کی کیا بات ہوئی — ؟"

"بوڑھی گھوڑی لال لگام — !"

"یعنی آج ڈیڑھ برس کے بعد تم بوڑھی ہو چکی ہو — ؟"

"بالکل ..... !" عاطفہ نے اپنے دراز بالوں کو کندھوں سے جھٹکتے ہوئے کہا "تمہارا نظریہ بالکل غلط ہے جناب ..... تمہیں آج یہ کپڑے پہننے ہوں گے" کامران نے شوخی سے نظریں ملاتے ہوئے کہا .....

عاطفہ کا دل دھڑک اٹھا ..... دور بہت دور سے ماضی کا وہ دن جھانکا ..... جو اپنے اندر سینکڑوں طوفان ..... سینکڑوں درد کی لہریں لئے ..... اسے ڈبونے کے لئے بڑھتا چلا آ رہا تھا ..... ان شوریدہ لہروں میں ایک پرسکون طوفان بھی تھا ..... عاطفہ کو سوچ میں ڈوبا دیکھ کر کامران نے ٹوکا ..... !

"کیا سوچ رہی ہو عطی — ؟"

عاطفہ ایک دم چونک اٹھی ..... دل سے درد کی اک ہوک اٹھی ..... پھر سے ماضی کا غم جاگ اٹھا ..... میرا وجود ایک انجانی آگ میں سلگ رہا تھا دل پریشان تھا ..... روح افسردہ تھی ..... مگر آج کے حالات ایسے تھے ..... کہ عاطفہ عہد کرنے کے باوجود بھی اسے نبھانے کے لئے قاصر تھی۔ "آج تم میری پسند دیکھو — !" عاطفہ نے جھلملاتی نظروں کو جھکاتے ہوئے کہا ..... "ٹھیک ہے

عطی ۔ ۔ ۔ ۔ تمہاری پسند — ؟ اور میری پسند دو نہیں ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ! کامران نے ایک دم سمجھوتہ کرتے ہوئے کہا ۔

اور عاطفہ جلدی جلدی سارے کپڑے وارڈروب میں دوبارہ رکھنے لگی ۔ ۔ ۔

کہاں ہے تمہاری پسند — ؟

بے صبرے کیوں ہو رہے ہو ۔ ۔ !

تم ہی تو آتش شوق بھڑکا رہی ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

تو پھر ایسا کرو ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ دیر کے لئے تم ابو کے کمرے میں چلے جاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ واپس آؤ گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو تم میری پسند دیکھ کر دنگ رہ جاؤ گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !"

"تو کیا آج ایسے ٹھاٹ ہوں گے ۔ ؟"

"دیکھ لینا ۔ ! عاطفہ نے آہستگی سے کہا ۔ ۔ ۔ ۔

اور کامران اپنے سلیپر گھسیٹ کر باہر نکل گیا ۔ ۔ ۔ ۔

عاطفہ نے دروازہ بند کیا ۔ ۔ ۔ ۔ وارڈروب بند کیا ۔ ۔ ۔ ۔ اپنا اٹیچی کھولا ۔ ۔ ۔ اور سب سے نیچے شہاب کی تصویر نکالی ۔ ۔ ۔ ۔ اور بے تحاشہ اسے سینے سے لگا کر رو دی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"شابی ۔ ۔ ۔ ۔ آج سے تمہاری ہر یاد کو دفن کر کے عاطفہ منوں مٹی تلے سو جائے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آج کا دن اس کی زندگی کا آخری دن ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب تمہیں عاطفہ نہیں مل سکے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر تم ملے بھی تو مسز کامران سے ملو گے ۔ ۔ ۔ ۔ عاطفہ سے نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آج ایک ایسا سمجھوتہ کر لیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ جس میں عاطفہ نہیں مسز

کامران شامل ہو گی......!

پوری تصویر آنسوؤں کے سیلاب میں بہہ گئی۔۔۔ شدت غم سے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں......

دروازے کو ہلکی سی دستک کی آواز سنائی دی......

"کون......؟"

"کامران......"

"پانچ منٹ اور......!"

"جلدی کرونا......"

شابی زندگی میں جلدی جلدی کی آپکار پھیل رہی ہے۔۔۔ میری زندگی خدا حافظ.... میری محبت خدا حافظ.... کہہ کر عاطقہ نے مقدس انداز میں اس کے ماتھے پر اپنے پاکیزہ ہونٹ رکھ دیئے..... ایک بار آنسوؤں سے بھری ہوئی نگاہ اس پر پھر ڈالی...... اور ٹرنک کی سب سے نچلی سطح پر آہستگی سے تصویر رکھدی..... اور اس پر کپڑے پھیلا دیئے۔ اتنے احترام سے... جیسے قبر بند کرنے کے بعد اس کے لواحقین ادب و احترام سے مٹی کی مٹھیاں ڈالتے ہیں.... اسی اٹیچی سے اس روز والا لباس نکالا... جس میں وہ آخری دن شہاب سے ملی تھی۔ سفید بنارسی ساڑی نکالی...... اسی رنگ کا بلاؤز... سفید موتیوں کا ہلکا سا سیٹ بھی نکالا...... منہ دھو کر اس نے خود کو بمشکل تیار کیا.... دل بیٹھا جا رہا تھا..... ہاتھوں میں خوامخواہ رعشہ طاری ہو رہا تھا... ٹاپس کانوں

میں پہنے تھے۔۔۔۔ اور ہیں انگوٹھی کی طرح رہی تھی۔۔۔ جھنجھلا کر مغبور دیکھا۔۔۔۔
تو وہ انگوٹھی نہیں ٹوپیں تھے۔۔۔۔۔ خود ہی محجوب ہو کر رہ گئی۔۔۔ ہلکا سا میک اپ
کیا تاکہ زرد ہوتا ہوا رنگ چھپ سکے۔۔۔ آنکھوں میں دنیا جہاں کی ویرانی کی خاک
اڑتی محسوس ہوئی۔۔۔ الٰہی خیر۔۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔۔ سہاگ رات
نو لڑکی کی آنکھوں انجانے خواب تیرتے ہیں محبت و خلوص کا نشہ رنگ دیتا ہے۔ اور
یہاں حسرتوں ناکامیوں کی دھول اڑ رہی ہے۔۔۔ باریک باریک سا کاجل لگا کر
اس خاک کو سمیٹا۔۔۔۔ جس نے آنکھوں کو حسرتوں کا مزار بنا دیا تھا۔۔۔ اپنے شہاب

محبت و خلوص کا نشہ رنگ دیتا ہے اور یہاں حسرتوں ناکامیوں کی دھول اڑ رہی ہے

کی پسندیدہ خوشبو لگائی۔۔۔۔ آخری بار جب اس نے آئینہ دیکھا۔۔۔ تو بالکل ایک آسمانی حور
نظر آئی۔۔۔۔ معصوم معصوم سا چہرہ۔۔۔۔ تڑپتا ہوا وجود۔۔۔۔ ہونٹوں پر خاموشیوں کی مہر۔۔۔
"شابی دیکھو۔۔۔۔ مسز کامران کو۔۔۔۔ اتنی سادہ۔۔۔۔ اور کتنی بدنصیب ہے۔۔۔۔"! آئینے
میں اپنا وجود دیکھ کر وہ سسک پڑی۔۔۔۔ عین اسی لمحے پھر دروازے کو دستک زور سے
ملی۔۔۔۔ "عاطقہ کواڑ کھولو۔۔۔۔ میں نے کپڑے بدلنے ہیں۔۔" چاند نگر سے ان کی ساس
نے فون کر کے فوری پہنچنے کو کہا تھا۔ وہ موٹے موٹے قدموں سے دروازے تک گئی۔ کنڈی
کھولی۔۔۔۔ کامران ایک نظر دیکھتے ہی سکتے میں رہ گیا۔۔۔ محبت کی بھول اس کی روح کی
گہرائیوں تک اتر چکی تھی۔۔۔۔ اس سفید لباس، سفید زیورات میں بھی اس کا تقدس نمایاں تھا
۔۔۔۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔۔۔۔ پھر بڑے احترام سے اس کا سفید کانپتا
سرد ہاتھ تھاما۔۔۔ اور اپنے بیقرار ہونٹ ان پر رکھ دیئے۔۔۔۔ عاطقہ کی آنکھیں پھر

جھلملانے لگیں.... اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچا.... کامران بھی کپڑے لیے غسلخانے میں چلا گیا.... ملاپ کا دن.... اور کتنی خاموشی کتنا سکوت.... ہر طرف ایک ہولناک سناٹا چھایا ہوا تھا.... عاطقہ سر جھکائے اپنی ساڑھی کے پلو کو انگلی پر لپیٹ رہی تھی۔ دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اُٹھ کر گلوکوز بنایا.... اور دو گھونٹ پیئے.... کامران سلیٹی سوٹ میں خاصا وجیہہ نظر آ رہا تھا....

"کیا بات ہے عاطقہ....؟" اس کے ہاتھ میں کانپتا ہوا گلاس دیکھ کر پوچھا..

"دل کو کچھ ہو رہا ہے....!" عاطقہ نے آہستگی سے کہا....!"

"حوصلہ کرو عطی.... چلو تمہیں امی کے پاس چلیں.... کامران نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:"

"میں وہاں نہیں جاؤں گی....!" عاطقہ کی آواز کانپنے لگی....

"سب جا رہے ہیں.... ابو، انجم، خالہ، تم اور میں....!" کامران نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"سب کیوں جا رہے ہیں....؟" عاطقہ نے درد سے پوچھا....

"یوں ہی.... ایسی تو کوئی بات نہیں....!" کامران نے جان بوجھ کر ٹالتے ہوئے کہا کہ اتنے میں انجم دوڑتی ہوئی آئیں.... اور جلدی سے کہا...

"کامران دیر ہو رہی ہے.... جلدی کرو....! دوسرا فون آیا ہے۔ انہوں نے آہستہ سے کامران کو کہا۔

"امی بس ہم تیار ہیں...."

"عاطقہ کی طبیعت ٹھیک نہیں کیا...؟" زرد ہوتی ہوئی عاطقہ کی طرف دیکھ کر انجم نے پوچھا....

"خوشی میں زرد ہو رہی ہیں....!" کامران نے مذاق کرتے ہوئے کہا....

ٹیکسی کروا کے یہ سب چاند نگر کی طرف روانہ ہو گئے.... اگلی سیٹ پر کامران اور عاطقہ بیٹھے ہوئے تھے۔ پچھلی سیٹ پر رضوان اور انجم.... کامران نے عاطقہ کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا ہوا تھا.... وہ محسوس کر رہا تھا... کہ عاطقہ کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔ وہ بار بار اپنا سر اس کے شانوں پر رکھتی.... ہاتھ اس کے بالکل برف کی طرح یخ ہو رہے تھے.... وہ بار بار اپنا سر بے چینی سے جھکا اُٹھا رہی تھی.... رضوان کسی گہری سوچ میں مستغرق تھے.... حالات نے نے انہیں خاصہ بوڑھا کر دیا تھا۔ پھر بیماری نے تو انہیں کہیں کا نہ رکھا.... انجم دوزدیدہ نگاہوں سے عاطقہ کی طرف دیکھ رہی تھی.... اور اپنے دل میں سوچ رہی تھیں کہ چاند نگر جا کر کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر کو دکھا کر کوئی خوشخبری سُنیں گے.... چاند نگر کا خوبصورت شہر آچکا تھا۔ کامران ڈرائیور کو "آصف وِلا" کا پتہ بتا رہا تھا.... ڈرائیور نہایت چابکدستی سے سڑکوں کا موڑ کاٹ کر آصف وِلا کے سامنے ٹیکسی روک چکا تھا۔ .... سارا آصف وِلا.... لوگوں کے ہجوم سے بھرا ہوا تھا.... کامران کا دل دھڑک رہا تھا.... عاطقہ کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے.... فضلو بابا بھاگ کر ٹیکسی کے قریب آئے.... اور روتے ہوئے بولے....

"بے بی ہم لُٹ گئے.... ہماری چھوٹی سرکار ہم سے روٹھ گئی۔" شہاب

روٹھ گئے .... انہیں روٹھنا بھی چاہیئے تھا .... کون عمر بھر لٹتا ہے .... "!
عاطقہ نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُکھڑے ہوئے لہجے میں کہا....

پچھلی سیٹ سے رضوان .... اور انجم بھاگتے ہوئے ہجوم میں کھو گئے۔ کامران عاطقہ کو سنبھلنے کی التجائیں کر رہا تھا....

"مجھے جلدی اُتاریئے .... وقت تنگ ہے.... صرف ایک نگاہ ....!"
کہہ کر عاطقہ نے آنکھیں درد سے بند کر لیں.... کامران گھبرایا ہوا اس کی حالت کو دیکھ کر دوسرے دروازے سے باہر نکلا .... دو چار کو اپنی مدد کے لئے لایا....

عاطقہ کو ہلاتا رہا.... تسلیاں دیتا رہا.... یہی شور .... کے صدمے سے بے ہوش ہو گئی ہیں.... مسز آصف بیقراری سے عاطقہ کے ماتھے کو چومتی جاتیں.... اور روتی جاتیں.... مگر عاطقہ آنکھیں بند کئے ہر قسم کے شور شرابے سے غافل تھی...

ہجوم میں ایک کہرام مچ گیا.... جلدی سے ڈاکٹر بلوائے گئے... ایک طرف شہاب کی جواں مرگ موت کا صدمہ .... سارا شہر اس کے غم میں ماتم کناں .... اور دوسری طرف سیٹھ آصف کی اکلوتی بچی کے گرد ہجوم ....!!

ڈاکٹروں نے اچھی طرح دیکھا بھالا .... دل کی دھڑکن .... آنکھوں کی پتلیوں کو کھول کھول کر دیکھا.... اور ان کے چہروں پر اُداسی چھا گئی....

مسز آصف اور کامران بیک زبان بولے....

"ڈاکٹر خدا کے لئے کوئی ایسی بات نہ بتلایئے .... کہ مزید صدمہ برداشت نہ کر سکیں...."

"بیگم آصف.... مجھے افسوس ہے.... کہ آپ کی صاحبزادی کا ہارٹ فیل ہو چکا ہے.... !"

"عطی.... عطی.... یہ تم نے کیا کیا.... عطی...." کامران اس سے لپٹ لپٹ کر رونے لگا....

"میری بچی.... میری شہزادی.... ماں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔" مسز آصف نے اس کا ہاتھ اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا....

سارا خاندان شہاب کو چھوڑ کر.... عاطقہ کے گرد اکٹھا ہو گیا.... سفید کپڑوں میں ملبوس ایک پاکیزہ رُوح.... چہرے پر سفیدی کا نُور سجائے.... لمبے لمبے بالوں سے مہکتی خوشبوئیں بسائے.... ابدی پُرسکون.... نیند سو رہی تھی.... دیکھنے والوں کے دل پھٹ گئے.... ایک ہی گھر میں دو جوان لاشوں کا نظارہ.... سنگدل سے سنگدل انسان بھی نہیں کر سکتا۔ کبھی شہاب کی چارپائی کے گرد واویلا.... اور کبھی عاطقہ کی چارپائی کے گرد واویلا....

مسز آصف کئی بار بے ہوش ہو چکی تھیں.... کامران بُت بنا عاطقہ کو دیکھے جا رہا تھا.... رضوان اپنی بربادی پر الگ گریاں کناں.... انجم شہاب کی چارپائی کے پاس بیٹھیں زار و قطار رو رہی تھیں.... ثوبیہ.... بار بار شہاب کے چہرے پر سے کپڑا ہٹا کر دیکھ لیتیں.... اور پھر اشکوں کے دریا بہا دیتیں.... ہر کوئی اس بدنصیب چھوٹے سیٹھ کی جواں مرگی پر اشکبار تھا.... اسعد اس کی بیوی، بچے شہاب کی چارپائی سے لپٹے زار و قطار رو رہے تھے۔ عجیب دردناک منظر تھا.... دنیا والے دیکھ

باتیں بنا رہے تھے کہ دونوں نے اکٹھی خودکشی کی ...

کوئی تصدیق ... اور کوئی تردید کرتا ... کہ میں نے خود زندہ ثریا کی میں بیٹھے دیکھا ... اور کوئی تردید کرتا ... کہ صرف دھوکہ دینے کے لئے یہ باتیں مشہور کی جارہی ہیں ... تاکہ ان کی بدنامی نہ ہو ... وہ محبت جسے چھپانے کے لئے مسز آصف نے دو دلوں کا خون کیا آج مشہور ہو کر ... سبھوں کی زبان پر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔

سب خاندان والے سُن رہے تھے ... مگر ایسے گم سم بیٹھے ہوئے تھے۔ جیسے گونگے بہرے ہو چکے ہوں ...

ثوبیہ کبھی شہاب کے پاس ... اور کبھی عاطفہ کے پاس آتی ... عاطفہ کے کان میں کچھ کہتی ... اور پھر پاگلوں کی طرح شہاب کو آہستہ آہستہ جا کر سناتی ...

شہاب کی خودکشی کا کیس پولیس نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا ... لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے جانے والے تھے ... کہ اچانک ... ایک پہاڑی خاندان ... بپھرے ہوئے طوفان کی طرح ان کی کوٹھی میں داخل ہوا ... اور للکار ... للکار کر کہنے لگا ...

"کہ نکالو ... اس چھوٹے سیٹھ کو ... جو غریبوں کا گھر لوٹ کر خود مزے سے چھپا بیٹھا ہے ... !"

"میں اس خون کا بدلہ لوں گا ... ایسا انتقام ... کہ رہتی دنیا تک یاد رہے

....! سارے ہجوم میں بے چینی پھیل گئی.... ماتم کدہ گھر حیرت میں ڈوب گیا۔ شہاب.... اور عاطقہ کے پاس سے خود بخود ہجوم چھٹ گیا۔

بوڑھے.... اور اس کے گھر کے دیگر افراد کے گرد لوگ اکٹھے ہونے لگے....

کوئی کونسا سوال کرتا.... اور کوئی کونسا....؟

کامران حیرت زدہ.... ایک ایک کا منہ تک رہا تھا.... اس کا ذہن پاگل ہو رہا تھا.... کہ الٰہی یہ کیسا ڈرامہ ہے....؟ یہ کیسی کہانی ہے....؟ یہ کیسا حادثہ ہے....؟ جو اُلجھتا ہی جا رہا ہے....

بوڑھا پہاڑی.... چیخ چیخ کر ایک ہی فریاد کر رہا تھا۔" کہ جب تک میرے سامنے وہ درندہ نہیں آئے گا.... جس نے میری بچی کو موت کے منہ میں پھینکا.. میں کسی کو کچھ نہیں بتلاؤں گا...."

پولیس نے بوڑھے کو حراست میں لے لیا.... مگر ایک ہی ضد، کہ یہ سب واقعات اس سیٹھ کے سامنے تبلائے جائیں گے..؟. اور آخر کار.... بوڑھے اور اس کے خاندان کے لوگوں کو شہاب کی میت کے قریب لایا گیا....

چنگھاڑتا ہوا بوڑھا خاموش ہو گیا....

بپھرا ہوا طوفان یک لخت سو گیا....

خون کا بدلہ چکایا جا چکا تھا....

انتقام کی آگ خود بخود بجھ گئی....

" تُو تو میرا گل ہے.... لوگ پتہ نہیں تیرا.... کیا کیا نام بتلاتے تھے..

عاطقہ

تو اس بدنصیب کا گل تھا . . . . . جو تجھے ایک شاخ سے توڑ کر لایا . . . اپنے باغ میں بھی نہ سجا سکا . . . . اور تجھے ایسے بے رحم مالی کے ہاتھوں دے دیا . . . جو تیری حفاظت نہ کر سکا . . . . !!

" تو تو شیریں کا منگیتر تھا . . . . گل شیریں تو تیرے انتظار میں عمر بھر سُلگتی رہا . . . . اچھا ہوا . . . . کہ وہ تیرا ہی زہر چوس کر اپنی محبت کو سرخرو کر بیٹھی . . . . ورنہ میں تو اس ظالم کو کبھی نہ بخشتا . . . . جو میری عزت کو للکار چکا تھا . . . . غیور پہاڑیوں کی بیٹی . . . . اور غیر مردوں کا خون چوسے . . . . !! گل معاف کر دینا . . . اس بوڑھے بدنصیب باپ کو . . . . جو تجھے باپ بن کر بھی . . . . اپنی مشفقت میں نہ رکھ سکا . . . . مرنے سے پہلے . . . . کاش میں تجھے تیرے عزیزوں کا کچھ پتہ بتلا سکتا . . . . تیرے بے سکون دل کو کچھ تو سکون دے سکتا . . . !"

بوڑھا اشکباری کرتا رہا . . . . پہاڑی عورتیں دردناک طریقے سے شہاب کا بین کرتی رہیں . . . . سارا ہجوم . . . . حیران پریشان کہ یہ کیا معاملہ ہے . . . یہ بوڑھا کون ہے . . . . ؟ اس کی بیٹی کیسے مری . . . . ؟ شہاب کا ان سے کیا تعلق . . . . ؟ عاطقہ کا کیوں ہارٹ فیل ہو گیا . . . . ؟

پولیس جتنا اس کیس کو سہل سمجھ رہی تھی . . . . اتنا ہی معاملہ اُلجھ گیا . . . . اور بوڑھا چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا . . . . " عمر بھر جو انسان اپنے دل پر نشتر کھاتا رہا . . . اب اس دل کو چیر کر کیا لوگے . . . . ؟ ؟ اسے سانپ نے کاٹا ہے۔ اپنی موت مرا ہے . . . . ظلم نہ کرو . . . . !!

بوڑھا حراست میں بیٹھا آنسوؤں سے اپنی داڑھی تر کر رہا تھا اور اپنی داستان سُنا رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔

" کہ میں ایک پہاڑی قلی تھا ۔ ۔ ۔ جو سامان اُٹھانے پر اپنے بیوی اور گھر کے دیگر افراد کا پیٹ پال رہا تھا ۔ ۔ ۔ باعزت نوکری تھی ۔ مزدوری میں کوئی عار نہیں ۔ ۔ ۔ کہ اچانک مجھے یہ کام ایک جرم میں چھوڑنا پڑا ۔ ۔ ۔

میری بیوی رابعہ جان ۔ ۔ ۔ جو مجھے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی ۔ ۔ ۔ شادی کو سات سال گزر گئے اور وہ اولاد کی دولت سے محروم رہی ۔ ۔ ۔ اس کا حسن جو مشعلوں کو مات کرتا تھا ۔ ۔ ۔ اب ماند پڑنے لگا ۔ ۔ ۔ دنیا جہان کے علاج کئے ۔ ۔ ۔ تعویذ دھاگے کئے ۔ ۔ ۔ مگر کسی طرح کا افاقہ نہ ہوا ۔ ۔ ۔

میرا دامنِ مراد پورا نہیں ہوا ۔ ۔ ۔ رابعہ جان جو کوئل کی طرح چہکتی رہتی تھی ۔ ۔ ۔ اب ایک ناشاد پرندے کی طرح سر جھکائے اپنے کاموں میں مصروف رہتی ۔ رابعہ کی اس خاموشی نے مجھے ایک جرم کرنے پر مجبور کر دیا ۔ ۔ ۔ کہ اگر میں کوئی بچہ اس کی گود میں لاکر ڈال دوں ۔ ۔ ۔ تو ہو سکتا ہے کہ میرے اُجڑے دیار میں کچھ بہار آجائے اس سلسلے میں میں نے اپنے کئی رشتہ داروں سے بات چیت کی ۔ مگر کوئی اپنی اولاد دینے پر رضامند نہ ہوا ۔ ۔ ۔ پھر کئی دنوں تک میں شہر کے مختلف ہسپتالوں سے لاوارث بچے مل جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ جو ماں باپ کی محبت سے نا آشنا ہوتے ہیں ۔ ۔ ۔ مگر میری تقدیر وہاں بھی کھوٹی رہی ۔ ۔ ۔ جتنا ناکامی سے میرا دل ٹوٹتا رہا ۔ ۔ ۔ اتنا ہی حسد اور انتقام کا جذبہ پروان چڑھتا رہا ۔ ۔ ۔

جب انسان جائز تمناؤں کا پیچھا کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے .... تو وہ
ناجائز ذرائع سے اپنی تمناؤں میں رنگ بھر خود کو وقتی طور پر پُرسکون ضرور کر لیتا ہے ....
بالکل اسی طرح اب ہسپتالوں کے چکروں سے باز آ کر میرا ذہن کچھ اور منصوبے بنانے لگا۔ اور
ایک دن میں پھر ایک بابو کا سامان اُٹھا کر اس کے پہاڑی بنگلے میں داخل ہوا ....
وہ محکمہ جنگلات کا کوئی آفیسر تھا ...... جونہی میں نے اس کے پہاڑی بنگلے میں قدم
رکھا ... سامنے جھولے میں ایک گول مٹول سا سرخ سفید خوبصورت بچہ لیٹے دیکھا
.... میری دبی ہوئی شوق کی چنگاری بھڑک اُٹھی۔ دل میں ایک شیطانی وسوسہ
جاگا ... کہ اگر یہ بچہ مجھے مل جائے ..... تو کیسا ہو ....؟ ان کے ہاں تو اولاد
ہوتی ہی ہے۔ اگلے برس پھر ہو جائے گی ... میری رابعہ جان .... اس بچے کو
پا کر کتنی خوش ہو گی ..... اس کی سوکھی کھیتی ہری ہو جائے گی ... اس کی خزاں رسیدہ زندگی
میں بہار آ جائے گی ... اور اس طرح اس بچے کو جس دن سے میں نے دیکھا ... میرا دن
رات کا سکون جاتا رہا۔ اور میں اکثر ... اس بنگلے کے ارد گرد ..... بلاوجہ چکر لگاتا رہا
.... اور بہت جلد یہ بات مجھ پر واضح ہو گئی ... کہ بابو اکثر دوروں پر رہتا ہے ...
بچہ صحن میں پچھلی طرف جھولے میں رہتا ہے .... اور ان کی بیگم کمروں اور باغیچے کی طرف
زیادہ وقت گذارتی ہیں ...

بوڑھے نے ایک سرد آہ بھر کر پھر سے داستان کا آغاز کیا اور پھر ایک دن مجھے
موقع مل گیا بچہ اُڑانے کا ..... اس روز بابو دورے پر گیا ہوا تھا ... قریب ہی کوئی
میت ہو گئی تھی ... گھر اکیلا تھا ..... میں پچھلی دیوار سے کود کر اندر آیا ..... بچہ انگوٹھا

چوس رہا تھا... میں نے جھٹ اسے اُٹھایا... وہ ایک بار ہمک کر میری گود میں آیا بچے کی اس حرکت نے میرا دل موہ لیا... اور میں نے اسے جھٹ اپنی چادر میں لپیٹ کر کندھے کے نیچے ڈالا... اور اسی دیوار سے کود کر اپنی رابعہ کے پاس بھاگا... اور اس کی گود میں ایک چاند سا مسکراتا بچہ ڈال کر میں اس کی آنکھوں میں گمشدہ خوشیوں کی تلاش کرنے لگا... میری رابعہ اس اچانک خوشی سے پاگل ہو اٹھی... اور اس نے بچے کو اپنی پوری شدت سے اپنے سینے سے لگا لیا... نئی گود پا کر بچہ رونے چیخنے لگا... جب ذرا یہ جذباتی طوفان تھما... تو میں نے رابعہ کو ساری حقیقت کہہ سنائی... رابعہ نے مجھے بڑی ڈانٹ پھٹکار سنائی... مگر میں کسی بات کو سننے کے لئے تیار نہیں تھا... اسی وقت میں نے اپنا مختصر سا سامان باندھا... اور ہمیشہ کے لئے وہ جگہ چھوڑ دی۔ کبھی ایک جگہ پڑاؤ ڈالتا... اور کبھی دوسری جگہ... بچہ بڑھتا رہا۔ خوش قسمتی سمجھیے کہ اس کے بعد ہمارے اپنے گھر اولاد ہونی شروع ہو گئی... میرے بھائی کی وفات کے بعد اس کی بچی شیریں بھی میرے حوالے کر دی گئی... اور میں نے بچپن سے اس کی منگنی نگل سے کر دی... وقت کا چکر چلتا رہا... خانہ بدوشی کی زندگی میں ہم نے بھیک کو اپنا پیشہ بنا لیا... اور مجھے حیرت ہے... کہ انسان کا خون اگر اصل ہو... تو ہر حال میں اصل رہتا ہے... یہ بچہ ہمیشہ بھیک مانگنے سے کتراتا رہا... اور شام کو جب بھی اپنے خیموں کی طرف لوٹتا... تقریباً خالی ہاتھ... اس پہ مجھے طیش آ جاتا اور کتنی بار اسے خوب پیٹا... اور اس کا سارا جسم نیلوں سے بھر دیتا... مگر میری سختی بھی کسی کام نہ آئی... میرے دل میں اس بچے کی طرف سے نفرت بڑھتی گئی... رابعہ جہاں

اسی طرح اس پر جان دیتی.... مگر میں ایک لمحے کے لئے بھی اس کو دیکھنا گوارہ نہ سمجھتا.... یہاں تک کہ مجھے اطلاع ملی.... کہ گل بھیک مانگنے کی بجائے سارا دن کسی سیٹھ کے بنگلے میں اس کی لڑکی کے ساتھ کھیلتا رہتا ہے.... وہ ایک بار میں نے آکر اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا.... اور ایک بار پھر میرا شیطانی ضمیر جاگا.... اور میں نے گل کی قیمت دس ہزار وصول کر کے اسے اسی سیٹھ کے ہاتھ بیچ دیا.... جس کے گھر میں میرے گل کی لاش پڑی ہے....“ اس پر بوڑھا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا.... سامعین سب اس انوکھی کہانی پر دم بخود.... کچھ دلوں میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی.... مگر ابھی بوڑھے سے کچھ اور سننے کے متمنی تھے....

”پھر بابا....“ کامران نے بے چینی سے پوچھا....

”پھر کیا ہوا.... سیٹھ آصف نے مجھے قرآن کا واسطہ دیا.... کہ اگر بچہ مجھے دیا ہے.... تو اس کے مستقبل کو روشن بنانے کے لئے تمہیں میرے ایک معاہدے پر عمل کرنا ہو گا.... کہ تم ساری زندگی اس بچے سے دور رہو گے.... بچے کی قیمت مجھے مل چکی تھی.... میں نے معاہدے پر عمل کر کے قرآن اٹھا لیا۔ اور اسی رات روتی تڑپتی رابعہ کو لے کر وہاں سے کوچ کر لیا.... اور پھر زندگی کا چکر چلتا رہا.... میری شیریں جوان ہو چکی تھی.... اسے اپنی بچپن کی منگنی کا احساس دلا دیا گیا تھا۔ اور یہ کہہ کر اس کی جوانی کو بہلایا گیا.... کہ وہ فوج میں شامل ہو کر چلا گیا ہے.... کبھی نہ کبھی ضرور آئے گا.... شیریں صبح و شام اس سڑک کے موڑ پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرتی رہتی.... یہ لمحہ میرے لئے بڑا تکلیف دہ تھا.... اس موقع پر میں نے سوچا.... کہ اس معاہدے کی قسم کو ضرور توڑ دوں گا.... اور

سیٹھ سے ایک بار مل کر یہ ضرور کہوں گا۔۔۔۔ کہ بچپن کی یادوں پر پہرے نہیں بٹھائے جا سکتے۔۔۔۔ پٹھان اپنی جان دے سکتے ہیں مگر اپنی مانگ کو نہیں چھوڑتے۔۔۔۔ تم اپنے صاحبزادے کے لئے میری شیریں اپنے گھر لے آؤ۔ پھر میں ہمیشہ کے لئے تم سے جدا ہو جاؤں گا۔۔۔۔ ابھی یہ منصوبہ میرے دل میں تھا۔۔۔۔ کہ ہمارے خیموں سے کچھ فاصلے پر ایک ڈاک بنگلہ بننا شروع ہوا۔۔۔۔ میری شیریں نے میری بہت منت سماجت کی۔ کہ سارا دن بے کار پھرنے سے بہتر ہے کہ کچھ کام کریں۔ وہ اور میرے قبیلے کی دو لڑکیاں اور اس کے ساتھ جا کر ڈاک بنگلے کے مزدوروں کے ساتھ کام کرنے لگیں۔۔۔۔ پھر میں نے محسوس کیا۔۔۔۔ کہ شیریں کچھ بدل رہی ہے۔ وہ ڈاک بنگلے کے مالک خان سے کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہی ہے۔۔۔۔ میں نے ایک دو بار ٹوکا۔۔۔۔ جس پر وہ بپھر گئی۔۔۔۔ اور اس نے مجھے کچھ ایسی صاف اور کھری باتیں سنائیں۔۔۔۔ کہ میں چپ ہو گیا۔ وہ مجھے خان کی غیرت۔۔۔۔ اور شرافت کا یقین دلا چکی تھی۔۔۔۔ میں نے بھی اس پر یہ واضح کر دیا تھا۔۔۔۔ کہ تم کسی کی مانگ ہو۔ اگر جوانی کی کوئی لغزش تم سے سرزد ہو گئی۔۔۔۔ تو میں خان۔۔۔۔ اور اس کے ایک ایک گھر کے فرد کی عزت نیلام کر دوں گا۔۔۔۔ کل رات شیریں کچھ دیر سے آئی۔۔۔۔ پھر اپنے حصے کا کھانا۔۔۔۔ پانی اور بستر لے کر چلی گئی۔۔۔۔ جب میں نے رابعہ سے شیریں کے بارے میں پوچھا۔۔۔۔ تو وہ یہ کہہ کر مجھے مطمئن کر گئی۔۔۔۔ کہ وہ اپنے قبیلے کی لڑکیوں کے پاس گئی ہے۔ مگر رابعہ کی آنکھوں کے جھکنے نے میرے دل میں شک کی آگ بھڑکا دی

.... تقریباً ایک گھنٹے کے بعد میں پھر اُٹھا.... جا کر اس کا بستر دیکھا.... تو وہ تب بھی غائب تھی.... اس پر میری آتش غضب بھڑک اُٹھی.... اور میں نے قسم کھا لی.... کہ اگر آج شیریں مجھے مل گئی.... تو میں اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گا.... میں اپنا تیز چاقو اپنے نیفے میں چھپا کر اس کی تلاش میں نکلا.... پہاڑی سے میں دیوانہ وار دوڑتا ہوا نیچے کی طرف آ رہا تھا.... کہ ایک چیز سے ٹکرا کر گرا.... ہاتھ لگا کر دیکھا.... تو وہ شیریں تھی.... اس کا جسم بالکل سرد ہو چکا تھا.... میں نے اس کے نتھنوں پر ہاتھ رکھ کر سانس کو محسوس کیا.... مگر کیسی سانسیں.... کیسی زندگی....؟؟ میں اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھائے خیمے میں داخل ہوا.... دیئے کی ہلکی ہلکی روشنی میں یہ دیکھ کر مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا کہ شیریں سانپ کے وش کاٹنے سے اپنی زندگی ہار چکی تھی.... مجھ پر غصّے اور جنون کا دورہ سوار ہو گیا.... کہ وہ کون ظالم تھا.... جس نے اپنی زندگی بچانے کی خاطر میری جواں سال بھتیجی کو موت کے منہ میں دھکیل دیا.... شیریں تو مر چکی تھی۔ مگر میں اس ظالم کو کیسے بخشتا.... ساری رات بھٹکتے گزر گئی.... اور صبح مجھے درخت کے نیچے شیریں کی چادر، کھانا، پانی کی بوتل.... اور کسی مرد کا کوٹ مل گیا.... کچھ کاغذات جیب سے نکلے.... پڑھوانے کے بعد معلوم ہوئے کہ وہ سیٹھ شہاب ہیں.... موٹر کے پہیوں کے نشان نے میرے شک کو اور بھڑکا دیا.... اور میں دیوانہ وار روتا چیختا شہر کی طرف بھاگا.... میرے پیچھے میرے قبیلے کے لوگ بھی بھاگے.... میرا ایک ہی جنون تھا کہ اس سیٹھ کے بچے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا.... جب لوگوں سے سیٹھ شہاب

کا پتہ پوچھا۔۔۔ اور جب میں سیٹھ آصف کے بنگلے میں داخل ہوا۔۔۔ تو آج سے بائیس برس پہلے کا واقعہ میری نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔۔۔ کہ کہیں شہاب میرا گل تو نہیں۔۔۔ بنگلے میں لوگوں کا ہجوم دیکھ کر میرا دل بیٹھ سا گیا۔۔۔ اور جب میں نے گل کو دیکھنے کی تمنا ظاہر کی۔۔۔ تو دل سے یہی پکار اُٹھی۔۔۔ کہ خدا کرے شہاب کوئی اور ہو۔۔۔ اور گل کوئی اور۔۔۔!! لیکن جب میں شہاب کے پاس لے جایا گیا۔۔۔ تو لوگو۔۔۔ وہ تو میرا گل تھا۔۔۔ جسے میں خود نہ سنبھال سکا۔۔۔ مجھے یہ حیرت ضرور ہوئی۔۔۔ کہ شیریں نے تو وش کاٹا اپنی جان قربان کر دی۔۔۔ اچھا ہوا اپنے مالک کے پاس چلی گئی۔۔۔ مگر وش کاٹنے کے بعد۔۔۔ گل کیوں مرا۔۔۔؟؟ کیا اچھی طرح وش نہیں کاٹا گیا۔۔۔!! میں اس بچّی کو منع کرتا رہا۔۔۔ کہ یہ موت کا کھیل ہے نہ سیکھے۔ مگر یہ میری بات نہ مانی۔۔۔ اور آج اس طرح میں اپنے اُجڑے گھر میں اپنے دو جوان بچوں کی لاشیں دیکھ رہا ہوں

میں مجرم ہوں۔۔۔ اسی پہاڑی بابو کا۔۔۔ میں مجرم ہوں گل کا۔۔۔ میں مجرم ہوں شیریں کا۔۔۔ مجھے گرفتار کر لو۔۔۔ اور ان کے دفنانے سے قبل مجھے پھانسی پر لٹکا دو۔۔۔ تاکہ میں اس کربناک اذیت سے نجات پا جاؤں۔۔۔ اپنے مرنے سے پہلے ایک التجا۔۔۔ کہ شیریں کو گل کے پہلو میں دفن کرنا۔۔۔ بیچاری ساری زندگی اس کے انتظار میں کاٹتی رہی۔۔۔ اور جب وہ ملا۔۔۔ تو بھی اجنبی بن کر

اتنا کہہ کر بوڑھا تو سر جھکا کر ماضی کی راکھ کو کریدنے لگا۔ سارا ماحول سحر زدہ ہو گیا۔۔۔ بوڑھے سے اس اغوا شدہ بچے کی کچھ نشانیاں بھی مل گئیں۔۔۔ اور انجم نے فوراً

پہچان لیں .... کہ اسی قسم کے کچھ کپڑے اس کے پاس ایک اٹیچی میں محفوظ ہیں .... وہ اٹیچی منگوائی گئی .... مگر ایک گلابی موزہ غائب .... شہاب کے پورے کمرے میں پولیس نے قبضہ کرلیا تھا .... اتفاق سے وہی گلابی موزہ اس کے اٹیچی سے نکل آیا .... سارا راز از خود طشت از بام ہوگیا .....

رضوان سکتے کے عالم میں آگئے .... کامران پھٹی پھٹی نظروں سے باپ کو دیکھنے لگے .... ''ساری زندگی ہمارا خون ہم سے قریب رہا .... اس کا خون ہمیشہ جوش مارتا رہا .. مگر ہم کیوں نہ اپنے خون کو پہچان سکے ....

دونوں باپ بیٹے بھاگتے ہوئے شہاب کی لاش سے لپٹ گئے .... رضوان رو رو کر پکار رہے تھے ....

''میرے لال عمران جاگو تو .... دیکھو تمہارا بد نصیب باپ تمہیں پکار رہا ہے۔ سعدیہ نے ہمیشہ تمہاری طرفداری کی .... تمہیں دیکھ کر وہ تڑپ اُٹھتی۔ مگر میں اُس کی ممتا کو .... یہ کہہ کر پرے ہٹاتا رہا .... کہ ایک بھیک منگا جانے کیوں تمہارے دل کو بھا گیا .... مجھے کیا معلوم کہ اس بھیک منگے میں میرا اپنا خون رواں تھا .... عمران میرے بچے ایک بار آنکھیں کھول کر اپنے گنہ گار باپ کو دیکھ تو لو ....''

کامران .... شہاب کے قدموں کو پکڑ کر زور زور سے جھنجوڑ رہا تھا ....

''بھائی جان صرف ایک بار .... صرف ایک بار کہہ دیجئے .... کہ کامران .... میں نے تمہیں معاف کردیا .... ہائے آپ امی کے پاس ہماری کیا کیا شکایات لے کر جائیں گے .... بھیا جاگ جائیے .... اور اپنی غلطی کو بھی جگا دیجئے .... ہم سے تو غلطی ہی

وفادار نکلی.... جو اپنے خون سے بے وفائی نہ کر سکی۔ بھیا اُٹھیئے.... عطی آپ کی امانت ہے.... آج ڈیڑھ برس میں بھی.... ہم دونوں بہن بھائی کے رشتے کی حیثیت سے رہے.... عطی.... نے تو آپ کو اپنا سب کچھ سمجھ رکھا تھا... بھیا اب تو یہ راز سن کر خوش ہو جائیے.... اور میری روٹھی ہوئی عاطقہ کو منا لیجئے... کہ وہ ہم سے ناراض ہو کر آپ کے گھر نہ جائیں.... !! ہم اسے خوشی سے رخصت کریں گے۔

بھیا.... اپنی عطی کا واسطہ... آنکھیں تو کھولیئے...“ مسز آصف... اس راز کو سُن کر دیواروں سے اپنا سر پٹخ رہی تھیں.... تو یہ روتی آنکھوں میں خوشی کی چمک لئے... عاطقہ کو خوشخبری سُنا رہی تھی....

”عطی... مبارک ہو.... تمہیں تمہارے شابی لینے آئے ہیں.... عُمر بھر کا انتظار ختم ہو گیا....

”اُٹھو نا.... دیکھو.... شابی کتنے سج دھج کر تمہیں اپنے دیس لے جانے کے لئے آئے ہیں.... !!

کہرام کے درمیان.... عاطقہ.... شہاب.... اور شیریں کے جنازے اُٹھے.... عمر بھر دور رہنے والے.... قدرت کے انصاف سے پھر ایک جگہ ہمیشہ کے لئے اکٹھے ہو گئے.... شہاب کے دائیں عاطقہ کو جگہ ملی.... اور بائیں طرف شیریں کو.... !!

تینوں کی قبروں پر اگر بتی لوبان کی خوشبوئیں اُٹھ رہی ہیں.... سفید موتیئے کی کلیوں سے تینوں قبریں ڈھکی ہوئی ہیں.... عمر بھر کی بے چین روحیں... بالکل

صبر وقرار سے سو رہی ہیں....

کامران.... اور ثوبیہ.... اپنی محبّت اور خلوص کا نذرانہ آنسوؤں سے پیش کر رہے ہیں....

اور فرحت.... اپنی بیٹی کی قبر پر پھولوں کو سجا رہی ہیں.... رضوان اور انجم سعدیہ کی قبر پر بیٹھے قرآن پاک کی تلاوت کر رہے ہیں. زندگی میں دُور دُور رہنے والے.... کتنے قریب آ گئے.... دیئے کی ٹمٹماتی لو میں عاطقہ کی قبر کا کتبہ چمک رہا تھا۔

سچ کہہ رہی ہے شمع کہ میرا قصور کیا؟
پروانے کے نصیب میں جلنا تھا جل گیا!

ختم شُد

چوہان اکیڈمی لائل پور کی مطبوعات

۱	دھوپ چھاؤں	عارف مارہروی	۴/۰۰	۱۴	دشمن	اکرام الدین	۳/۰۰
۲	جج	ڈاکٹر سلیم دُرانی	۶/۵۰	۱۵	کبھی یوں بھی ہوتا ہے	″	۱/۰۰
۳	ہم بھی انسان ہیں	″	۶/۵۰	۱۶	ثمرہ گناہ	″	۴/۰۰
۴	فریدہ	″	۵/۰۰	۱۷	انتزار کی تباہی	″	۱/۵۰
۵	شہیلا	″	۷/۰۰	۱۸	سرخ جھیل مہاتی ناول	″	۶/۵۰
۶	زوال قرص	″	۱۰/۰۰	۱۹	صحرائی لٹیرا	اسلم راہی	۱۰/۰۰
۷	سیمی	راحیلہ ناز	۵/۰۰	۲۰	مینرہ	″	۴/۵۰
۸	انیتا	راحیلہ خان	۶/۷۵	۲۱	سمیرا	″	۸/۰۰
۹	نگو	منیرہ چوہدری	۷/۵۰	۲۲	عقاب	″	۷/۰۰
۱۰	شمع آزادی	اکرام الدین	۴/۰۰	۲۳	سمیرا	آر۔ اے اختر	۲/۵۰
۱۱	یاسمین	″	۴/۰۰	۲۴	موت کی چھلانگ	عمران سیریز	۳/۰۰
۱۲	لائٹ ہاؤس	″	۴/۵۰	۲۵	گلابی موت	اظہار اثر	۲/۰۰
۱۳	زہرہ	″	۴/۵۰	۲۶	دستِ دیدہ دل	اسلم جیلانی	۴/۰۰

شہاب گل دُرانی

دُور اِک تارا

قیمت: دس روپے

★ "دور اک تارا" چمکا جس نے تاریک دِلوں کو منّور کر دیا
انوکھی کہانی ـــــ دلکش مکالمے

خیام پبلشرز پرانی انارکلی لاہور